WHAT I OWE TO CHRIST

C. F. ANDREWS

مَیں نے خُداوند مسیحؑ سے کیا پایا

سی۔ ایف۔ اینڈریُوز

مترجمّ

اے۔ ڈی۔ خلیلؔ

بار اول ۱۹۶۷ء تعداد ۱۰۰۰

پنجاب ریلجس بک سوسائٹی
انارکلی — لاہور
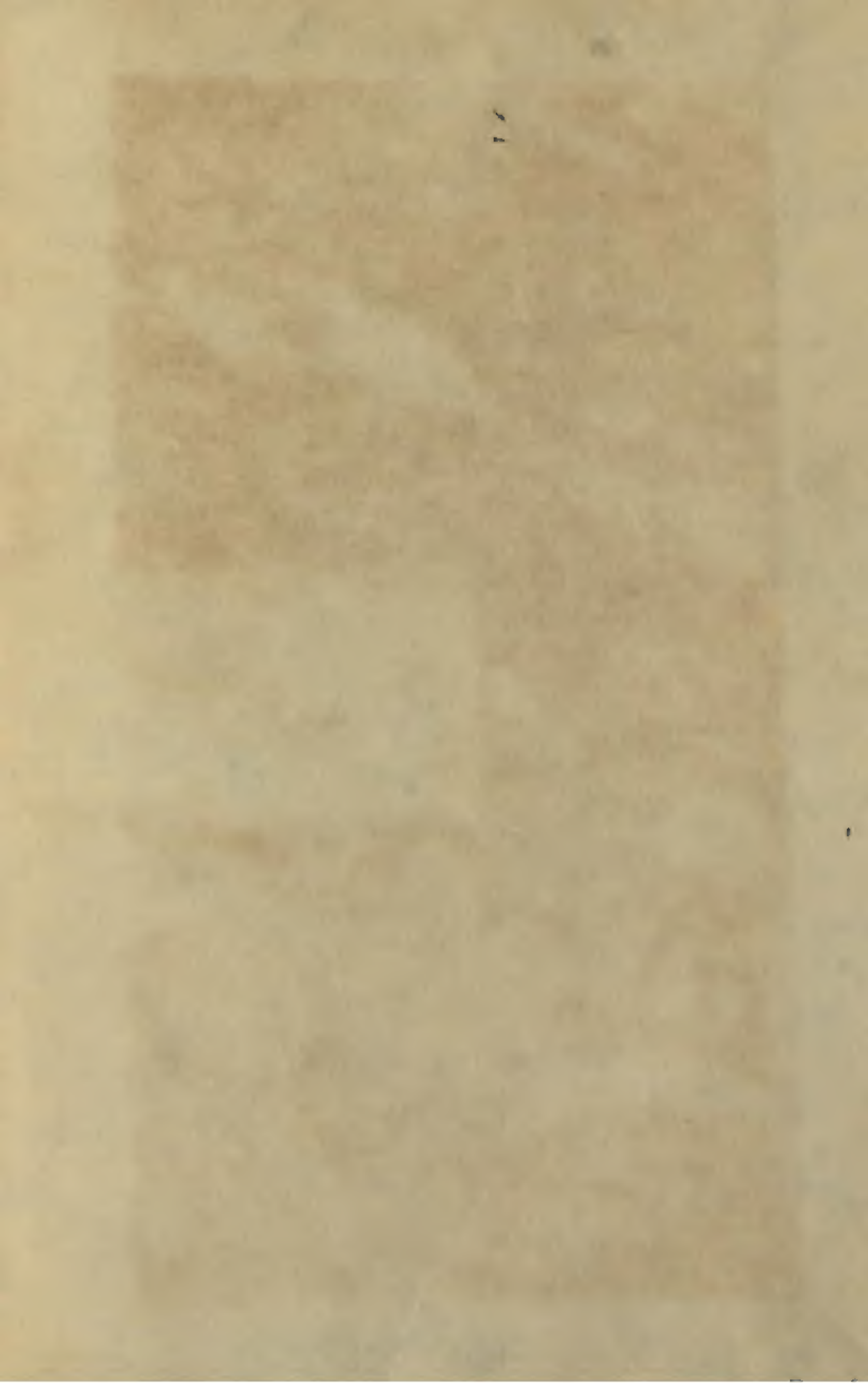
میں نے خداوند مسیح سے کیا پایا

سی۔ ایف اینڈریوز

مترجم

اے۔ ڈی خلیل بی۔ اے، بی۔ ٹی

پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی

انارکلی۔ لاہور

بار اوّل　　　　سنہ ۱۹۶۷ء　　　　تعداد ۱۰۰۰
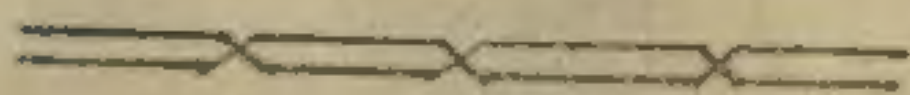
۷۰/۰۰ روپے
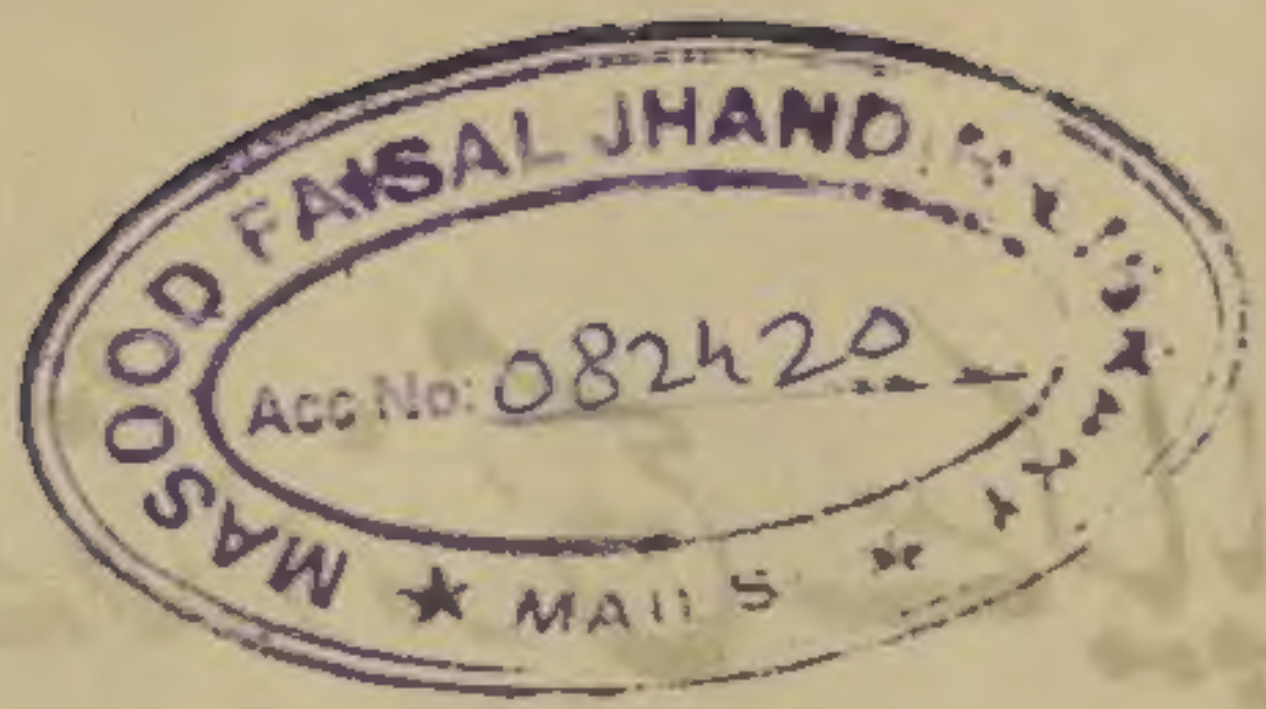
اِنتساب

میرے پیارے ماں باپ کی یادگاری میں

مُصنّف

پہلا باب

میرے والد محترم

میرے والد محترم انگلستان کے مشرقی حصّہ کے رہنے والے تھے۔ وُہ ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی سے پہلے پیدا ہوئے۔ اُن کے آبا واجداد سفوک اور ایسکس[1] کی سرحد پر سکونت پذیر تھے۔ وُہ پکّے پیورٹن اور مذہبی راہنما تھے اور اپنے پیورٹن عقیدے میں بڑے ہی راسخ تھے۔ اُنہوں نے خلوصِ دل سے اسی عقیدے کی تبلیغ کی۔ اُنہوں نے ملٹن، کرامویل اور جان بنین کی روایات کی پیروی کی اور اس میں سرِ مُو فرق نہ آنے دیا۔ ملٹن، کرامویل اور جان بنین بھی ملک کے اسی حصّے میں پیدا ہوئے تھے۔ اُنہوں نے خُدا کی تلاش کو اپنی زندگی کا مقصدِ عظیم سمجھا اور وُہ تادمِ زیست اسی مقصد کو حاصل کرنے میں لگے رہے۔ یہ لوگ متین، سنجیدہ اور خدا سے ڈرنے والے تھے۔ وُہ تادمِ حیات نیکی اور پاکیزگی سے اپنی زندگی کے دن گذارتے رہے۔ وُہ بڑے عالی شان گرجوں میں عبادت نہیں کیا کرتے تھے۔ وُہ سبت کا دن پاک رکھنا یاد رکھتے تھے۔ وُہ بائبل مقدس کو بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وُہ کتاب مقدس کے ہر ایک لفظ کو خُدا کا کلام مانتے تھے۔ وُہ خُدا کو اپنا بادشاہ سمجھتے اور ہر وقت اُس کا خوف

[1] SUFFOLK AND ESSEX.

اُن کے دِلوں میں رہتا تھا۔ وُہ جانتے تھے کہ انسان حقیر اَور بڑا ہی گنہگار ہے۔

لیکن اِن سب باتوں کے باوجُود تمام دُنیا کے لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ اُن کے دِل کی گہرائیوں میں ایک نازک، صُوفیانہ اَور سوچ بچار کرنے والا تخیّل تھا، اَور اِس تخیّل کا مرکز خُداوند یسُوع مسیح کی زندگی اَور صلیب پر اُس کی موت تھی۔ اُن کے طریقہ عبادت میں ظاہری شان و شوکت موجُود نہ تھی، لیکن اِس کے اثرات بڑے ہی گہرے اور دُور رس ہُوا کرتے تھے۔ وُہ خیالات جو اِس طرح سے پیدا ہوتے ہیں کبھی فنا نہیں ہوتے۔ انگریزی علم و ادب میں لائی سی ڈس ٹ اَور مسیحی مسافر کا سفر بڑے اُونچے درجے کی کتابیں ہیں۔ اِن کتابوں کے مطالعہ سے عیاں ہے کہ ان کے سخت اَور تنگ عقیدے میں بلند رُوحانی تاثرات موجُود تھے۔ جارج فاکس ٹ اَور اُس کی سوسائٹی آف فرینڈز نے اِس پیورٹن تحریک کو مافوق الفطرت جلا بخشی۔ اِس نے تمام حدُود کو محدُود کر دیا اَور محبّت کے ایک دلنواز اَور فتحمند گیت کی صُورت میں جھُوٹ، بُرائی اَور گناہ اَور موت کی تلخی پر فتح حاصل کر لی۔

میرے والد محترم سے زیادہ کوئی شخص شعر و شاعری کا اتنا والہ و شیدا نہ تھا۔ خُدا نے اُنہیں ایک شاعرانہ دِل عطا فرمایا تھا جس میں تخیّل کا بحرِ بیکراں موجزن تھا۔ اُن کا یہ تخیّل نواز دِل اپنی سادگی، استعجاب اَور خوف کی وجہ سے ایک بھولے بھالے بچّے سے ملتا جُلتا تھا لیکن وُہ حد سے زیادہ فرض شناس تھے۔ وُہ اپنی ضمیر کی آواز کو سُنا کرتے۔ وُہ خادم الدّین تھے۔ وُہ رات دِن کلیسیا کی خدمت میں منہمک رہا کرتے تھے۔ وُہ شہر میں رہا کرتے تھے۔ جہاں آبادی بڑی گھنی تھی۔ شہر کے شور و شغب میں زندگی کو سکُون میسّر نہیں تھا۔ اِس جگہ

ٹ LYCIDUS.

قدرت کی مسحور کُن رنگینیاں اَور رعنائیاں نہ تھیں ۔ مضافات میں حسین اَور رُوح پرور
نظارے موجُود نہ تھے اَور نہ ہی گیان دھیان کے لئے فرصت کے لمحے مل سکتے تھے ۔
وُہ جو کُچھ تھے اپنی ہی محنت سے بنے تھے ۔ اُنہیں مُستقبل میں رُوحانی مُشکلات سے
دوچار ہونا پڑا ۔ وُہ گنہ گار انسانوں کے سامنے خُداوند مسیح کی محبّت کی بشارت دیا کرتے
تھے ۔ یہ بشارت اُن کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا اَور خُوشی کا باعث تھی اَور اُن
کے چہرے سے بھی یہ خُوشی صاف عیاں تھی بسنہ ۱۹۱۴ء میں میری والدہ محترمہ اللہ
کو پیاری ہوئیں ۔ اُس وقت والدِ محترم بڑے عُمر رسیدہ تھے ۔ ہم بچّوں کے لئے
اُن کو اس حال میں دیکھنا بڑے ہی دُکھ کی بات تھی ۔ اب اُن کی زندگی کے وُہ
پُرسکُون لمحات ختم ہو گئے ۔ ایامِ پیری میں کئی روگ انسان کی جان کے لاگو ہو
جاتے ہیں ۔ والد صاحب قدرے اُونچا سُننے لگے تھے ۔ اب وُہ بہروں گوشۂ
تنہائی میں بیٹھے شعر و شاعری کا شُغل فرمایا کرتے تھے ۔ وُہ گیت اَور نظمیں
لکھا کرتے ۔ یہ گیت زیادہ تر مکاشفہ کی کتاب سے ماخُوذ ہُوا کرتے تھے ۔ ان
گیتوں میں اُن کی خوابوں کی اُس حسین بادشاہت کا ذِکر ہُوا کرتا تھا جس کی
"چمک نہایت قیمتی پتھر یعنی اُس یشب کی سی تھی جو بلّور کی طرح شفاف ہو" ۔
ممکن ہے کہ اُن کی یہ نظمیں ادبی لحاظ سے بلند پایہ کی نہ ہوں لیکن اُن
میں اُن کی رُوح کی اُن تمام آرزوؤں کی عکاسی ہے جو برسوں سے دبی ہُوئی
تھیں ۔ واقعی یہ نظمیں اُن کی رُوح کی گہرائیوں سے نکلی تھیں ۔ اپنی وفات
سے پیشتر بھی وُہ کوئی گیت ہی لکھ رہے تھے کہ تخیّل کا یہ حسین سلسلہ
ہمیشہ کے لئے ٹُوٹ گیا ۔

انگلستان کے مشرقی حصّہ کے رہنے والے لوگوں کے خمیر میں یہ چیز موجود تھی کہ وہ مذہبی آزادی کے علمبردار تھے اور یہ صحیح ہے کہ جب وہ برسرِ اقتدار آئے تو اُنہوں نے ظلم و ستم اور ایذا رسانی کا بازار گرم کیا لیکن یہ چیز ہنگامی تھی کیونکہ اُس زمانہ میں یہ چیز عام تھی۔ اُن کو ایک لگن اور دُھن تھی اور وہ آدمیوں کے حکم کی نسبت خدا کا حکم ماننا زیادہ پسند کیا کرتے تھے۔ اِن میں سے بہت سے لوگوں نے اپنے خویش و اقارب اور عزیز دوستوں کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہا۔ وہ ایسیکس اور ہنٹنگڈن سے روانہ ہوئے۔ اُنہوں نے اپنے عزیز وطن کو خیرباد کہا اور بحر اوقیانوس کے خطرناک بحری سفر کو اختیار کیا اور نیو انگلینڈ میں جا آباد ہوئے۔ اُنہوں نے اپنے مذہب کی رُوحانی اقدار کو زندہ اور محفوظ رکھنے کے لئے اپنی جان جوکھوں میں ڈالی۔ اُنہوں نے نئی دُنیا (امریکہ) میں سچی آزادی کی بُنیاد رکھی۔

اُن کے خطرناک بحری سفر کی کہانی اکثر اوقات سنائی جاتی ہے۔ بنی نوعِ انسان کی سرفرازی اور ترقی کی تاریخ کا یہ ایسا باب ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انگلستان کے مشرقی حِصّہ کے لوگ ابھی تک اس واقعہ کو یاد کرتے ہیں۔ وہ لوگ اپنی دُھن کے پُورے تھے۔ اپنے ذاتی مذہب میں وہ بڑے پکّے تھے۔ جس بات پر وہ ڈٹ جاتے اُس پر وہ ڈٹے رہتے تھے۔ وہ پیوریٹن تھے اور اُنہوں نے دُوسروں پر سختیاں روا رکھیں لیکن اس کے باوجود جب ہم اُس زمانہ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں اُن میں عظمت اور بلندی معلوم ہوتی ہے۔ اُن کی زندگی کی اندرونی رَو بڑی ہی گہری

تھی اور اُن میں سے ہر ایک کو فرداً فرداً اپنی مذہبی زندگی کی تبدیلی کا تجربہ تھا۔ اُن کا اخلاق بڑا بلند تھا۔ اُن کے دِلوں میں خُدا کا وُہ خوف تھا جو دانائی کا شروع ہے۔ اُن کی خاندانی زندگی بے حد پاکیزہ اور نیک تھی۔ اُن کے ایمان کی بُنیاد ایسی چٹان پر تھی جس کے وُہ دِل سے گرویدہ تھے۔ وُہ خُداوند مسیح کو اپنا مالک سمجھتے اور اُس کی پرستش کرتے تھے۔ اُن کے نزدیک خُدا کی باتیں بڑی ہی مقدّس تھیں، اُن سے ہمیں بُہت کچھ ورثہ میں مِلا ہے۔ اُن کی یہی باتیں ہمارے ایمان کی بُنیاد اور متاعِ عزیز ہیں۔

میرے داداجان ان ہی سادہ اور آزاد بزرگوں کی اولاد تھے۔ اپنی روزمرّہ کی زندگی میں وُہ ان ہی بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلتے رہے۔ اُن بزرگوں کی تمام اچھی خُوبیاں اُن میں موجُود تھیں۔ اپنے والد بزرگ کی طرح اُن کے دِل میں بھی ایمان تھا جو "اُمید کی ہُوئی چیزوں کا اعتماد اور اَن دیکھی چیزوں کا ثبوت ہے"۔ عبرانیوں کے نام خط کا اقتباس یُوں ہے "یہ سب ایمان کی حالت میں مرے اور وعدہ کی ہُوئی چیزیں نہ پائیں مگر وُہ دُور ہی سے اُنہیں دیکھ کر خُوش ہُوئے اور اقرار کیا کہ ہم زمین پر پردیسی اور مسافر ہیں جو ایسی باتیں کہتے ہیں وُہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم اپنے وطن کی تلاش میں ہیں اور جس مُلک سے وُہ نکل آئے تھے اگر اُس کا خیال کرتے تو اُنہیں واپس جانے کا موقع تھا۔ مگر حقیقت میں وُہ ایک بہتر یعنی آسمانی مُلک کے مُشتاق تھے، اسی لئے خُدا اُن سے یعنی اُن کا خُدا کہلانے سے

شہر بایا نہیں چنانچہ اُس نے اُن کے لئے ایک شہر تیار کیا"۔

میرے دادا جان نے خاندانی روایات کو ملحوظ خاطر رکھا اور خادم الدین بن کر خُدا کی کلیسیا کی خدمت کا بیڑا اُٹھایا۔ ابھی وُہ نوجوان ہی تھے کہ اُنہیں انگلستان کے مشرق میں ایک بپٹسٹ جماعت کا مُبشّر مقرر کر دیا گیا۔ وُہ اس کام میں بڑے مشغول رہتے تھے۔ وُہ ہر وقت مسیح کی خدمت میں مصرُوف رہنا چاہتے تھے۔ اُن کی شادی خانہ آبادی ہُوئی۔ وُہ بڑے خُوش و خرّم تھے۔ وُہ اپنی جنم بھُومی کے قریب اپنے ہی لوگوں کے درمیان رہنے سہنے لگے لیکن کُچھ عرصہ کے بعد ایڈ ورڈ ارونگ کی تعلیم کا اُن پر بہت اثر ہُوا، اور اُن کی زندگی میں رُوحانی انقلاب آگیا جب وُہ ایڈورڈ کی تعلیم سے قائل ہُوئے تو ہر قسم کے حالات کے مقابلہ کے لئے تیار اور اس نئے مذہب کی تبلیغ کے لئے کمر بستہ ہو گئے۔

کارلائل نے ایڈورڈ ارونگ کی زندگی کی عظیم الشان کہانی لکھی ہے۔ انگلستان کے شمالی علاقہ کے رہنے والے اس دراز قامت پیامبر نے اُنیسویں صدی کے اوائل میں لنڈن کے بڑے بڑے مضبوط دِل لوگوں کو ہلا دیا تھا کہ اگر وُہ اپنے گناہوں سے دِل سے توبہ نہیں کریں گے اور ٹاٹ اوڑھ کر خاک پر نہیں بیٹھیں گے تو اُن کا بھی وُہی حشر ہو گا جو بابل کا ہُوا تھا۔ وُہ عام طور پر پُرانے عہد نامہ کی کوئی آیت لے کر اُس کی وضاحت کیا کرتے تھے۔ سامعین میں اُس زمانے کے مقتدر سیاست دان شامل ہُوا کرتے تھے۔ ارونگ علانیہ کہا کرتے تھے کہ خُدا کی عدالت کا دن قریب ہے اور

ے EDWARD IRVING.

عادل منصف دروازے پر ہے۔

نپولین کے زوال کے بعد یورپ میں تاریک دَور شروع ہوا۔ یہ زمانہ بڑا پُرآشوب تھا۔ بہت سی سلطنتیں ملیا میٹ ہو گئیں۔ اس سے بہت سے رُوحانی لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ کتاب مقدس کی بہت سی پیشین گوئیاں لفظی طور پر پُوری ہونے کو ہیں۔ وُہ لوگ بائبل مقدس میں ایسی پیشین گوئیاں تلاش کرتے رہتے تھے جن سے معلُوم ہو سکے کہ کیا کُچھ ظہور میں آنے والا ہے۔ دانی ایل کی کتاب اَور مکاشفہ کے مطالعہ سے "آخری زمانہ" کی گتھی کو سُلجھایا جا سکتا تھا۔

مخلص ایمانداروں کی ایک جماعت اِن الہامی کتابوں کی لفظی تفسیر کی معتقد تھی۔ یہ لوگ لنڈن سے چند میل کے فاصلہ پر البری[1] کے قریب سرے[2] کے علاقہ میں ہے، اپنی مجالس کا اہتمام کیا کرتے تھے وُہ لگاتار دُعا میں لگے رہتے تھے۔ وُہ روزے رکھتے اَور خُدا کے نشانوں کے مُنتظر تھے۔ اُن کی مجلس میں عجیب و غریب قسم کی آوازیں آیا کرتی تھیں۔ اَور ایسا معلُوم ہوتا تھا کہ پنتکُوست آ گیا ہے۔ الہامی باتیں کی جاتی تھیں اَور بعض اوقات مرد اَور عورتیں غیر زبانیں بھی بولتے تھے۔ اب وقت رُوحانی اضطراب کا وقت ہُوا کرتا تھا۔ ایمانداروں کی ایک جماعت فی الفور جمع ہُوئی اَور اُنہوں نے اِن رُوحانی نعمتوں کی توضیح کا مصمم ارادہ کیا۔ اِن رُوحانی نعمتوں سے وُہ یہ سمجھنے لگے کہ یہ آخری زمانہ کی نشانیاں ہیں۔ وُہ یہ اُمید کرنے لگے کہ خُداوند مسیح اپنے جلال میں آنے

---

[1] ALBURY [2] SURREY

والا ہے اور وہ زندوں اور مُردوں کی عدالت کرے گا۔ وہ ہر لحظہ خداوند مسیح
کی آمد کے منتظر رہتے تھے۔

میرے دادا جان کا خداوند مسیح پر پورا ایمان تھا۔ وہ زندہ خدا کی جستجو
میں لگے رہتے تھے۔ وہ ان مذہبی مجالس میں ایسے کھنچے چلے جاتے تھے
جیسے مقناطیس کسی چیز کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ ابتدا میں اُنہوں نے یہ
خیال نہ کیا کہ اُنہیں اس کام میں اپنے گھر بار کو بھی چھوڑنا پڑے گا لیکن اُن
کے ضمیر نے اُنہیں صحیح صحیح بتا دیا کہ اگر اُنہیں خداوند مسیح کی پیروی کرنا ہے تو
اُنہیں دُنیا کی تمام اشیا کو کوڑا کرکٹ سمجھنا چاہیئے تاکہ وہ اپنی بلاہٹ میں
سچے ثابت ہوں۔ اس لئے آخرکار اپنی رفیقۂ حیات کی رضامندی سے
اُنہوں نے اپنے جانشین کو خادم الدین کا یہ عہدہ سپرد کیا اور خود ایک روحانی
مہم پر روانہ ہوئے۔ وہ اِرونگ کی تعلیم پر عمل کرنے والوں میں شامل ہو گئے
لیکن اس زمانہ میں اس قسم کا قدم اُٹھانا دُکھ اور تکلیف کو دعوت دینا تھا
لیکن اُنہوں نے حرارت کا اچھی طرح سے مزہ لے لیا تھا اور وہ
مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کے لئے ہر وقت تیار
تھے اور جو قدم آگے اُٹھ چکا تھا وہ کبھی پیچھے نہیں ہٹا۔

ان ہی دل دوز حالات میں میرے والد محترم پیدا ہوئے۔ مجھے ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کا وہ جذبہ جو میرے دادا جان میں موجود تھا وہ
والد محترم کو بھی ودیعت ہوا تھا کیونکہ میرے والد محترم درویش صفت
انسان تھے۔ دُنیا کی کسی چیز سے اُنہیں محبت نہ تھی۔ ان جیسے

شخص شاذ و نادر ہی مل سکتا ہے۔ دُنیا کی تمام چیزیں اُن کی نگاہوں میں حقیر تھیں۔ اُنہیں کھانے پینے اور پہننے کی فکر نہ تھی اور میری والدہ محترمہ کو گھر کا کام چلانے اور ضروریاتِ زندگی کو پُورا کرنے کے لئے بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ہمارا گزارہ بڑی مُشکل سے ہُوا کرتا تھا۔ میں یہ بات پھر کبھی بیان کروں گا لیکن اگر رُوحانی دُنیا میں پیدائش کے وقت کوئی چیز ورثہ میں مل سکتی ہے تو میرے والد صاحب میں اس کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں وُہ مذہب پر ہمیں کوئی سادہ سا عملی سبق دیا کرتے تھے جو اُن کے نزدیک دُنیا کی تمام اشیا سے زیادہ قیمتی ہوتا تھا۔ اور وُہ سبق یہ تھا کہ اگر ہمارا ضمیر صاف صاف طور پر ہمیں یہ بتا دے کہ کوئی راستہ درست اور صحیح ہے تو خواہ کچھ ہی ہو ہمیں اس راستے پر گامزن ہونا چاہیئے کیونکہ ضمیر خُدا کی پوشیدہ آواز ہے جو رُوح سے ہمکلام ہوتی ہے۔ اُنہوں نے اس باطنی نُور پر بڑا ہی زور دیا۔ وُہ ضمیر کی آواز سُن کر اُس کی پیروی کیا کرتے تھے۔ وُہ ہمیں یہ بات صاف طور پر بتایا کرتے تھے کہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس نُور کو دل کی پاکیزگی سے ہمیشہ پاک و صاف رکھیں اور مسیح کے تابع فرمان رہیں۔ اُن کے نزدیک مسیحی زندگی کا یہی سادہ عملی امتحان تھا۔ وُہ ایک بچے کی سی سادگی کے ساتھ اس راہ پر گامزن رہے۔ وُہ اس راہ سے ذرا بھی باہر نہیں مُڑے۔

اپنی زندگی کے آخری ایام میں میرے دادا جان نے اپنے کھوئے ہُوئے وقار دوبارہ سر نو حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ابتدائی ایام میں اپنے

ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہُوئے اُنھوں نے سب کچھ چھوڑ دیا۔ انگلستان کے جنوب میں وُہ ایک اسکوُل کے ہیڈ ماسٹر تعیّنات ہُوئے۔ اُنہیں یہ عہدہ اس لئے تفویض کیا گیا کیونکہ اُن کا مذہبی اخلاق بڑا بلند تھا اور طلبا کے والدین اُن پر اس لئے اعتماد کرتے تھے کیونکہ وُہ خُداوند مسیح کے مخلص شاگرد تھے۔ سکوُل کو چلانے کا کام بڑا ہی صبر آزما اور محنت طلب تھا۔ اس میں بڑے دِل گُردے کی ضرُورت تھی۔ لہٰذا اس بھاری ذمّہ داری کے کام نے اُن کی صحت پر بُرا اثر ڈالا۔ اُن کا اپنا کیریکٹر نامساعد حالات اور تنگدستی کے سانچے میں ڈھلا ہُوا تھا اور اس کا ردِّ عمل اسکوُل کے طلبا پر بھی ہُوا۔ ایک مسیحی اُستاد کی حیثیّت سے اُنھوں نے شہرتِ دوام حاصل کی اور اپنے اس پیشہ میں اُنھوں نے بڑا نام پیدا کیا۔

ہمارے کھانے کے کمرے میں اُن کی ایک تصویر آویزاں تھی۔ اس تصویر کو بڑے تایا جان نے بنایا تھا۔ یہ تصویر اکثر ایک اکادمی کا موضوعِ سخن بنی رہی۔ اس وقت میں محض ایک لڑکا تھا۔ اسی تصویر کے سایہ تلے میں پروان چڑھنے لگا۔ یہ تصویر قدِ آدم تھی اور اس کے تمام خدوخال نہایت ہی مُتناسب اور تاثر پیدا کرنے والے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وُہ تصویر ہمیں دیوار سے دیکھ رہی ہے۔ تصویر کا چہرہ زرد تھا، اس کی آنکھوں سے محبّت اور پیار کے سوتے پھُوٹتے تھے۔ میرے دادا جان میری پیدائش کے تھوڑی دیر بعد خُداوند میں سو گئے۔ مَیں نے اُنہیں نہیں دیکھا تھا لیکن اس تصویر کو دیکھ کر مَیں اُن

کے متعلق سب کچھ جاننے لگا۔ بچوں کی ایک خاص عادت ہے کہ وہ اپنے تخیل سے بہت کام لیتے ہیں۔ اپنی صغر سنی کے زمانہ میں میں بھی خیالی طور پر اُن کی تصویر سے گفتگو کیا کرتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ میری تمام باتوں کو سن کر سمجھ رہے ہیں اور اسی لئے وہ بڑی پیار بھری مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا کرتے تھے۔

اُن کی وفات سے تھوڑا عرصہ پہلے اُن کے اسکول میں ایک واقعہ رُونما ہُوا۔ اُس کی کہانی مجھے بھی سُنائی گئی ہے۔ وہ کہانی ایسی پُرتاثیر ہے کہ بیان کرنے کے قابل ہے۔ وہ ایک جماعت کو یونانی پڑھایا کرتے تھے۔ اُن کی جماعت کے سینئر طلبا کو اُن کی فطرت کی بلندی اور کردار کی خوبی پر پُورا پُورا اعتماد تھا اس لئے ایک مرتبہ ان طلبا نے ایک بید خریدا اور اُن کی خدمت میں یہ کہہ کر پیش کیا کہ اگر وہ اپنے کام میں کوتاہی کریں یا اُن کا کام اُن کی توقع کے مطابق نہ ہو تو اس بید سے اُنہیں سزا دی جایا کرے۔

وہ ایام دراصل طلبا اور ہیڈ ماسٹر صاحب دونوں کیلئے بڑی جانفشانی کے تھے۔ طلبا کو اس امر کا احساس تھا کہ وہ بڑے ہی نرم دل اور شریف النفس ہیں لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ ڈسپلن[1] اور نظم وضبط کے معاملہ میں بڑے ہی سخت ہیں کیونکہ ہر روز وہ خدا کی حضوری میں رہتے تھے اور اُنہیں اس امر کا شعور تھا۔ انگریزی زبان کے شاعر ملٹن کے مصرعہ کا اُن پر اطلاق ہوتا تھا کہ :۔

"میرے تمام کاموں پر میرے مالک خدا کی نگاہ ہے۔"

---

[1] DISCIPLINE

اور یہ مصرعہ اُن کی سکول کی زندگی کے آخری ایام کی مفصل تشریح ہے۔ میرے والدِ محترم میرے دادا جان کا نام بڑے پیار سے لیا کرتے تھے، لیکن اُن کی آواز میں ایک خاص قسم کی ہیبت تھی جو اُن کی ہشاش بشاش طبیعت کے بالکل متضاد تھی۔

میرے دادا جان کو ایک دردناک حادثہ پیش آیا اور وہ جان بحق تسلیم ہوئے لیکن یہ حادثہ روکا جا سکتا تھا۔ وہ ایک سنگترے کے چھلکے پر سے پھسل پڑے کسی شخص نے یہ چھلکا بے احتیاطی سے فرش پر پھینک دیا تھا۔ اُس زمانہ میں اُن کی صحت بھی جواب دے چکی تھی اس لئے اُن کی حالت خطرناک ہو گئی اور وہ جانبر نہ ہو سکے۔ اُن کی وفات اُس وقت ہوئی جب اُستاد کی حیثیت سے وہ بڑا بلند مقام حاصل کر چکے تھے۔ مجھے اب بھی وہ دن یاد ہیں جب میں اپنے والدِ محترم کے ساتھ اپنی جوانی کے ایام میں اِدھر اُدھر جایا کرتا تھا تو وہ بازار میں چلتے چلتے یک لخت ٹھہر جاتے تا کہ کسی سنگترے کے چھلکے کو فرش پر سے اُٹھا لیں۔ اُنہیں اُس وقت وہ مہلک حادثہ یاد آتا تھا جس نے اُنہیں اپنے مشفق باپ سے محروم کر دیا تھا۔ میری فطرت میں یہ چیز رچ بس گئی ہے اور میں بھی اُس واقعہ کی یاد میں ایسا ہی کیا کرتا ہوں۔

ہمارے گھر میں والدِ محترم ہی سب کچھ تھے۔ وہ ہمارے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ اپنے فرصت کے اوقات میں وہ ہمیں بے شمار کہانیاں سُنایا کرتے اور ہمارے ساتھ سیر کا لطف بھی اُٹھایا کرتے تھے اگرچہ

مَیں نے اِس باب میں اپنے والد بزرگوار کا ذکر کیا ہے لیکن میری والدہ محترمہ نے میری زندگی کی گہرائیوں میں لافانی نقوش چھوڑے ہیں ۔ جو کُچھ مَیں ہُوں اُن کے طفیل سے ہُوں ، اور مَیں اُن کا ممنُونِ احسان ہُوں ۔ مَیں اپنے بچپن کے زمانہ کے حالات میں اپنی والدہ محترمہ کا ذِکر کرُونگا ۔

دُوسرا باب

میری والدہ محترمہ

میری والدہ محترمہ انگلستان کے جنوب مغرب کے ایک خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ اُن کا نام کارٹ رائٹ تھا۔ اُن کی سیرت میں اہلِ ویسکس کی خُوبیاں تھیں اور بعض باتوں میں اُن کی طبیعت والدِ محترم سے بالکل مختلف تھی۔ وُہ والد صاحب کی نسبت زیادہ عمل پسند تھیں۔ والدِ محترم چُونکہ بڑے ہی مُنکسر المزاج تھے اُنہوں نے اس حقیقت کو فوراً سمجھ لیا اور وُہ تمام اہم معاملات میں والدہ محترمہ کی صائب رائے کو قبُول کر لیا کرتے تھے۔ اُنہیں والدہ کی معاملہ فہمی پر پُورا پُورا اعتماد تھا۔ والدہ محترمہ کے ننھیال اسکاچ تھے۔ مَیں اُن کے متعلق بھی ذکر کرُوں گا۔

ہمارا گھر بچّوں سے بھرا ہُوا تھا۔ اُنہیں گھر کے اخراجات چلانے میں بڑی کفایت شعاری اور دُور اندیشی سے کام لینا پڑتا تھا۔ وُہ سارا دِن آمدنی اور خرچ کو متوازن کرنے میں لگی رہتی تھیں۔ ہم کُل چودہ تھے۔ میری ایک ننھی بہن ایّامِ طفولیت ہی میں فوت ہوئی۔ اُس زمانہ میں خاندانوں میں افراد کی تعداد آج کل سے زیادہ ہُوا کرتی تھی۔ والدہ محترمہ اس بات کی بڑی احتیاط کیا

کرتی تھیں کہ خاندان کے معاملات میں والد صاحب کو کوئی کوفت نہ ہو اور یہ چیز والد صاحب کی سرشت میں بھی تھی اور اُن کے لئے نہایت ہی موزوں بات تھی تاکہ وہ بڑی آزادی سے مذہبی باتوں کی طرف دھیان دے سکیں کیونکہ وہ خادم الدین تھے اور مذہبی فرائض کی انجام دہی اُن کی زندگی کا سب سے بڑا کام تھا۔ اگرچہ اخراجات زیادہ تھے اور ذمہ داریاں لاتعداد تھیں، والدہ محترمہ نے کبھی حوصلہ نہیں ہارا اور وہ اتنے بڑے کنبے کے نان و نفقہ کا اہتمام بڑی خوش اسلوبی سے کیا کرتی تھیں۔ اُن کی زندگی عمل کی جیتی جاگتی تصویر تھی لیکن اس کے باوجود وہ کبھی مارتھا[1] کی طرح نہیں ہوئیں جو خدمت کرتے کرتے اُکتا گئی تھی اور اُس نے اپنی بہن مریم[2] کی شکایت کی تھی۔ اس کنبہ میں میں چھٹے نمبر پر تھا۔ دو بہنیں اور ایک بھائی مجھ سے بڑے تھے۔ میں ۱۲ فروری [illegible] کو کارلائل[3] کے مقام پر پیدا ہوا لیکن میری پیدائش کے چند ہفتے بعد ہم نے نیو کیسل[4] میں دریائے ٹائن[5] کے کنارے اپنا گھر بنا لیا۔ میرا بچپن کا زمانہ دریائے ٹائن کے کنارے گذرا۔

میری والدہ محترمہ میں لالچ نام کو بھی نہیں تھا۔ وہ بڑی ہی کم سخن اور اعتدال پسند تھیں۔ جب ہم سن شعور کو پہنچے اور ہمیں معلوم ہوا کہ انہوں نے ہمارے لئے بڑے دُکھ اُٹھائے ہیں اور اُف تک نہ کی تو ہمارے دلوں میں اُن کی قدر و منزلت اور زیادہ بڑھ گئی۔ جب ہمیں خیال آتا تھا کہ اُنہوں نے خاموشی سے ہماری پرورش اور نگہداشت کی ہے تو ہم اُنہیں بے حد چاہتے تھے۔ اسی طرح مذہب کے معاملے میں بھی وہ خاموش طبع تھیں۔

---

[1] MARTHA [2] MARY [3] CARLISLE [4] NEW CASTLE [5] TINE-SIDE.

وُہ بڑی شرمیلی اَور کم گو تھیں۔ صرف خُدا باپ ہی اُنہیں جانتا تھا جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے" اَور وُہ درگزر فرماتا ہے۔ ہم نے یہ دیکھا کہ تمام اہم فیصلوں کے وقت اُن کا تمام بھروسہ خُدا پر ہُوا کرتا تھا اور اُن کی نگاہوں میں اُس خُدا کا نُور تھا جو اُن کے دِل میں جلوہ فگن تھا۔ وُہ اپنے ننھے مُنے بچّوں کو خُداوند مسیح کے متعلق تعلیم دیا کرتی تھیں لیکن وُہ زیادہ تر عملی نمونہ پیش کیا کرتیں اور محض پند و نصیحت پر اکتفا نہیں کیا کرتی تھیں۔

اِن ہی ایّام میں شام کے قریب وُہ ہمیں اپنے پاس بلا لیا کرتی تھیں اَور ہمارے ساتھ بچّوں کے دِل پسند گیت گایا کرتی تھیں۔ اِس چیز نے ہمیں اُن کا اَور بھی گرویدہ بنا دیا۔ اُس وقت اُن کی رُوح آزادی کی زندگی بسر کرتی تھی اَور ہم محسوس کیا کرتے تھے کہ ہم پر آسمان سے اطمینان و انبساط کی بارش ہو رہی ہے۔ وُہ خُداوند مسیح کے متعلق ہم سے اِس طرح باتیں کیا کرتی تھیں کہ ہم اِس کے بعد اُن باتوں کو کسی طرح بھی نہیں بُھلا سکے۔

والدہ محترمہ اپنے گھر سے کبھی غیر حاضر نہیں رہا کرتی تھیں، یہاں تک کہ وُہ ایک رات کے لئے بھی کبھی باہر نہیں گئیں۔ وُہ شاذ و نادر ہی گھر سے باہر نکلتی تھیں اَور اگر کبھی وُہ گھر سے باہر نکلتیں تو وُہ بھی عبادت کے لئے نکلتیں تاکہ گرجے جائیں، اِس کے بعد وُہ فوراً گھر واپس آجایا کرتی تھیں۔ اُن کے دِل میں یہ خیال بیٹھ چکا تھا کہ اگر وُہ گھر سے غیر حاضر رہیں تو اُن کی غیر حاضری میں ضرور کوئی نہ کوئی چیز خراب ہو جائے گی اَور اُن کا یہ سچّی خدشہ ہمیشہ ہی سچّا ثابت ہُوا۔ اُن کے بغیر گھر کا تصوّر ناممکن تھا۔ جب ہم گھر سے

دُور ہوا کرتے تھے تو ہم اُن سے ہی خط و کتابت کیا کرتے تھے اور جب ہم گھر واپس آتے تھے تو سب سے پہلے وُہی ہمارا خیر مقدم کیا کرتی تھیں۔

والدہ محترمہ کی ایک چھوٹی بہن بھی تھیں جن سے وُہ بے حد محبت کیا کرتی تھیں۔ اُن کی ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ والدہ محترمہ اُن کے دیہاتی گھر میں آکر رہیں اور کافی عرصہ تک آرام کریں۔ ہم بچے اب جوان ہو چلے تھے۔ ہم نے کئی بار اُنہیں خالہ جان کے ہاں جانے کی ترغیب دی۔ آخرکار ایک دن موسم گرما میں بے حد گرمی پڑ رہی تھی۔ اس گرمی کی وجہ سے شہر میں زندگی اجیرن ہو رہی تھی۔ ہم نے صلاح کی کہ والدہ صاحبہ کو خالہ جان کے ہاں جانے کے لئے کہیں۔ آخرکار ہماری کوششیں کامیاب ہوئیں۔ اور وُہ سفر کے لئے رضامند ہو گئیں۔ ہم میں سے ایک اُن کے ساتھ روانہ ہوا تاکہ وُہ تنہائی محسوس نہ کریں۔ لیکن ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ اُن کی طرف سے تار آیا کہ وُہ واپس آ رہی ہیں۔ اُنہوں نے اعتراف کیا کہ وُہ رات کو سو نہیں سکتی تھیں۔ اُنہیں کبھی سکون نصیب نہیں ہوا کیونکہ اُن کے دل میں ہر وقت خدشہ رہتا تھا کہ اُن کی غیر حاضری میں کوئی دلخراش واقعہ نہ رُونما ہو جائے۔

والدہ محترمہ کے خانوادہ کا تعلق ویکس سے تھا لیکن اُن کا حسب و نسب اہل سکاٹ لینڈ سے بھی ملتا تھا۔ اُن کے بارے میں وُہ بڑے فخر سے باتیں کیا کرتی تھیں۔ اکثر اوقات ہمارے بھائی بند گلاسگو[۱] اور ایڈنبرا[۲] سے ہمیں ملنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ والدہ محترمہ اُن کی بڑی آؤ بھگت کیا کرتی تھیں۔ گھر میں اُن کی آمد سے زندگی کی نئی لہر دوڑ جایا کرتی تھی اور ہم اُن سے نئی نئی

---

[۱] GLASGOW [۲] EDINBURGH.

باتیں سُننے کی ہمیشہ توقع رکھا کرتا تھا۔ میری فطرت میں یہ خیال رچ بس گیا تھا کہ انگلستان کے شمال میں وُہ مُلک جسے سکاٹ لینڈ کہا جاتا ہے، بڑا ہی خُوبصُورت ہے۔ وہاں دلفریب مناظر ہیں اور چپے چپے پر قُدرت کی رعنائیاں موجُود ہیں۔ میری والدہ محترمہ اس پہاڑی مُلک کی باتیں کیا کرتی تھیں۔ اُن کی البم میں اس مُلک کی حسین وجمیل تصاویر تھیں۔ وُہ یہ تصاویر ہمیں دکھایا کرتی تھیں۔ وُہ ایک خاص انداز سے اس جگہ کے نغمے سُنایا کرتی تھیں۔ اِن تمام چیزوں سے سکاٹ لینڈ کے لیئے میرے دِل میں محبت اور احترام کے جذبات پیدا ہو گئے اور وُہ محبت آج تک میرے دل میں موجُود ہے۔ ابھی تک میرے ذہن میں اُن کی پیاری پیاری کامنی سی صُورت ہے جو پیانو پر "آلڈ روبن گرے" اسکاٹ لینڈ کا ایک گیت گایا کرتی تھیں۔ اُن کی آواز بڑی رسیلی اور دھیمی تھی۔ اسکاٹ لینڈ کے نغموں کے لیئے اس قسم کی رس بھری آواز کی ضرورت ہے۔ وُہ اسکاٹ لینڈ کے گیت بڑی دلسوزی سے گایا کرتی تھیں۔

لیکن اس کے علاوہ اِن میں ایک اور بھی خُوبی تھی جس نے میرے دِل میں والدہ محترمہ سے والہانہ محبت پیدا کر دی۔ چُونکہ اس سے اُن کی محبت اور فہم وخرد کا اندازہ کر سکتا ہے اس لیئے اس بات کو مَیں ذرا تفصیل سے بیان کروں گا۔ وُہ اپنے بچّوں سے بڑی محبت کرتی تھیں۔ اس چیز سے یہ بھی معلُوم ہو جائے گا کہ مجھے انسانی فطرت کی گہرائیوں کا کس طرح تجزیہ ہُوا۔ مثلاً مصائب، دُکھ، درد غرضیکہ قوت کا کس طرح سے سامنا کرنا چاہیئے۔ جب میری عُمر ابھی ۷ برس کی تھی تو مُجھے ایک بُخار ہُوا جس سے مُجھے

ROBIN GREY.

گنٹھیا ہو گیا۔ مجھے یہ بخار اچانک ہُوا۔ مَیں رات دِن درد میں کراہتا رہتا تھا۔
اس طرح کئی دن گزر گئے۔ اُس وقت ہم دریائے ٹاشن کے کنارے نیو کاسل
میں رہا کرتے تھے۔ تقریباً چھ مہینوں تک بیماری زوروں پر رہی اور اس پر قابو
نہ پایا جا سکا۔ بخار سے زندگی کے لالے پڑ گئے۔ مَیں ایسا لاغر ہُوا کہ بس ہڈیوں کا
ڈھانچہ رہ گیا۔ لیکن والدہ محترمہ کی انتھک کوششوں اور تیمارداری سے میری
جان بچ گئی۔ اس بیماری نے ہمیں ایک دُوسرے کے بے حد قریب کر دیا۔
ہم ایک دُوسرے کو بڑی اچھی طرح سے سمجھنے لگے۔ وُہ میرے دُکھ کو اپنا دُکھ
سمجھتی تھیں اور صرف وُہی جانتی تھیں کہ زخم پر کس طرح پھاہا لگایا جا سکتا
ہے اور مریض کو کس طرح سنبھالا جایا کرتا ہے۔ اگر درد دوبارہ ہونے لگتا تو
وُہ فوراً میری چارپائی کے پاس آجاتیں اور مجھے تسلی اور تشفی دیا کرتی تھیں۔
اگرچہ میرا درد ناقابلِ برداشت ہوتا تاہم اُن کی باتوں سے مجھے سکون ملتا تھا۔
وُہ میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر خُداوند مسیح کے بارے میں
بتایا کرتی تھیں کہ وُہ چھوٹے بچوں کو اپنی گود میں لے کر اُنہیں اپنے ہاتھوں سے
برکت دیا کرتا تھا۔ والدہ محترمہ کی باتیں بڑی سادہ ہُوا کرتی تھیں۔ اُسی زمانہ میں
مجھے خُدا اور خُداوند مسیح اور دُعا کرنے کا شعور ہُوا۔ وُہ ایسے خیالات کو
حقیقت کا جامہ پہنا دیا کرتی تھیں۔ اُن کا بات کرنے کا انداز بڑا سادہ اور پُرمعنی
ہوتا۔ بیماری کے اِن ایّام میں مَیں اُن کی باتوں کو سمجھنے کے قابل ہُوا اور اگر
مَیں بیمار نہ ہوتا تو اتنی آسانی سے اُن کی باتیں نہ سمجھ سکتا۔
ایک واقعہ تو بڑا ہی اہم ہے اگرچہ یہ بڑا ہی معمولی دکھائی دیتا ہے۔

کم ازکم یہ واقعہ مجھے بڑی اچھی طرح سے یاد ہے۔ کئی دنوں تک میں زندگی اور
موت کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ مجھے زندہ رہنے کی خواہش نہ رہی۔ ایک صبح
جب میں بیدار ہوا تو میں نے اپنے سرہانے ایک پھول دیکھا۔ میری والدہ محترمہ نے
یہ پھول میرے سوتے میں میرے بستر پہ رکھ دیا تھا تاکہ جب میں جاگوں تو اسے
دیکھ سکوں۔ اب ایسا ہوا کہ جونہی میں نے اس پھول کو دیکھا تو وہ کشمکش جو مجھ
میں جاری تھی از سرِ نو بیدار ہو گئی۔ میں نے اپنے آپ میں ایک تازہ زندگی
محسوس کی۔ پھول کے حسن نے مجھے ایک گونہ خوشی عطا کی۔ مجھ میں زندہ رہنے
کی آرزو پیدا ہوئی حالانکہ اس وقت میں قریب المرگ تھا۔ میری والدہ محترمہ
نے فوراً معلوم کر لیا کہ پھول کو دیکھ کر میرے چہرے پہ رونق آگئی ہے۔ انہوں
نے بڑے پیار سے وہ پھول وہاں رکھا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی
لگاتار دعاؤں نے مجھے دوبارہ صحت عطا فرمائی۔ اس دن سے میری صحت
بحال ہونے لگی اور زندگی میں ایک قسم کی جاذبیت پیدا ہو گئی اور زندہ
رہنے میں لطف آنے لگا۔

یہ طویل علالت میرے بچپن میں بڑا ہی اہم واقعہ تھا جس کے گہرے اثرات
میرے مستقبل میں نظر آنے لگے۔ مجھ میں سنجیدگی اور متانت آگئی۔ میں [illegible]
ہوا۔ اس قسم کی باتیں عام بچوں میں نہیں ہوا کرتیں۔ بعض اوقات میں پہروں اس
بات پہ سوچتا رہا ہوں کہ نامساعد حالات اور حادثات کے باوجود بھی میرا ایمان
خدا اور خداوند مسیح پہ پختہ رہا ہے۔ مصائب نے میرے ایمان کو متزلزل
نہیں کیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بچپن کے ایام کی علالت میں میری

والدہ کی رُوحانی زندگی کا مجھ پر بہت زیادہ اثر ہُوا اور اُن کی رُوحانی خوبیوں کے اَن مِٹ اثرات مجھ میں نظر آنے لگے اور اس کے بعد وُہ میری زندگی کا ایک جزو بن گئے۔

اس حالت سے شفا یابی کے بعد مَیں بڑا ہی دُبلا پتلا اور کمزور رہا۔ مَیں نے اپنے خاندان کی ایک تصویر دیکھی ہے جس میں مَیں بڑا ہی نحیف و نزار نظر آتا ہُوں۔ مَیں اس تصویر میں اپنی والدہ محترمہ کے پہلو میں بیٹھا ہُوں۔ میرا سر بڑا سا ہے اور گال پچکے ہُوئے ہیں۔ مَیں کسی سخت ورزش کے قابل نہیں تھا۔ جب مَیں تندرست ہُوا تو میرے والد محترم اپنے مذہبی فرائض کی بجا آوری کے سلسلہ میں شمالی انگلستان سے مڈلینڈ[1] میں آ گئے۔ ہم برمنگھم[2] کے صنعتی شہر میں رہائش کرنے پر مجبور تھے۔ یہ شہر بڑا ہی گنجان آباد ہے۔ کارخانوں کی چمنیوں سے دُھواں اُٹھتا ہے جس سے ہر وقت اندھیرا چھایا رہتا ہے۔ شہر کی مضافاتی بستیوں میں بھی آبادی روز بروز بڑھ رہی تھی اور یہ بستیاں بڑھتے بڑھتے نزدیک کے گاؤں تک پہنچ گئی تھیں۔ ہم ایک کوارٹر میں رہا کرتے تھے۔ یہ جگہ شہر کے مرکز میں تھی۔ اس جگہ سے اُکتا دینے والی بے ڈھنگی اور بدصورت گلیوں کا لا متناہی سلسلہ نظر آتا تھا۔ یہاں شور و شغب، مشینوں کی گڑگڑاہٹ اور غلاظت کی فراوانی تھی۔ آج کل کی کارخانوں کی دُنیا میں یہ چیزیں عام ہیں۔ مُلک کے اس حصّہ کو جہاں میلوں تک کارخانے ہی کارخانے پھیلے ہُوئے ہیں اور کسی کھیت کا نام و نشان نہیں ہے "بلیک کنٹری"[3] کہا جاتا ہے اور کانوں سے جو دُھواں نکلتا تھا وُہ بڑا ہی مضرِ صحت تھا۔ جلے ہُوئے کوئلوں کی راکھ

---

[1] MIDLAND [2] BIRMINGHAM [3] BLACK COUNTRY.

اور دھات کی میل کچیل کے انبار لگے ہوئے تھے۔ ایسے ماحول میں کسی چیز کا نشوونما پانا محال تھا۔ چھوٹے چھوٹے جھلسے ہوئے درخت نظر آتے تھے جن کے چہروں پر کالک ملی ہوئی تھی۔ دھرتی کا حلیہ بگڑ چکا تھا اور خوبصورتی کا نام ونشان نہیں تھا۔ رات کے وقت تمام بھٹیاں چلتی تھیں۔ اس وقت نظارہ بڑا ہی خوفناک ہوتا تھا۔ اپنے بچپن کے زمانہ میں مجھے اس دھوئیں اور شعلوں کی سرزمین میں ایک مرتبہ ریل کا سفر کرنا پڑا۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ مجھ پر کس طرح سے دہشت طاری ہو گئی تھی۔

اگرچہ اس شہر کا ماحول صحت کے منافی تھا لیکن اس کے باوجود ہم بچوں کی صحت بڑی اچھی تھی اور ہمارا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جس کی صحت قابلِ رشک تھی۔ اس اچھی صحت والے خاندان میں صرف میں ہی ایک ایسا فرد تھا جسے ایک خطرناک بیماری سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ میں نے اس سے پیشتر ذکر کیا ہے کہ ہم چودہ بچے تھے اور ان میں سے ایک صغر سنی میں فوت ہو گیا تھا۔ باقی تمام سن بلوغ کو پہنچے اور ہم میں سے آج بھی نو زندہ ہیں۔ میرے والدین اسّی برس سے زیادہ عرصہ تک زندہ رہے اور ان کے بھائی بہنوں کی عمر اس سے بھی زیادہ تھی۔ میری والدہ محترمہ کی مشفقانہ نگہداشت اور عقلمند خاندانی ڈاکٹر کے مفید مشورہ کی وجہ سے گنٹھیا کے بخار کے برے اثرات آہستہ آہستہ جاتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے سخت ورزش سے منع کر دیا تھا لیکن کافی عرصہ تک میں جسمانی طور پر کمزور رہا اور اس کمزوری نے مجھے کبھی نہیں چھوڑا۔ چونکہ مجھے بڑی دیر تک

جسمانی ورزش اور سخت کام سے منع کر دیا گیا تھا اس لیئے مجھ میں کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا اور یہ شوق میرے لیئے بڑا ہی مفید ثابت ہُوا۔ اس چیز نے بچپن میں ہی میری باطنی زندگی کے خیالوں اور تصورات کو حقیقت سے آشنا کر دیا۔ جب کوئی کتاب میرے ہاتھ آتی تھی تو مَیں اس کے مطالعہ میں ایسا مستغرق ہو جاتا کہ دُنیا و مافیہا سے بالکل بے نیاز ہو جایا کرتا تھا۔

اِن ایام میں میرا دماغ بڑی سُرعت سے نشو و نما پا رہا تھا۔ مجھے دورانِ مطالعہ ایک بے حد قیمتی خزانہ دستیاب ہُوا جس نے میرے سامنے فکر و خیال کی راہیں کھول دیں۔ میرے والدِ محترم کی الماری میں دینیات کی خشک کتابوں میں چھُپے ہُوئے سر والٹر سکاٹ کے ناول اور نظموں کی کتابیں تھیں۔ ان کتابوں کا کاغذ بڑا ہی گھٹیا قسم کا تھا اور اُن کے الفاظ بڑے ہی باریک تھے۔ اِن کتابوں کو پڑھتے وقت آنکھوں پر بوجھ پڑتا تھا لیکن جب مجھے یہ کتابیں مل گئیں تو ایسا معلوم ہُوا جیسے مجھے کوئی خزانہ مل گیا ہے اور یہ خزانہ زر و جواہر سے زیادہ قیمتی تھا۔ یہ خزانہ ایسا ہے کہ نہ ہی اسے چور چرا سکتے ہیں اور نہ ہی یہ کم ہو سکتا ہے۔

مَیں دورانِ مطالعہ میں لمبے لمبے فقروں اور مشکل پیراگرافات کو چھوڑ دیا کرتا تھا۔ مَیں اپنی پسندیدہ کتابوں کو دوبارہ پڑھا کرتا تھا اور دوبارہ مطالعہ کرتے وقت وُہ پہلے سے بھی زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی تھیں۔ اگرچہ اس وقت میری عُمر بہُت ہی چھوٹی تھی اور مَیں ادبِ عالیہ کا تنقیدی جائزہ نہیں لے سکتا تھا پھر بھی جبلّی طور پر مَیں صحیح طور پر کہانی کے

اصلی مفہوم اور لُب لُباب کو سمجھ لیا کرتا تھا۔ میں کہانی کے کرداروں کے خدوخال کو ذہن نشین کرنے کے قابل تھا۔ شہد کی مکھی کی طرح میں ایک پھول کا رس چوس کر دُوسرے پر جا بیٹھتا تھا اور اسی طرح رس چُوستا اور اُڑتا پھرتا تھا۔

اس زمانہ میں سروالٹر سکاٹ[1] سے زیادہ کسی دُوسرے مصنف نے مجھ پر اثر نہیں کیا۔ یہ زمانہ میری زندگی کا وُہ حصّہ ہے جس پر ہر ایک چیز کا اثر ہو سکتا تھا۔ علم و ادب میں ذوق و شوق کی میری ابتدا تھی۔ سروالٹر سکاٹ کی تحریرات میں اخلاق کا ایک خاص تصوّر ہے۔ اس کے لئے مَیں مصنّف موصُوف کا مرہُونِ منّت ہُوں۔ اُن کی کہانیوں کا رُومان بڑا ہی سادہ، پاکیزہ اور بلند ہے اور ایّامِ جوانی میں ہی میرے ذہن میں اُن کا یہ بلند معیار سما گیا۔

میری زندگی کے آخری حصّہ کی ایک مختصر سی کہانی مندرجہ بالا بیان کی تصدیق کرے گی۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ سروالٹر سکاٹ کے اثرات دُور رَس ہیں۔ ہم شانتی نکیتن[2] بنگال میں رہا کرتے تھے۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے سب سے بڑے بھائی کو ہم سب "بڑا بھائی" کہا کرتے تھے۔ وُہ اب بڑے ہی بُوڑھے ہو چکے تھے لیکن اس زمانہ میں بھی وُہ سروالٹر سکاٹ کے ناولوں کے اثرات کے بارے میں باتیں کرنے سے کبھی نہیں اُکتاتے تھے۔ وُہ کہا کرتے تھے کہ جوانی کے دِنوں میں وُہ اِن ناولوں کے شیدائی تھے۔ بعض باتوں میں میرے اور اُن کے تجربات ایک جیسے تھے، اگرچہ "بڑا بھائی" کبھی ولایت نہیں گیا تھا اور اُنہوں نے ساری عمر بنگال میں گزاری تھی۔ سکاٹ لینڈ کا پہاڑی مُلک اُن کے لئے دلکشی اور محبُوبیت

---

[1] SIR WALTER SCOTT [2] SHANTINIKETAN.

کی سرزمین بھی کیونکہ اس ناول نگار کی تحریرات نے اُن پر گویا جادو کر رکھا تھا۔ مجھ میں اور اُن میں یہ چیز مشترک تھی اور یہی ہمارے ایامِ جوانی کے خواب تھے۔

سروالٹر سکاٹ کی نظموں اور ناولوں کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہُوا کہ میں اپنے من کی دُنیا میں کھو گیا۔ وہ کہانیاں جن کا ماحول سکاٹ لینڈ ہوتا اُن سے مجھے زیادہ لُطف آتا تھا اور ان ناولوں کے کرداروں کے ساتھ میں بھی گھوما پھرا کرتا تھا۔ سکاٹ لینڈ میرے لئے رُومان کا گہوارہ تھا۔ شاذونادر ہی والد محترم ہمیں ریل کے ذریعہ برمنگھم سے باہر لے جایا کرتے تھے۔ یہ مقام بڑا ہی دلفریب تھا۔ اس کا نام سٹن کولڈ فیلڈ[1] تھا۔ اس جگہ قدرت کی رنگینیاں موجود تھیں۔ یہاں بہت بڑا پارک تھا جس کے چاروں طرف درخت اور تالاب تھے۔ جب دن ہم گھر سے باہر اس مقام پر آیا کرتے تھے، سیر و سیاحت کا دن ہُوا کرتا تھا اور میں تصور ہی تصور میں سکاٹ لینڈ کے کسی ناول کے کردار کے ساتھ لُطف اُٹھایا کرتا تھا۔ میں اُن تمام واقعات کو ڈرامہ کی شکل دے دیا کرتا تھا جو ان جنگلوں میں ہُوا کرتے تھے۔ اس کے بعد اپنے گھر کے ننھے سے باغیچے میں چھوٹے سے پیمانے پر میں بھی اسی قسم کے ڈرامائی کام کیا کرتا تھا۔ کسی نہ کسی وجہ سے میں شرمیلا تھا اور میں اپنے قلبی تاثرات کو اپنے بہن بھائیوں پر ظاہر نہیں کیا کرتا تھا، کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ شاید وہ میری بات کو نہ سمجھ سکیں۔ تصورات کا کھیل کھیلنے کے لئے تنہائی اور یکسوئی کی ضرورت ہے اور تنہائی کے لمحوں میں اپنے

[1] SUTTON COLD FIELD.

سپنوں کی دُنیا سے مجھے بڑا ہی لُطف آتا تھا لیکن اپنے ان خیالات کو دُوسروں پر ظاہر کرنے سے مجھے شرم محسُوس ہوتی تھی، اُور اس لئے مَیں اپنے ہی تصوّرات کی دُنیا میں مگن رہا کرتا تھا۔

چند سالوں کے بعد جب مَیں جوان ہُوا تو مَیں اس پہاڑی علاقے کی سیر اس لئے نہیں کرتا تھا کہ کہیں یہ مقامات مایُوس کُن ہی نہ ہوں۔ لیکن ایسا ہُوا کہ مَیں نے ان تمام مقامات کا ان کی تمام رعنائیوں اُور دلفریبیوں کے ساتھ نظارہ کیا۔ مجھے تنہائی بھی میسّر تھی۔ مَیں نے اس علاقہ کو دیکھنے کے لئے اکیلے ہی پیدل سفر کیا۔ جہاں میرا جی چاہا مَیں گیا۔ مَیں نے وُہ پگڈنڈیاں اُور راستے اختیار کئے جن پر سیّاح اکثر جایا کرتے تھے۔ میری جوانی کے تمام خواب تازہ ہو گئے اُور بچپن کے خوابوں نے حقیقت کا جامہ پہن لیا۔ بچپن کے بیتے ہُوئے دِنوں کی جب یاد آتی ہے تو میری آنکھوں کے سامنے وُہ تمام واقعات آجاتے ہیں۔ اُس زمانے کے سُندر سپنے ایک خاص قسم کی خوشی پیدا کرتے ہیں۔ آج بھی جب مَیں نے اپنی زندگی کا نصف سے زیادہ سفر طے کر لیا ہے اُور مَیں نے بہُت سے خوبصُورت مقامات کی سیر سے لُطف اُٹھایا ہے، مجھے سکاٹ لینڈ کی پہاڑیاں خُدا کی سرزمین پر سب سے زیادہ خوبصُورت دکھائی دیتی ہیں۔

اُور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس عظیم ناوِل نگار نے مجھ میں تخیّل کی دُنیا بیدار کر دی تاکہ مَیں اس جہان کی تمام خوبصُورت چیزوں سے لُطف اُٹھا سکُوں جنہیں خُداوند مسیح بہُت پسند کرتا تھا۔ مَیں نے

کبھی ایک لمحہ بھی یہ خیال نہیں کیا کہ دُنیا کی خُوبصُورتیاں خُداوند مسیح سے دُور تھیں۔ اس دُنیا میں حسن خواہ قُدرتی ہو خواہ رُوحانی ہو، مُجھے اُس کی محبّت کی یاد دلاتا ہے۔ مُجھے اس لئے یقین ہوجاتا ہے کہ زمین و آسمان ٹل جائیں گے مگر اُس کی باتیں ہرگز نہ ٹلیں گی۔

میری زندگی کے ابتدائی ایّام میں جو واقعات ہُوئے اُن کی صحیح صحیح تاریخ مُجھے یاد نہیں ہے۔ اس لئے مَیں اُنہیں اسی طرح چھوڑے دیتا ہُوں لیکن اگلا واقعہ جو مَیں بیان کرنے کو ہُوں، خاندان میں بے حد خُوشی کا باعث ہُوا۔ اگرچہ اس واقعہ سے مُجھے بہُت سی مصیبتوں کا بھی سامنا کرنا پڑا تاہم مُجھے یہ واقعہ بڑی اچھی طرح یاد ہے۔

جب میری والدہ محترمہ کی شادی ہُوئی تو اُنہیں جہیز میں بہُت سی رقم ملی تھی۔ اُن کے پاس آمدنی کے کافی ذرائع تھے۔ بچپن کے زمانہ میں ہم بڑی آسُودگی اور ہنسی خُوشی سے زندگی کے دن گُزار رہے تھے۔ میرے والد محترم کلیسیا میں بشارت کا کام بالکل مُفت کیا کرتے تھے اور وہ جماعت سے کسی قسم کا کوئی وظیفہ وغیرہ نہیں لیا کرتے تھے کیونکہ میری والدہ کا کافی روپیہ اِدھر اُدھر کاروبار میں لگا ہُوا تھا جس سے ہمیں بہُت آمدنی ہوتی تھی اور خاندان کا گُزارہ اچھی طرح سے ہو سکتا تھا۔ والدہ محترمہ کے تمام روپیہ کا انتظام ایک ٹرسٹ کے سپُرد تھا اور اُن کی تمام املاک کا انتظام کرنے کے لئے ایک ٹرسٹی مقرر کر دیا گیا تھا۔ میری پیدائش کے وقت سے یہی انتظام چلا آتا تھا اور ایسا معلُوم ہوتا تھا کہ ہمیشہ یہی سازگار حالات رہیں گے

اور ہم مستقبل میں بھی امن اور فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے رہیں گے۔
لیکن ایک دن صبح کی ڈاک میں والدِ محترم کو ایک خط موصول ہوا جس میں لکھا تھا کہ وہ ٹرسٹی والدہ محترمہ کی رقم سے سٹہ کا کاروبار کیا کرتا تھا۔ والدِ محترم نے براہِ راست کئی تار لنڈن بھیجے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اُن کی بہت سی امانتیں ابھی تک کاروبار میں لگی ہوئی ہیں کیونکہ ٹرسٹ کی یہی شرائط تھیں۔ اس دن یکے بعد دیگرے بہت سی تاریں موصول ہوئیں جن میں یہ لکھا ہوا تھا کہ وہ رقم جو میری والدہ کے نام سے جمع تھی وہ نکلوائی گئی ہے اور آخری خبر یہ تھی کہ ٹرسٹی فرار ہو گیا ہے۔ یہ ٹرسٹی شاک ایکسچینج میں میری والدہ محترمہ کی رقم اور اپنی رقم سٹہ پر لگایا کرتا تھا اور اس طرح وہ سارا روپیہ ہار بیٹھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ کے بعد معلوم ہوا کہ وہ کئی سالوں سے ہیرا پھیری کر رہا تھا۔ اُسے سوسائٹی کا ایک اعلیٰ رکن خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک مجرم کی زندگی بسر کر رہا تھا۔
میری آنکھوں کے سامنے ابھی تک میرے والدِ محترم کا متفکر چہرہ ہے کیونکہ وہ دوپہر بڑی ہی خوفناک تھی جب میری والدہ محترمہ والدِ محترم کو تسلی دے رہی تھیں۔ وہ سب سے زیادہ دلیر تھیں۔ والد صاحب اس میں اپنا ہی قصور سمجھتے تھے کیونکہ ٹرسٹی اُن کا اپنا ایک عزیز دوست تھا اور جب شادی کے وقت ٹرسٹ کی یہ دستاویز تیار ہوئی تو انہوں نے یہ مشورہ دیا کہ اُن کے دوست کو ٹرسٹی مقرر کیا جائے۔ نہ صرف اُن کو اس خیال سے دُکھ ہوتا تھا کہ اُنہوں نے اپنے ایک دوست کو ٹرسٹی

مقرر کروایا ہے بلکہ اس بات سے بھی تکلیف ہوتی تھی کہ اُن کے دوست نے اُن سے دغا کی ہے اور اُس نے دوستی کا حق ادا نہیں کیا۔ اس وحشتناک خبر سے جو حال اُن کا ہُوا، اُس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اُس دن کئی تار آئے اور ہر تار میں اُسی بربادی اور تباہی کی کہانی ہوتی تھی۔ مَیں اپنی والدہ سے چمٹا ہُوا تھا اور یہ دیکھ رہا تھا کہ ہر لحظہ اُن کی مایُوسی اور غم بڑھتے ہی جا رہے ہیں، لیکن میری عُمر ہی کیا تھی کہ مَیں یہ سمجھ سکُوں کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ مجُھے صرف یہی سمجھ آئی کہ میرے والد صاحب کے ایک دوست نے والدہ صاحبہ کی تمام پُونجی اُڑا لی ہے اور میرے دل میں بجّوں کا سا خوف طاری ہو گیا کہ نہ جانے والد صاحب اب کیا قدم اُٹھائیں گے۔ شام کی نماز کا وقت ہو گیا۔ خاندان میں ہر شام نماز ادا کی جاتی تھی۔ میری والدہ بڑی دلیر نظر آتی تھیں۔ وُہ خاموش تھیں۔ والد صاحب نے اس شام کے لئے مُقرّرہ شدہ زبُور پڑھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ یہ زبُور ایک دغا باز دوست کے متعلق لکھا گیا ہے۔ یہ زبُور یُوں ہے:۔

"جس نے مجُھے ملامت کی وُہ دُشمن نہ تھا ورنہ مَیں اُس کو برداشت کر لیتا اور جس نے میرے خلاف تکبّر کیا وُہ مجُھ سے عداوت رکھنے والا نہ تھا۔ نہیں تو مَیں اُس سے چھُپ جاتا۔ بلکہ وُہ تو تُو ہی تھا جو میرا ہمسر، میرا رفیق اور دلی دوست تھا۔ ہماری باہمی گفتگو شیریں تھی اور ہجُوم کے ساتھ خُدا کے گھر میں پھرتے تھے۔" (زبُور ۵۵: ۱۲-۱۴)

تھوڑی دیر کے لیئے والد صاحب پڑھتے پڑھتے ٹھہر گئے۔ اُنہوں

نے اس زبور کی اگلی آیات نہیں پڑھیں جن میں دغا باز اور بیوفا پر لعنت کی گئی ہے بلکہ اس کے برعکس اُنہوں نے اس کے لئے خدا سے دُعا کرنی شروع کی۔ دُعا کے دوران اُن کی آواز میں رقت پیدا ہو گئی اور اُنہوں نے اس دوست کے لئے بڑی ہی دلسوزی سے دُعا کی جس نے اُن سے ایسا ظالمانہ برتاؤ کیا تھا۔ اُنہوں نے خُدا سے دُعا کی کہ خُدا اُسے مُعاف کرے اور اُسے توبہ کی توفیق عطا فرمائے۔ جُوں جُوں وُہ دُعا کرتے جاتے تھے اُنہیں اس امر کا احساس ہی نہ رہا کہ اُن کا کوئی مالی نقصان بھی ہُوا ہے۔ اُن کے دِل میں اپنے دوست کی محبّت کا بے پناہ جذبہ مُوجُود تھا جب اُنہوں نے آمین کہی تو اُن کا چہرہ تبدیل ہو چُکا تھا۔ والدہ صاحبہ بھی ایسی خُوشی سے معمُور تھیں جیسے دُنیا کی دولت سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اگر دولت جاتی رہی تو کوئی بات نہیں، اطمینانِ قلب تو میسّر تھا۔

اس کہانی کا باقی حِصّہ جلدی جلدی ختم کیا جاتا ہے۔ آخر کار یہ واقعہ ہمارے خاندان کے لئے خُوش قسمتی کا باعث ثابت ہُوا۔ اب مَیں پہلے سے زیادہ اپنے والدین سے محبّت کرنے لگا۔ اگرچہ میری عُمر بُہت ہی چھوٹی تھی پھر بھی مُجھے اپنے نقصان کا علم تھا۔ اس چیز نے مُجھے اپنے والدین کا دِلدادہ و شیدا بنا دیا۔ مُجھے اپنی بسر اوقات کرنے کے لئے خُود کُچھ نہ کُچھ کمانا پڑتا تھا اور اس امر کی ضرورت نہ تھی کہ میرے والدین اس معاملہ میں میری مالی امداد کریں۔ اس سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے

کہ اگر مجھے آرام و آسائش کی زندگی میسر ہوتی تو میری صحت کی کمزوری کے
باعث میری عادات بگڑ جاتیں۔

میرے والدین نے مجھے گھر سے دُور کسی بڑے پبلک اسکول میں نہیں
بھیجا بلکہ برمنگھم شہر کے مرکز میں ایک گرامر اسکول میں مجھے داخل کرا دیا گیا۔ شاہ
ایڈورڈ ششم نے اس سکول کا سنگِ بُنیاد رکھا تھا۔ اس طرح میں اپنے والدین
سے کبھی جُدا نہیں ہُوا تھا اور وہی میرے لئے سب سے بڑے مُعلمین
اور اتالیق تھے۔ میں نے اپنے والدین کی روزمرہ زندگی سے وہ وہ باتیں
سیکھیں جو گھر سے دُور رہ کر میں کسی بورڈنگ اسکول میں نہ سیکھ سکتا تھا۔
خوش قسمتی سے گرامر اسکول میں میری تعلیم بالکل مفت ہُوئی۔ میں نے کالج
کی تعلیم کے لئے کافی روپیہ کما لیا تھا۔ اس اسکول میں طلبا کو وظیفے دیئے
جاتے تھے اس لئے مجھے بھی وظیفہ دیا گیا جس سے میں اپنی تعلیم کے
اخراجات پُورے کیا کرتا تھا۔

لیکن ابھی مجھے ایک دوسری بڑی برکت کا ذکر کرنا ہے۔ غُربت کی وجہ
سے ہمارے خاندان کے تمام افراد ایک ہی جگہ رہا کرتے تھے اور اگر میرے
والدین کی مالی حالت اچھی ہوتی تو یہ چیز کبھی ممکن نہ تھی۔ ہم نے چھوٹی چھوٹی
باتوں میں دُوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دینا سیکھا اور ہم مال و دولت کی
نسبت پیار اور محبت سے بہت زیادہ پسند کرتے تھے۔ اس طرح سے
تمام چیزیں ہمارے لئے خوشی پیدا کرتی تھیں۔ جب سے والدہ محترمہ
اپنی ذاتی املاک اور جائداد سے محروم ہُوئی تھیں وہ ہمارے لئے اور بھی

زیادہ قربانی کرنے لگیں ۔ وہ ہماری خاطر سارا سارا دن کام میں مشغول رہتی
تھیں اور کبھی بھی تھکن محسوس نہیں کرتی تھیں ۔ جب ہم اُن کی بے لوث محبت
اور لالچ اور حرص سے پاک زندگی کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اپنی کمینگی اور خود غرضی
پر شرم آتی ہے ۔

اس کے بعد خبر آئی کہ والدہ محترمہ کو [illegible] تپ ہو گیا ہے اور اپنے کئے
پر سب سے [illegible] کھوئی ہوئی [illegible] واپس [illegible]
نے سٹہ بازی میں [illegible] والدہ محترمہ کی [illegible] ساری دولت
ضائع کر دی تھی [illegible] اس نے صدق
دل سے میرے والدین سے معافی مانگی ۔

میرے والدین نے اُسے خوشی سے معاف کر دیا اور اس شخص کی وفات
سے پیشتر ہمارے تعلقات خوشگوار ہو گئے تھے ۔

تیسرا باب

ابتدائی ایام

اب ہم غریب ہو گئے لیکن باطن میں ہمیں اپنے گھر میں اطمینان نصیب تھا۔ اس زمانہ سے بیشتر میری زندگی مذہب سے بیگانہ تھی۔ خداوند مسیح کے متعلق جو تجویزیں میں نے محسوس کیں وہ والدہ محترمہ کی روزمرہ کی زندگی اور والد محترم کی نیک سیرتی اور پرہیزگاری کی وجہ سے تھیں۔ مختصر یہ کہ میرے والدین میرے لئے مسیح کے نمایندے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں میں نے خداوند مسیح کو دیکھا اور اُسے پیار کرنے لگا۔ جب کبھی میں خداوند مسیح کا تصور کیا کرتا تھا تو وہ مجھے والدہ صاحبہ کی طرح حلیم اور فروتن اور والد محترم کی طرح نیک طینت نظر آتا تھا۔ اچھے چرواہے کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے آجاتی تھی۔ اچھے چرواہے کی شکل و صورت والدہ محترمہ سے ملتی جلتی تھی۔ اس سے مجھے بے حد خوشی حاصل ہوتی تھی۔ میں آج بھی اس خوشی کا تصور اپنے دل کی گہرائیوں میں پاتا ہوں۔

اس کے بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ خداوند مسیح کی یہ تصویر حقیقت کے بالکل قریب ہے کیونکہ مصلوب کی بے پناہ قوت اور اختیار اس میں پایا جاتا ہے تاہم اس زمانہ میں اس تصویر سے مجھے تسلی ہوتی تھی۔

بچپن کے زمانہ میں اس تصویر کے ذریعہ خداوند مسیح مجھے ایک حقیقت معلوم ہوتا تھا۔ اس طرح وہ تصویر اپنا مقصد پورا کرنے میں کامیاب ہوئی۔

ان ابتدائی ایام کی یادیں میرے حافظہ میں ایسی واضح ہیں کہ مجھے ہر ایک تفصیل اچھی طرح سے یاد ہے۔ اور میں ہر ایک واقعہ بیان کرنے کے قابل ہوں۔ یہ واقعات میرے ذہن میں اونچے اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں کی طرح ہیں جن کی چاروں اطراف بے صورت بادل اور دھند ہے۔

پہلی تصویر میرے ذہن میں والدہ محترمہ کی ابھرتی ہے۔ بڑے دن کے مقدس تہوار پر تمام بچے ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے اور وہ بیت لحم کے اس نوزائیدہ بچے کی کہانی بیان کیا کرتی تھیں جسے صلح کا شہزادہ کہا جاتا ہے۔ وہ بڑے خوبصورت پیرایہ میں بیان کیا کرتی تھیں کہ بیت لحم کی سرائے میں جہاں خداوند مسیح پیدا ہوا مویشی بندھے تھے اور اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے اس نومولود کو پیار بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ بچہ چرنی میں پڑا تھا۔ اپنی کہانی میں رنگ بھرنے کی غرض سے وہ بہار اونٹ کا ذکر چھیڑ دیا کرتی تھیں کہ وہ اپنی لمبی گردن کو سب جانوروں سے اوپر کئے ہوئے نومولود بچے کو دیکھنے میں محو تھا۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ ہمیں ان حساس جانوروں سے مہربانی کا برتاؤ کرنا چاہیئے، کیونکہ قدرت نے انہیں قوت گویائی عطا نہیں کی۔ ان جانوروں نے بیت لحم کی چرنی میں خداوند یسوع مسیح کا بڑا ادب احترام

کیا، اس لئے خُدا ان جانوروں کو بڑا پیار کرتا ہے۔

اس کے بعد وُہ بادشاہ ہیرودیس کا ذکر کیا کرتی تھیں جو اس ننّھے بچے کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ پھر وُہ مشرق کی سرزمین سے آنے والے تین مجوسیوں کی کہانی سُنایا کرتی تھیں کہ وُہ کالے کوسوں کا سفر طے کر کے اس شہزادے کو دیکھنے کے لئے بیت لحم میں آئے۔ اُن کا سفر بڑا ہی خطرناک تھا۔ اُنہوں نے ریگستانوں میں سفر کی صعوبتیں برداشت کیں۔ سردی اور گرمی کی مصیبتیں سہیں، لیکن تاریک راتوں میں ایک ستارہ اُن کی رہنمائی کرتا رہا۔ وُہ کہا کرتی تھیں کہ مشرق کے یہ تین دانشور تین بادشاہ تھے۔ ایک مجوسی چین سے آیا تھا۔ دُوسرا سونا اُگلنے والی سرزمین ہندوستان سے تھا اور تیسرا ابی سینیا (افریقہ) سے آیا تھا۔ ان دُور دراز ممالک کے نام سُن کر ہمیں مسحُور ہو جایا کرتا تھا۔ آتشدان میں آگ روشن رہتی تھی اور والدہ محترمہ ہمیں ننّھے یسُوع کی خوبصورت کہانی پیارے پیارے لہجے میں سُنایا کرتی تھیں۔

والدہ محترمہ کو بچّوں کو کہانیاں سُنانے کے فن میں بڑا ملکہ حاصل تھا۔ خوشی کی یہ کہانی بڑے دن کی شام کو عجیب پُر جادُو کا اثر کر دیا کرتی تھی۔ آگ کی روشنی میں والدہ محترمہ کا چہرہ کُندن کی طرح دمکتا تھا۔ کہانی سُننے کے بعد ہم بچّے سو جایا کرتے تھے۔ کرسمس کی صبح چھ بجے کی عبادت میں شریک ہونے کے لئے ہم بڑے سویرے مُنہ اندھیرے اُٹھا کرتے تھے۔ اس وقت ہم میں ایک نئی قسم کا ولولہ ہُوا کرتا تھا۔ گھر سے باہر قدم رکھنے سے پیشتر ہم دبے پاؤں والدہ محترمہ کے کمرے کے قریب جاتے اور تھوڑی دیر سرگوشیوں

کے بعد ہم اُونچے اُونچے سُروں میں گانا شروع کر دیتے تھے "ہاگو مسیحی بیارد"۔ اس گانے میں ایک خاص قسم کا رُومان تھا۔

میرے سامنے ایک اَور واقعہ کی تصویر بھی آ رہی ہے۔ بات یُوں ہُوئی کہ ہمارے ہمسایہ کے گھر میں ایک مُرغا ذبح کیا جا رہا تھا۔ میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ مُرغے کی گردن سے سُرخ سُرخ خُون کی ایک دھار فوارے کی طرح اُوپر اُٹھ رہی تھی۔ بیچارہ جانور زمین پر پھڑ پھڑا رہا تھا۔ وُہ موت کی کشمکش میں مُبتلا تھا۔ اس رُوح فرسا منظر کو دیکھ کر میرا دِل بیٹھنے لگا اَور میں سسکیاں بھرتا ہُوا والدہ مُحترمہ کے پاس دوڑ گیا۔ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے کسی کو مرتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد بڑی مُدّت تک مُجھ پر موت کا خوف غالب رہا کیونکہ اس نظارے سے مجھے بے حد صدمہ ہُوا تھا۔

ایک اَور واقعہ میرے ذہن میں اُبھر رہا ہے۔ ایک مرتبہ غُصّے میں آ کر میں نے اپنے بڑے بھائی کو "احمق" کہہ دیا۔ فوراً میرے دماغ میں کتاب مقدس کی وُہ آیت آئی کہ احمق کہنے والے آتش جہنم کے سزاوار ہوں گے۔ میرے دِل پر خوف چھا گیا لیکن مُجھ سے غلطی یہ ہُوئی کہ میں نے اپنے دِل کی اس ہیجانی کیفیت کے متعلق کسی کو نہ بتایا۔ کئی دنوں تک میرے دِل میں یہ خوف جاگزیں رہا کہ مُجھ سے ناقابلِ مُعافی گُناہ سرزد ہُوا ہے۔ یہ خیال میرے دِل سے نہیں جاتا تھا۔

بچپن کی ان مُشکلات میں میں نے ابھی تک خُدا کی طرف رجُوع کرنا

نہیں دیکھا تھا۔ عمر کے ساتھ ساتھ مُجھے یہ تجربہ بھی حاصل ہُوا۔ اِس عمر
میں جب مَیں اِس گزرے زمانے کو یاد کرتا ہُوں تو اُس خوف کا خیال کر کے
میرے چہرے پر مُسکراہٹ آجاتی ہے۔ مُجھے یہ بات بڑی ہی عجیب معلُوم
ہوتی ہے کہ مَیں اِس قدر خوفزدہ تھا کہ مَیں نے اپنے اِس خوف کو اپنے
والدین سے چھپائے رکھا جن کی مہربانی اور شفقت کے متعلق میرے دِل
میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ اِس سے صاف ظاہر ہے کہ خُدا میرے نزدیک خُدائے
مہیب و قہار اور جبّار تھا۔ مُجھے یہ معلُوم نہیں تھا کہ وُہ محبّت ہے اور
مَیں نے دُعائے ربّانی میں "اَے ہمارے باپ" کی اہمیّت اور حقیقت کو
نہیں سمجھا تھا۔ میرے ننھے مُنّے بچپن کے تصوّرات میں مسیح تو بڑا ہی مہربان
اور پیار کرنے والا تھا لیکن خُدا جبّار اور قہار تھا جو انسانی عقل و فہم
سے بہت ہی دُور ہے اور اُس تک رسائی ناممکن ہے۔

اگر مَیں اپنے بچپن کی تشریح اِس قسم کے واقعات سے کرنے بیٹھوں
تو میرے تصوّرات بڑے ہی غلط ہوں گے۔ خوش قسمتی سے ہی قُدرت نے
مُجھے ایسا ملکہ ودیعت کیا ہے کہ جہاں کہیں مُجھے قُدرت میں کوئی دلفریبی
نظر آتی ہے مَیں جی جان سے اُسے سراہنے لگتا۔ جب مُجھے کسی گاؤں میں جانے
کا اتفاق ہوتا تو قُدرتی نظارے، دلکش سبزہ زار اور دُور دُور تک پھیلے
ہُوئے کھیت مُجھے ایک خاص قسم کی خُوشی عطا کیا کرتے تھے۔ بچپن کے
وُہ ایّام سنہری تھے جب مَیں گاؤں میں جا کر دیہات کے سادہ مگر پُرشکوہ
نظاروں سے لُطف اُٹھایا کرتا تھا۔ اِن مسحُور کُن مناظر کی یاد مُدّت العمر

تک میرے دل میں رہی ہے۔ مجھے خود رو پودوں اور جنگلی نباتات سے والہانہ محبت تھی۔ اگر کسی جگہ اچانک روشنی کی کرن رقص کرنے لگتی یعنی جنگل میں درختوں میں سے چھن چھن کر آفتاب یا ماہتاب کی کرنیں سبزے کے فرش کو جگمگائیں یا کسی گھر کے باغیچہ سے مختلف قسم کے پھول نظر کو طراوت بخشتے یا پکی ہوئی فصل کے خوشے شام کی شفق میں رنگین قبا پہنتے یا سطحِ آب پر شعاعیں رقص میں محو ہوتیں یا بارش کے بعد قوس و قزح کا حُسن ساری خُدائی میں پھیل جاتا تو اُن کو دیکھ کر مجھ پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اِن نظاروں میں خوشی اور انبساط کی ایک دُنیا پوشیدہ ہوتی تھی۔ جُوں جُوں میں جوان ہوتا گیا، قدرت کے اِن مناظر کی دلکشی کم ہونے لگی۔ وہ خوشی مجھے صرف اُسی وقت حاصل ہوئی ہے جب ایک اعلیٰ روحانی بحران کے بعد میرے رگ و پے میں بیداری کی لہر دوڑ گئی ہے اور مجھے جلالی راحت میسر ہوئی ہے۔

والد محترم کی شخصیت کا مجھ پر آنے والے زمانے میں بڑا اثر ہوا۔ اُن کے وہ بچے جنہیں خُدا نے قوتِ متخیلہ عطا فرمائی تھی اُن کی تعلیم و تدریس سے بہرہ ور ہوئے۔ کسی چیز کو سراہنے اور اُس کی رعنائیوں سے لطف اُٹھانے کی خوبی اُن میں معصوم بچوں کی طرح تھی۔ ظاہری رکھ رکھاؤ نے اُن کی سادگی پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ وہ ننھی ننھی فرومایہ تفاصیل میں بھی دلچسپی لیا کرتے تھے لیکن عام لوگ ایسی تفاصیل کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ علاوہ ازیں اُن میں جوانی کی اضطراری لچک لوچ موجود تھی۔

اس سے انہیں اس امر کی ضرورت نہ تھی کہ ہمیں ہدایات دیتے وقت وہ اپنے آپ کو جوان ظاہر کرنے کی کوشش کریں۔ ہم انہیں اپنے جیسا ایک نوجوان سمجھا کرتے تھے اور ہمیں کبھی محسوس نہیں ہوا کہ اُن کی عمر ہم سے زیادہ ہے۔ بچوں کے اس بہت بڑے خاندان میں وہ بھی ہماری طرح کے ایک بچے تھے۔ وہ ہمارے ساتھ کھیلوں میں حصہ لیتے اور ہماری درسی کتابوں میں بھی دلچسپی کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔ انہیں سب سے بڑا بچہ کہنا زیادہ موزوں ہے۔

میرے چاروں طرف اُمید افزا ماحول تھا۔ والد محترم مجھے ہر وہ بات بتانے کے لئے تیار رہتے تھے جو میری سمجھ سے ذرا بالا تھی۔ انہیں پورا پورا احساس تھا کہ میں بڑی آسانی سے ان کی بات سمجھ جاتا ہوں۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ انہوں نے کبھی سمجھاتے وقت سرزنش کی ہو یا مجھے سخت سست کہا ہو جس سے میرے حوصلے پست ہو جاتے۔ انہیں یقین تھا کہ میں اُن کے معیار پر پورا اتروں گا۔ انہوں نے ہر معاملہ میں مجھے اپنا بہترین رفیق خیال کیا اور انہیں میری ذہانت پر پورا پورا بھروسہ تھا۔

اس قسم کی باتیں حقیقت میں اُن کی زندگی کا جزو لاینفک تھیں کیونکہ وہ ہر ایک سے بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتے اور انہیں یہ ڈھب یاد تھا نیز اگر کسی وقت وہ اجنبی لوگوں کی محفل میں ہوتے یا ایسے لوگوں کے ساتھ ہم سفر ہوتے جنہیں انہوں نے اس سے پیشتر کبھی دیکھا تک نہ ہو تو وہ بلا تکلف اُن سے گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیتے اور انہیں اپنے خیالات سے مستفید فرماتے۔ وہ بلا جھجک اپنی رائے کا اظہار کر دیا کرتے۔ اُن کا مزاج

اتنا اچھا تھا اور اُن کی فطرت اتنی نیک تھی کہ کوئی شخص اُن کی باتوں کو بُرا نہیں منایا کرتا تھا۔ ہر ایک انسان سے وُہ ایک جیسا سلوک کیا کرتے تھے۔ اُنہیں بنی نوعِ انسان کی نیک فطرت پر کامل بھروسہ تھا۔ میری والدہ محترمہ نے اُنہیں کبھی سفر کے اخراجات کے علاوہ کوئی پیسہ نہیں دیا کیونکہ اُن کی طبیعت اتنی سخی تھی کہ اگر کوئی اُن کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا تو وُہ سارے پیسے اُسے دیا کرتے تھے اس لئے والدہ صاحبہ نے اُنہیں کبھی زیادہ پیسے نہیں دیئے تھے۔ بعض اوقات اُن کی نیک فطرت کی وجہ سے کئی لوگوں نے اُنہیں فریب بھی دیا ہے لیکن چونکہ انہیں یقین تھا کہ انسان کی فطرت میں نیکی کا جوہر ہے اس لئے انہیں اس کا دُکھ بھی نہ ہوتا۔ یہی لوگ اُن پر اعتماد کرتے اور اُن سے محبت کرتے۔ بچپن کے دنوں میں وُہ خود مجھے تعلیم دیا کرتے تھے۔ وُہ مجھے بڑی جلدی جلدی سبق پڑھاتے تھے تاکہ میرے خیالات میں وُسعت پیدا ہو اور علم کے تمام شعبوں سے میری دلچسپی بڑھے۔ اب میں اُن سے سبق نہیں لیا کرتا تھا لیکن پھر بھی وُہ میرے بہترین رفیق اور ہمدرد تھے۔ وُہ بلاتکلف میرے ساتھ بحث و تمحیص کیا کرتے تھے۔ اُن کی باتوں میں تند و تیز لہجہ کبھی نہیں ہوتا تھا۔ وُہ مجھ سے ایسے بات کیا کرتے جیسے میں اُن کے ہم مرتبہ ہوں۔ وُہ میری خوابیدہ قوتوں کو بیدار کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوئے اور اُنہوں نے میری ذہانت کو جلا دی۔

میرے بچپن کے زمانہ کے دوران میرے اور والد محترم کے درمیان اعتماد کا ناقابلِ شکست رشتہ قائم رہا لیکن ایک دن میری غلطی کی وجہ سے

اس اعتماد کے نازک تار ٹوٹتے ہوئے معلوم ہوئے۔ میں بے حد بے چین اور مضطرب تھا۔ بات یوں ہوئی کہ میں نے جھوٹ بول دیا۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے :-

میری والدہ محترمہ کا ایک رشتہ میں بھائی تھا۔ وہ عمر رسیدہ بزرگ تھے۔ ہمارے لئے وہ ایک اجنبی شخص تھے۔ وہ مجھے اور میرے ایک بھائی کو اپنے ساتھ لندن لے گئے۔ ہمارے ساتھ ہمارا ایک چچا زاد بھائی بھی تھا۔ میرے دل میں خیالات کا ایک ہجوم تھا۔ میں خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا کیونکہ میں نے اس سے پہلے لندن نہیں دیکھا تھا۔ میرے والدین کے ساتھ یہ طے پایا تھا کہ ہم اسی شام لندن سے گھر واپس آجائیں گے۔ لیکن ہمارے اس رشتہ دار نے اصرار کیا کہ ہم یہ رات ان کے ہاں گذاریں کیونکہ لندن میں شاندار نمائش ہو رہی تھی اور روشنی کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ اگر ہمارے رشتہ دار نے ہمیں لندن میں رکھنے کے متعلق رازداری سے کام نہ لیا ہوتا تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ لیکن انہوں نے ہمارے والدین کو تار دے دیا کہ ہم گاڑی سے رہ گئے ہیں اس لئے ان کے ہاں رہ گئے۔ اب انہوں نے ہمیں تلقین کی کہ ہم یہ بات کسی کو نہ بتائیں اور ہم رضامند ہو گئے۔ اس طرح سے ہم نے اپنے والدین کو دھوکا دیا۔ مجھے اس وقت تو محسوس نہ ہوا کہ ہم جھوٹ بولنے کے مرتکب ہو رہے ہیں اس لئے میں نے اپنے بھائی اور چچا زاد بھائی سے مصالحت کر لی کہ ہم وہی کہیں گے جو ہمارے اس محترم نے فرمایا ہے لیکن اس کے بعد مجھے احساس ہوا کہ ہم نے کیا کر دیا ہے تاہم ہم نے اس بات کو خفیہ رکھنے کا وعدہ کر لیا تھا۔

میرا دل مجھے ملامت کرنے لگا۔ کئی مہینوں تک شرم کے احساس نے میرا پیچھا کیا، حتیٰ کہ آخرکار یہ واقعہ آہستہ آہستہ میری یاد سے محو ہو گیا۔ اس کے بعد بہت سے واقعات رونما ہوئے جنہوں نے اس واقعہ کو پسِ پشت ڈال دیا، لیکن اس کے داغ باقی رہ گئے۔

والدہ محترمہ گھر کے کام کاج میں بے حد مشغول رہتی تھیں اس لئے جب میں سنِ بلوغ کو پہنچا تو اب وہ پہلے کی طرح میری ساتھی نہ تھیں۔ والد محترم عظمت اور بزرگی کا مجسمہ تھے۔ اُن کی ذاتِ گرامی میرے لئے قابلِ تقلید نمونہ تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر کام کرنے پر قادر ہیں اور ہر ایک کو جانتے ہیں اور انہیں دنیا کے ہر ایک ملک کے متعلق بہت زیادہ علم ہے پس مجھے اُن کی ذات پر پورا پورا اعتماد تھا۔ مستقبل کے تمام تمنا نے سپنوں کے وہی روحِ رواں تھے۔ میری جوانی کے ایام میں وہ مجھ میں یقین کی شمع روشن کیا کرتے تھے اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے تمام ارمان پورے ہوں گے۔ وہ چیزوں اور خیالات کو دوسرے ممالک کی کہانیاں سنا کر واضح کیا کرتے تھے۔

ایک دن میں نے اپنی والدہ محترمہ سے التجا کی کہ وہ مجھے دوپہر کے کھانے کے ساتھ ہر روز چاول دیا کریں۔ میں نے اُن سے کہا کہ جب میں بڑا ہوں گا تو ہندوستان میں جا کر رہوں گا۔ والد محترم نے مجھے بتایا ہے کہ تمام ہندوستانی چاول کھایا کرتے ہیں اس لئے ہندوستان جانے سے پیشتر میں چاول کھانے کا عادی ہونا چاہتا ہوں۔

مَیں نے اس طریقہ سے اپنی والدہ محترمہ پر واضح کیا کہ مَیں بڑا ہو کر دُوسرے ممالک میں جاؤں گا۔ والدہ نے میری یہ التجا سُنی اَور ہنس دیں اَور کہنے لگیں کہ مَیں سوچ سمجھ کر بات کرنے والا لڑکا نہیں ہُوں، لیکن اُن کی آواز بھرا گئی اَور مَیں نے محسُوس کیا کہ جب مَیں نے کسی دُور دراز مُلک میں جانے کے متعلق کہا ہے تو وُہ کلیجہ مسوس کر رہ گئی ہیں۔ اُنہیں پہلی مرتبہ اس امر کا احساس ہُوا کہ جب مَیں جوان ہُوں گا تو کسی پرندے کی طرح گھونسلے سے پھُر سے اُڑ جاؤں گا۔ بات یہ ہے کہ اپنے تمام بچّوں میں سے وُہ سب سے زیادہ مُجھے چاہتی تھیں اَور مَیں بھی اُنہیں اپنے دِل کی گہرائیوں سے پیار کیا کرتا تھا۔

ایک دِن مَیں تنہا سٹن[ہ] کے جنگل کی طرف سیر و تفریح کی غرض سے نکل گیا۔ میرے دِل میں تجسّس اَور نئی نئی معلومات حاصل کرنے کا بےحد شوق تھا۔ اس جنگل میں قُدرت کی رنگینیاں اَور دلفریبیاں میرا انتظار کر رہی تھیں۔ اس جنگل کی تنہائی اَور خُوبصُورتی نے مجھے مسرور و شادماں عطا کیا۔ میری پرورش ایک بدصُورت شہر کے ماحول میں ہُوئی تھی۔ میرے دِل میں دیہات کے کھُلے میدانوں کے لیئے رُوحانی بھُوک تھی۔ جنگلات میں قُدرتی نباتات میں تمام قسم کی رعنائیاں موجُود تھیں۔ یہ جنگلات قُدرت کی سحر طرازی کا ایک نادر نمونہ ہیں۔

اس مرتبہ مَیں نے دلدل کے کنارے ایک پرندے کا گھونسلہ دیکھا۔ یہ گھونسلہ سرکنڈوں میں چھُپا ہُوا تھا۔ اس میں چار خُوبصُورت انڈے

ہ SUTTON

تھے۔ وہ انڈے ہلکے نیلے رنگ کے تھے۔ میرے دل میں خطرہ تھا کہ
میں دلدل کو عبور کرتے ہُوئے کہیں نیچے ہی نہ دھنس جاؤں، لیکن ان انڈوں
کو حاصل کرنے کا شوق اتنا زیادہ تھا کہ میں نے وہ انڈے گھونسلے سے
نکال لئے میں بے حد مسرور تھا۔ خوشی سے اُچھلتا کودتا میں اپنے والدین
کے پاس پہنچا تاکہ وہ بھی میری خوشی میں شریک ہوں۔

لیکن والدہ محترمہ مجھے ایک طرف لے گئیں اور اُنہوں نے بڑے ہی
پیار بھرے لہجے میں ان انڈوں کی ماں کی مامتا کی تصویر میری آنکھوں کے
سامنے کھینچی۔ یہ تصویر بڑی ہی درد انگیز تھی۔ اُنہوں نے کہا کہ وہ ماں
بیچاری جب اپنے گھونسلے میں آئے گی تو انڈوں کو وہاں نہ پاکر کیا کرے گی۔
اُس کی حالت قابلِ رحم ہوگی۔ والدہ محترمہ کی زبان سے یہ باتیں سُن کر میری
خوشیوں کے خوش نما محل دھڑام سے نیچے آگرے۔ والد محترم نے کہا کہ
میں کتنا شقی القلب ہُوں کہ میں نے وہ چاروں انڈے گھونسلے سے نکال
لئے اور ایک انڈا بھی اُن پرندوں کے لئے نہیں رہنے دیا۔

لیکن والدین میں سے کسی نے مجھے بُری طرح سرزنش نہیں کی۔ مجھے
بے حد صدمہ ہُوا۔ میری رُوح بڑی ہی بے چین ہُوئی۔ وہ رات میں نے
آنکھوں میں گزار دی۔ اگلی صبح میں سویرے سویرے پیدل جنگل میں
سے ہوتا ہُوا اُس دلدل تک پہنچا جس کے اردگرد سرکنڈے اُگے
ہُوئے تھے۔ میں نے جھاڑیوں میں اُس گھونسلے کی تلاش کی۔ میں
انڈوں کو گھونسلے میں رکھنا چاہتا تھا، لیکن میں اپنی کوشش میں ناکام رہا۔

مجھے اس واقعہ سے روحانی کوفت ہوئی۔ میرے دل پر اس صدمے کے گہرے اثرات ہوئے۔ میں بچہ تو تھا ہی لیکن بچپن کے خیالات نے اس واقعہ کو کچھ ایسا مبالغہ آمیز رنگ دیا کہ مجھ سے جو یہ نازیبا حرکت ہوئی تھی اس نے بڑی ہی خوفناک صورت اختیار کر لی۔ اس موقع پر میں نے خشوع و خضوع سے دعا کی اور مجھے کچھ اطمینان نصیب ہوا۔ اس زمانہ میں خداوند مسیح پر میرا ایمان پختہ نہیں تھا۔ میں نے اس وقت یہ سوچنا شروع کیا کہ خدا باپ ہے جو مجھے اپنے فرزند کی طرح پیار کرتا ہے۔ کچھ اور بھی باتیں تھیں جن کی وجہ سے مجھ پر خوف طاری ہو گیا۔ اس چیز نے میری مذہبی زندگی کو نشوونما کا موقع نہ دیا۔

اپنے لڑکپن میں میں اپنے والد محترم کے ساتھ سیر کے لئے باہر جایا کرتا تھا۔ مجھے اُن کے ساتھ سیر کرنے میں بڑا مزا آتا تھا۔ وہ بھی مجھے اپنے ساتھ سیر کرتے وقت بڑے ہی خوش ہوا کرتے تھے۔ وہ میرا ہاتھ پکڑے ہوئے سارا راستہ میرے ساتھ باتیں کرتے رہتے تھے کیونکہ میں بڑی توجہ سے اُن کی باتیں سُنا کرتا تھا۔ میں اُن کے ساتھ قدم قدم چلنے کی بھی کوشش کیا کرتا۔ وہ مجھے انسانی زندگی اور مستقبل کے بارے میں اپنے خیالات اور نظریات بتایا کرتے تھے۔ ان کے خیالات اور نظریات میں ایڈورڈ ارونگ کا رنگ غالب تھا۔ وہ اپنے وعظ میں بار بار ایڈورڈ ارونگ کی تعلیم سے اقتباسات پیش کیا کرتے تھے۔ انگریزی لٹریچر میں بائبل کے دوسرے درجے پر ایڈورڈ ارونگ کی تعلیم ہے

لہ EDWARD IRVING.

وُہ کہا کرتے تھے کہ "لوگوں کا یہ کہنا کہ حلف تقت نیچے سے
حاصل ہوتی ہے جھوٹ ہے، اِس کی مُنادی مخالفِ مسیح یعنی گناہ کا فرزند
ساری دُنیا میں کر رہا ہے۔ تمام قُوت اَور طاقت خُدا سے صادر ہوتی ہے،
یعنی آسمان سے نہ کہ زمین سے۔ یہ کہنا کہ آوازِ خلق نقارۂ خُدا ہے، شیطان
کا دل پسند فریب ہے۔"

میرے آباؤ اجداد کا مذہب پیوریٹن[1] تھا۔ اُن کے نظریات اَور خیالات
نے ہمارے گھر میں بڑا اثر کیا تھا۔ میرے والدِ محترم نے دادا جان سے یہ
خیالات ورثہ میں حاصل کئے تھے اَور ایڈورڈ ارونگ کی تعلیم نے اُن پر گویا
جادو کر رکھا تھا۔ روایات میں وُہ بڑے ہی قدامت پسند تھے اَور بادشاہوں
کے آسمانی حقوق پر اُن کا ایمان تھا۔ اُن کے نزدیک ملکہ وکٹوریہ خُدا کی
ممسوح حکمران تھیں، اِس لئے ہمیں اُن کے احکام کی دِل سے تابعداری
کرنی چاہیئے۔ وُہ دِل سے شاہ پرست اَور محبِ وطن تھے اَور اُن کے
مذہبی جذبات تابڑے ہی گہرے تھے۔ وُہ بڑے فخر سے بتایا کرتے تھے
کہ ملکہ وکٹوریہ کس طرح شہنشاہِ ہندوستان بنی ہیں اَور جزائرِ برطانیہ کی
ملکہ بھی ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں غدر ہوا، جب ہندوستانی فوجوں
نے اپنے انگریز افسروں کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ اِس زمانہ میں ہیولاک[2]،
اوٹرم[3] اَور لارنس[4] نے بڑی بہادری کے کارنامے سرانجام دیئے۔ اِن بہادروں
کی کہانیاں مُجھے سُنائی جاتی تھیں۔ غدر کے اِن بہادروں کی کہانیوں نے
میرے دِل میں شوق پیدا کر دیا کہ میں جوان ہو کر ضرور ہندوستان جاؤں گا۔

[1] PURITAN [2] HAVELOCK [3] OUTRAM [4] LAWRENCE.

میرے والدِ محترم کے خیال میں ہندوستان کی وسیع و عریض سلطنت
اینگلو سیکسن[1] نسل کا شاندار کارنامہ تھی۔ اس سلطنت کا رُوم کی شہنشاہیت
سے مقابلہ کیا جا سکتا تھا۔ یہ خیالات میرے ذہن پر مرتسم ہو گئے کیونکہ میں نے
اُنہیں جستہ جستہ اپنے والدِ محترم کی زبانی سُنا تھا۔

والدِ محترم وزیرِ اعظم انگلستان مسٹر گلیڈسٹون[2] کے نام پر ناک بھوں
چڑھایا کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ اس وزیرِ اعظم نے آئرلینڈ کے
سوال پر بڑی حماقت کا ثبوت دیا ہے اور اُس نے بڑے ذلّت آمیز
طریقے سے آئرلینڈ والوں کے مطالبہ کو مان لیا ہے۔ وُہ گلیڈسٹون کو
نفرت سے "غدّار" کہا کرتے تھے لیکن اگلے ہی لمحہ اُن کے چہرے پر
مُسکراہٹ پھیل جاتی تھی اور وُہ بلند قہقہے لگانے شروع کر دیتے تھے
تاہم اُن کے دِل میں گلیڈسٹون کے لئے بڑا ہی احترام تھا کیونکہ وُہ کہا کرتے
تھے کہ گلیڈسٹون کا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے ایک شاندار کتاب موسوم
"مقدس صحیفوں کی ناقابلِ تسخیر چٹان"[3] تصنیف کی ہے۔ جب میں جوان ہُوا
تو وُہ کہا کرتے تھے کہ گلیڈسٹون نے بحث و تمحیص میں ہکسلے[4] کو پچھاڑ دیا ہے۔
لیکن برطانوی شہنشاہیت کی خامیوں اور بُرائیوں کے متعلق مُجھے کبھی ایک
لفظ بھی نہیں بتایا گیا کیونکہ ان معاملات میں وُہ ایک بچّے کی طرح معصُوم تھے
اور اُن کو کبھی خیال تک نہیں آیا کہ اُن کے مُلک سے کبھی کوئی غلطی سرزد ہو
سکتی ہے یا ہُوئی ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ اُن کے مُلک سے کوئی ایسی بات
نہیں ہُوئی جس سے غیر ممالک کے باشندوں کی حق تلفی ہُوئی ہو۔ یہ حُب الوطنی

---

[1] ANGLO SAXON [2] GLADSTONE [3] THE IMPREGNABLE ROCK OF HOLY SCRIPTURE [4] HUXLEY

کے جذبات مجھے اپنے والدِ محترم سے ورثہ میں ملے تھے۔ اب یہ جذبات میری فطرت میں رچ بس گئے ہیں اور اس کے بڑی مدت کے بعد ہی مجھے اپنے تجربات سے اس امر کا احساس ہو سکا کہ اس تصویر کا دوسرا رُخ بھی ہے۔

جب میں اپنے لڑکپن کے گزرے ہوئے زمانہ پر ایک نظر ڈالتا ہوں تو مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت خوشی کا عنصر غالب تھا۔ میں اعصابی طور پر کمزور، شرمیلا اور بزدل تھا۔ مجھ پر ایک قسم کا خوف طاری رہتا تھا۔ میری صحت اچھی نہ تھی اور بیماری نے مجھے لاغر اور نحیف بنا دیا تھا لیکن میں آزاد منش تھا۔ تفکرات سے بے نیاز اور خوش و خرم رہا کرتا تھا۔ میں سپنوں کے اُس دیس میں رہا کرتا تھا جہاں صرف میرے ماں باپ کو ہی داخل ہونے کی اجازت تھی۔ میرے بہن بھائیوں میں سے کوئی بھی میرا رفیق، مونس اور غمگسار نہیں تھا جتنے میرے عزیز و محترم والدین تھے۔ اُن کی وجہ سے ہی میں زندہ تھا۔ میرے بہن بھائی میرے اچھے ساتھی اور دوست تھے، لیکن میرے والدین میرے دِل کی زینت تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ میرے سپنوں میں میرے حصّہ دار تھے۔

چوتھا باب

جماعت

برمنگھم کو روانہ ہوگیا جہاں میرے والد محترم پاسبان کی خدمت سرانجام
دیتے تھے اُس کی جماعت کے شرکاء کی تعداد بہت زیادہ نہ تھی لیکن اِس
جماعت کی رُوحانی زندگی قابلِ رشک تھی کیونکہ انگلینڈ میں ایڈورڈ ارونگ
کے ماننے والوں نے ایک ایسی جماعت کی تشکیل کی تھی جس کے ممبران ایک
دُوسرے سے بڑی اچھی طرح شیر و شکر تھے۔ اُن کی پاسبانی کا خُوب انتظام
تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مسیحی کلیسیا کے ابتدائی ایام کی سی زندگی بسر کر
رہے ہیں۔ یہ لوگ بڑے نیک اور مخلص تھے۔ وہ دُعا میں لگے رہتے تھے۔
وہ بڑے مہمان نواز اور غریب پرور تھے اور ایک دُوسرے کے گھروں میں
اکٹھے ہو کر دُعا کیا کرتے تھے۔ وہ ایک مشترک ایمان کے ساتھ ایک دُوسرے
سے وابستہ تھے۔ وہ لگاتار دُعا میں مشغول رہا کرتے اور خُداوند کے دِن
کے منتظر تھے کہ خُداوند اچانک آسمان سے زمین پر آئے گا۔ وہ اسے
"مُبارک اُمید" کہا کرتے تھے۔ اُن کا یہی تکیہ کلام تھا۔ رسُولوں کے زمانہ
کے لوگوں کا بھی یہی تکیہ کلام تھا۔ اُن کا یہ ایمان "تازگی بخشنے والا تھا۔ اس
مشترکہ ایمان کی بدولت اُن کی اُمید بڑی بلند رہتی تھی۔ اُن دنوں میں بھی

زندگی کو خداوند مسیح کے تابع کر رکھا تھا اور اُن کی شخصی زندگی میں یہی سب سے بڑی قربانی تھی۔ اُنہیں دُنیوی طور پر بڑا نقصان اُٹھانا پڑا لیکن عام حالات میں اُن سے اس قسم کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

جب لندن میں ایڈورڈ ارونگ[1] کے وعظ سے پہلی مرتبہ یہ تحریک مشہور ہوئی تو لوگ اُس کے پیروؤں کو ارونگ کے فرقہ کے لوگ کہنے لگے کیونکہ اس سلسلہ میں اُس کا نام زبان زدِ خلائق تھا۔ لیکن میرے والد محترم خود کو "ارونگ کے فرقہ" کا کہلانے سے گریز کرتے تھے۔ وُہ کہا کرتے تھے کہ میرا پُورا پُورا ایمان ہے کہ یہ تحریک کسی انسان نے شروع نہیں کی بلکہ اس میں خُدا کا ہاتھ کام کر رہا ہے۔ اس تحریک کی رہنمائی نبوّت کے کلام یعنی رُوح القدس سے ہو رہی ہے۔

اس نئے مذہب کے اصُولوں میں یہ چیز تھی کہ رُوح القدس ایمانداروں کی رہنمائی کرتا ہے اور اس نئے مذہب میں یہ چیز بڑی اہم تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایماندار خُداوند مسیح کی آمد ثانی کے منتظر تھے۔ اُن کا ایمان تھا کہ خُداوند مسیح کی آمد نزدیک ہے۔ میرے ماں باپ ان دو معتقدات کو مجھ پر واضح کیا کرتے تھے۔ یہی اس مذہب کی دو سچائیاں تھیں جن کے سانچے میں مجھے اپنی زندگی کو ڈھالنا تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد ڈاکٹر البرٹ شوائٹزر[2] نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام "تاریخی یسوع کی تلاش"[3] تھا۔ اُنہوں نے اس کتاب میں اس بات پر بڑا زور دیا کہ ابتدائی زمانے کی کلیسیا خُداوند کی جلد آمد کی منتظر

[1] EDWARD IRVING [2] ALBERT SCHWEITZER [3] THE QUEST OF THE HISTORICAL JESUS.

تھی۔ اُنھوں نے خُداوند یسُوع مسیح کے اپنے زمانے سے یہ بات واضح کردی کہ گلیل کے سادہ دیہاتی اُس کی آمد کے مُنتظر تھے۔ اس خیال نے میری توجّہ کو اپنی طرف مبذول کر دیا کیونکہ اپنے بچپن اور جوانی میں اس قسم کے خیالات میرے دِل میں رہا کرتے تھے۔ اپنے ذاتی تجربہ سے مُجھے اس عقیدے کی جھلک اپنے والدین کی زندگی میں نظر آتی تھی اور اُن کی زندگی کے ہر ایک شُعبہ میں اس قسم کے مسیحی خیالات کی عکاسی تھی۔ مَیں اس کتاب کے پڑھنے والوں کے لئے ان کا اجمالی خاکہ پیش کرنا چاہتا ہُوں۔ میرے والدین کے چہرے اُمّید کی خُوشی سے روشن تھے۔

اس کے ساتھ ہی بچپن کے زمانہ کے اُن تصورات کو بھی واضح کرنے کی کوشش کرُوں گا کہ خُداوند مسیح کی آمد پر عجیب وغریب باتیں ظاہر ہوں گی۔ اُس کی آمد بہُت سی نشانیوں کا پیش خیمہ ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ معجزات شروع تھے۔ میرے والد محترم کا ایمان تھا کہ اُن کو شفا کی قُوّت عطا ہُوئی ہے اور اُن کے ایمان کے مطابق اُنھوں نے بہُت سے مریضوں کو چھُو کر تندرست کیا تھا۔

میرے لڑکپن کے ابتدائی ایّام میں کلیسیا میں یہ بیداری کی مذہبی زندگی میرے چاروں طرف رواں دواں تھی لیکن میرے لئے مُشکل یہ تھی کہ میرا اپنا تصوّر بڑا ہی صاف اور اعصابی کمزوری کا حامل تھا۔ کئی لحاظ سے یہ قُدرت کا بہُت ہی بڑا انعام تھا لیکن ایک طرح سے یہ بہُت سی خرابیوں

کا باعث تھا۔ خُداوند مسیح کی آمد کے متعلق مَیں بڑی آسانی سے تصوّر کر سکتا تھا۔ مَیں اپنے والدین کی تعلیم کو اچھی طرح سے سمجھنے کے قابل تھا۔ وُہ ہر روز خُداوند مسیح کی آمد کے منتظر تھے۔ پہلے پہل تو اس عقیدے نے مُجھے کوئی ضرر نہ پہنچایا لیکن اس کے بعد مُجھے بڑی ہی کوفت ہُوئی۔

اِن ایّام میں تصوّرات کی باطنی دُنیا میرے لیٔے ایک حقیقت تھی۔ مَیں اسی دُنیا میں چلتا پھرتا تھا۔ اس صغرسنی کے زمانہ میں مَیں اپنی آنکھوں کے سامنے اُن چیزوں کا نقشہ کھینچ سکتا تھا جو میرے دِل میں ہوتی تھیں۔ کبھی کبھار میری بڑی ہمشیرہ نے مُجھے اس بات پر سرزنش بھی کی کیونکہ مَیں صاف صاف کہا کرتا تھا کہ وُہ چیزیں جو ظاہری طور پر نظر نہیں آتیں۔ مَیں اُنہیں دیکھ سکتا ہُوں۔ میری ہمشیرہ فطرتاً حقیقت پسند تھیں۔ جب وُہ مجھ پر یہ الزام لگایا کرتی تھیں کہ مَیں سچ نہیں کہتا تو مَیں یہی کہہ سکتا تھا کہ "مَیں اِن چیزوں کو دیکھتا ہُوں" اَور بات یہاں ختم ہو جاتی تھی۔

اپنی باطنی دُنیا کو اس طرح ظاہر طور پر دیکھنے اَور فریبِ نظر میں فرق ہے۔ اگرچہ ان دونوں میں جو حدِّ فاصل ہے اُس کی بعض اوقات واضح تعریف نہیں کی جا سکتی۔ مَیں جس عمل کی طرف اشارہ کر رہا ہُوں وُہ بڑا ہی واضح ہے اَور بچپن کے زمانہ میں بھی عام ہوتا ہے اَور بعض لوگوں کی زندگی میں دُوسروں کی نسبت دیر تک رہتا ہے۔ یہ ڈرامہ کی جبلّت کی طرح ہے اَور وُہ لوگ جو مشاہدۂ نفس کے عادی ہیں اُن کی یہ جبلّت بہُت ہی ترقی یافتہ ہوتی ہے۔

ہندوستان میں سادھو سُندر سنگھ میں بڑے وسیع پیمانہ پر مشاہدۂ نفس کی قُوّت تھی۔ اُن سے میرے گہرے مراسم تھے۔ میں اُن کے متعلق کسی اگلے باب میں ذکر کروں گا۔ جب میں اُن کے ساتھ رہا کرتا تھا تو مجھے اُن کی فطرت کو سمجھنے میں کوئی دقّت محسُوس نہیں ہوتی تھی کیونکہ اس بات میں ہم دونوں ملتے جُلتے تھے لیکن تصوّراتی معاملات میں وُہ بہُت زیادہ حسّاس واقع ہُوئے تھے۔ میں نے اُن کی زبان سے مافوق الفطرت مُلاقات کی کہانیاں سُنی ہیں جن سے میرا یہ یقین پختہ ہو گیا ہے کہ انہوں نے یقیناً بہُت سی باطنی چیزوں کو ظاہری طور پر اسی طرح سے دیکھا تھا جیسا میں نے اپنے لڑکپن میں بہُت سی چیزوں کو دیکھا ہُوا تھا۔ اُن میں یہ ملکہ ادھیڑ عُمر تک نمایاں صُورت میں برقرار رہا۔ لیکن بہر حال یہ ہے کہ جُوں جُوں میں جوان ہُوا یہ ملکہ تقریباً ختم ہو گیا اور اس کے بعد کبھی کبھار وقفوں کے بعد مجھے یہ تجربہ میسّر ہوتا تھا۔ ایسا معلُوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک داخلیت اور خارجیت کے درمیان کوئی واضح حدِ فاصل نہیں ہے شاید اس قسم کے تجربہ میں کمی بیشی کا تعلق عُمر کے ساتھ بھی ہے یعنی عُمر کے بعض حصّوں میں تصوّرات بڑے ہی واضح ہوتے ہیں اور بعض حصّوں میں کم واضح ہوتے ہیں اور دُوسری بات یہ ہے کہ دُنیا کے مُختلف حصّوں میں یہ تجربہ مُختلف ہے۔

ان تصوّرات نے میرے دل میں بہُت زیادہ مذہبی خوف پیدا کر دیا۔ وُہ بچّے جو بہُت زیادہ حسّاس ہوتے ہیں، اگر انہیں اندھیرے میں

رکھا جائے تو اُن کی اعصابی کمزوری خوف کی صُورت اختیار کر لیتی ہے۔
کئی بچے ایسے بھی ہیں جو اس صُورت میں بھُوت پریت سے ڈرنا شروع
کر دیں لیکن مندرجہ بالا صُورتوں میں سے کسی کا میری تکلیف کے ساتھ
کوئی تعلق نہیں تھا۔ میری اندرونی بے چینی بعض اوقات خوف کی صُورت
اختیار کر لیتی تھی اور یہ اُن عجیب و غریب عقائد کی وجہ سے تھا جن
کی تعلیم میرے والدین نے مجھے دی تھی کیونکہ اُنہوں نے مجھ پر اچھی
طرح سے واضح کر دیا تھا کہ خداوند مسیح کی آمد کسی لمحہ ہو سکتی ہے۔ وہ
آخری نرسنگا پھُونکنے پر آ جائے گا۔ وہ آنکھ جھپکتے ہی آ موجود ہو گا۔
مُردے قبروں سے باہر نکل آئیں گے اور ایماندار لوگ جن کے ماتھوں
پر زندہ خدا کی مُہر ہے وہ خداوند مسیح کا استقبال کرنے کے لئے فضا
میں اُوپر اُٹھا لئے جائیں گے اور اس کے بعد وہ ابد الآباد تک اُس
کے ساتھ رہیں گے۔

جب مَیں ننھا سا بچہ تھا تو اس قسم کے خیالات میرے لئے کچھ معنی نہ
رکھتے تھے لیکن اس کے بعد جب مجھ میں مذہبی خوف کا شعور ارتقا کی تمام
منازل طے کرنے لگا تو اس قسم کے خیالات میرے تصورات کی دُنیا پر
چھا گئے اور میں اپنے ہی طریقہ سے اپنے خیالات کو شکل و صُورت میں
ڈھالنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس قسم کے خیالات میرے لئے دردِ سر بن گئے۔
میرے اعصاب پر اُن کا اثر ہُوا اور مجھ میں خوف کا جذبہ پیدا ہو گیا۔
میرے غم کی انتہا یہ ہے کہ میں نے اُس وقت کسی سے اِن باتوں کا ذکر

نہ کیا، یہاں تک کہ مَیں نے اپنی والدہ کو بھی یہ باتیں نہ بتائیں۔ وُہ گرجا
جہاں ہم عبادت کیا کرتے تھے اس قسم کے تجربات کا مرکز تھا کیونکہ اسی جگہ
مجُھ پر ایک کیفیّت طاری ہو جاتی تھی۔ بعض اوقات اس قسم کے تصوّرات
ایک شبینوں کی دُنیا میں رہنے والے لڑکے کے لئے بڑے ہی خوفناک
تھے۔ لوگ طرح طرح کی زبانیں بولا کرتے تھے۔ مَیں اپنی والدہ محترمہ کے
پاس بیٹھا ہُوا تھا۔ اُنہیں اس معاملہ میں مجُھ سے پُوری پُوری ہمدردی تھی۔
وُہ مجھے تسلّی دیا کرتی تھیں اور پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا کرتی تھیں لیکن
اُن کے نزدیک یہ طرح طرح کی آوازیں خُدا کی آوازیں تھیں اور خُدا آدمیوں
کے وسیلے کلام کر رہا تھا۔ والدہ محترمہ کا ایمان اس قسم کا تھا کہ اُنہیں
خیال بھی نہیں آسکتا تھا کہ ایسی باتوں کی وجہ سے مجھے کوئی گزند پہنچ سکتا ہے۔
وُہ لوگ جو اس چیز سے آگاہ نہیں ہیں کہ دماغی بے چینی سے کس قسم
کا ضرر پہنچ سکتا ہے آسانی سے میری تکلیف کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔
خُداوند مسیح کی آمد کی تعلیم نے مجُھ پر ایسا اثر ڈال رکھا تھا کہ رات کے وقت
جب مَیں گرجا میں گائے جانے والے گیتوں کی مشق کرکے واپس گھر آتا
تو مَیں راستہ میں قبرستان کے پاس سے بڑی تیزی سے بھاگ کر گزرا کرتا
تھا۔ کئی قبروں کے کتبے مجھے روشنی میں نظر آیا کرتے تھے۔ وُہ سفید
سفید کتبے رُوحوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ خوف مجُھ پر غالب آجایا
کرتا اور دہشت طاری ہو جایا کرتی تھی کہ کہیں اس موقع پر خُداوند مسیح
نرسنگے کی بڑی آواز کے ساتھ آسمان سے اُتر نہ آئے اور مُردے قبروں

ہیں سے جن اُنہیں۔ مجھے یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ خداوند مسیح کہیں اُس وقت تک نہ آجائے جب میں تیار نہ ہوں۔

میں بچپن کی باتوں کو اس وجہ سے بیان کر رہا ہوں کیونکہ میرے دل میں یہ خیال ہے کہ اس قسم کے اعصابی خوف آج کل کی دنیا میں بھی موجود ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بچپن میں بہت سی مشکلات ہوتی ہیں جن کو دوسروں کو نہیں بتایا جا سکتا۔ بچے زبان سے کئی باتوں کو ادا نہیں کر سکتے خاص طور پر وہ تکالیف جن کے ساتھ کسی مقدس بات کا تعلق ہوتا ہے۔ انہیں بعض اوقات اپنے عزیز و اقارب کو بھی نہیں بتایا جا سکتا کہ وہ ایسی چیز جس سے وہ مصیبت میں مبتلا ہے کیا ہے۔

میرے والدین اس قسم کے انسان تھے کہ وہ میرے دل میں بہت زیادہ مذہبی خوف پیدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ہمارے گھر میں بچوں کو سزا نہیں دی جاتی تھی اور نہ ہی کسی بچے پر سختی کی جاتی تھی، یہاں تک کہ سخت کلامی سے بھی ہم ناآشنا تھے۔ میرے والدین بڑی خوشی سے خداوند کی "آمد" کے منتظر رہتے تھے اور قدرتی طور پر اُن کی یہ توقع تھی کہ میں اُن کی خوشی میں اُن کا برابر کا شریک ہوں۔ اگرچہ میرے والد صاحب گرجا میں "غیر زبان" میں نہیں بولتے تھے تاہم بعض اوقات وجد میں آکر وہ ایسی آواز میں بولتے تھے جسے "نبوت کرنا" کہا جا سکتا ہے۔ وہ اس قسم کی الہامی کیفیت سے بڑی خوشی محسوس کیا کرتے تھے، اس لئے

اُنہیں خیال بھی نہیں آسکتا تھا کہ ایسی باتیں میرے لیے خوف کا باعث ہو سکتی ہیں۔

انجیل مقدس میں خداوند مسیح نے جو بچوں کے ساتھ سلوک کیا ہے وہ واضح ہے جب مائیں بچوں کو اُس کے پاس لائیں تو اُس نے اُن کو گود میں لیا۔ اُس نے اُن پر اپنے ہاتھ رکھے اور اُنہیں برکت دی۔ وہ لوگ جو بچوں سے اچھا سلوک نہیں کرتے تھے یا اُن کے لئے ٹھوکر کا باعث بنتے تھے، اُس نے اُن کو جھڑکا۔ اسی طرح میرے والدین کی بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ مجھے خداوند مسیح کے پاس لائیں تاکہ وہ مجھے گود میں لے اور میں اُس سے برکت حاصل کروں۔ حقیقت یہ ہے کہ اُنہیں اُن کے ایمان اور محبت کا پھل مل گیا۔ میرے والدین کا یہ عقیدہ تھا کہ خداوند مسیح آئے گا اور وہ اسے لفظی طور پر مانتے تھے لیکن غریزی طور پر میں اس عقیدے کو نہیں مانتا تھا۔ جوں جوں میں عمر میں بڑھتا گیا اس قسم کی باتیں میری زندگی میں نشوونما نہ پاسکیں اور نہ یہ چیزیں میری زندگی کا جزو لاینفک بن سکیں۔ میں نے اس قسم کی باتوں پر ایمان رکھنے کی بے حد کوشش کی لیکن جبلّی طور پر میرے لئے یہ ساری باتیں خارجی ہی رہیں۔

پہلے پہل تو میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ جب اس قسم کے سرمستی کے الفاظ کہے جاتے ہیں تو گرجے میں میں کیوں خوف کے مارے اِن سے دُور رہنا چاہتا ہوں لیکن میری زندگی کے آنے والے ایّام میں آخرکار بڑی باطنی

کشمکش کے بعد مَیں یہ سمجھنے کے قابل ہُوا کہ یقین ہی یہ خوف کی جبلّت ہے۔ وُہ بالکل فطرت کے مطابق ہے اَور خُداوند مسیح کی آمد کا وُہ نظریہ جس کو میرے دادا جان اَور والد محترم مانتے تھے کلام مقدّس کی لفظی تفسیر ہے۔ اُس کی آمد کے متعلق اس قسم کا عقیدہ خُداوند مسیح کی تعلیم کی رُوح کے نمدن ہے۔ خُداوند مسیح کے اپنے زمانے میں بھی شاگردوں کو اُس کی بادشاہی کے آنے کے متعلق یہ خیال تھا کہ وُہ آیا ہی چاہتی ہے۔ خُداوند مسیح نے فرمایا کہ خُدا کی بادشاہی ظاہرا طَور پر نہ آئے گی۔

رسُولوں کے زمانے کی ہر ایک تفصیل کو از سرِ نَو معرضِ وجُود میں لانے کی ہر ایک کوشش سہو زمانی تھی۔ یہ کوشش بڑی باوقار تو تھی مگر بے سُود تھی کیونکہ ایک ایسے زمانے سے چمٹا رہنا جو صدیاں گزریں بیت چُکا ہے لاحاصل ہے۔ اس طرح زندگی میں ترقی نہیں ہوتی۔ مکاشفہ کی کتب میں مرقُوم ہے کہ رُوح اَور دُلہن کہتی ہیں آ۔ ہمارے دِل خُوشی سے معمُور ہو کر کہتے ہیں خُداوند یسُوع مسیح جلد آ۔ لیکن جب خُدا کی بادشاہی آئے گی تو ہم آسمان کی طرف اشارہ کر کے یہ نہیں کہیں گے کہ دیکھو! "یہاں ہے" یا "دیکھو وہاں ہے" کیونکہ آسمان کی بادشاہی ہمارے درمیان ہے۔ آسمان کی بادشاہی ہم میں ہے اَور ہمارے چاروں طرف ہے۔ دُنیا میں جہاں کہیں تاریکی چھائی ہُوئی ہے اَور ظلم کی فرماں روائی ہے اَور خُدا کی محبّت کا نُور وہاں چمکتا ہے تو وہاں اُس کا جلال ظاہر ہوتا ہے اور وہاں اُس کی بادشاہت آچُکی ہے۔ وہاں باپ کی مرضی اُسی طرح پُوری ہو چُکی ہے جیسے آسمان پر پُوری ہوتی ہے۔

ایسی باتوں کو سمجھنے اور اُنہیں صاف صاف مُلاحظہ کرنے میں کئی برس لگے اور مجھے باطنی تبدیلی حاصل کرنے کی غرض سے دُکھ اُٹھانے پڑے۔ لیکن وہ سچائی جو مُجھے بڑا دُکھ سہہ کر اور بڑی کشمکش کے بعد حاصل ہوتی تھی وہ میرے دِل و دماغ میں پُختہ ہوگئی۔ مَیں ہیٹن کے سردار کی طرح جس کا ذکر رسُولوں کے اعمال میں ہے کہہ سکتا ہُوں کہ "مَیں نے بڑی رقم دے کر یہ آزادی حاصل کی ہے"۔ مجھ میں رُوحانی زندگی نے قُدرتی طور پر نشوو نما نہ پائی۔ مَیں ہمیشہ اپنی ناکامی کے متعلق سوچا کرتا ہُوں کہ خُداوند مسیح مجھے اس کے ذریعہ کیا سبق دینا چاہتا تھا۔ مَیں آزاد پیدا نہیں ہُوا تھا۔

جب مُجھے آزادی حاصل ہونے لگی تو اس سے محرُوم رہنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ مَیں ہل پر ہاتھ رکھ چُکا تھا اس لئے اب مُجھے پیچھے مُڑ کر دیکھنا عبث تھا کیونکہ اس صُورت میں مَیں آسمان کی بادشاہت کے لئے موزوں نہیں تھا۔ اُس وقت سے لے کر آج تک میرا راستہ آگے کی طرف کھُل رہا ہے اور مَیں منزل کی طرف بڑھتا جا رہا ہُوں۔ میرے قدم آگے کی طرف بڑھ رہے ہیں اور مَیں پیچھے کی طرف مُڑ نہیں سکتا۔

رسُولی عقیدہ میں خُداوند مسیح کی آمدِ ثانی کے متعلق یُوں وضاحت کی گئی حتیٰ کہ یہ چیز عالم گیر ہوگئی۔ پس آہستہ آہستہ اپنے مذہبی تجربہ سے مُجھ پر یہ حقیقت واضح ہُوئی کہ رسُولی عقیدے کے ہر ایک حصّے کی از سرِ نو تفسیر اور وضاحت کی ضرُورت ہے۔ خُداوند مسیح کے بارے میں کسی زندہ سچائی کو پسِ پُشت نہیں ڈالا جا سکتا۔ خُداوند یسُوع مسیح اور رُوح القُدس کے وسیلہ

سے رسُولی عقیدے کی وضاحت کی جا سکتی ہے۔

ایک دفعہ مَیں نے زمانہ وسطیٰ کی ایک تصویر دیکھی۔ اس تصویر میں خُدا
کو دکھایا گیا تھا۔ خُدا بڑا ہی پُرجلال بزرگ تھا۔ اُس کی داڑھی سفید تھی اور
اُس کے سر پر سونے کا تاج تھا۔ اس تصویر کو دیکھ کر مجھ میں ایک زبردست
رَدِّعمل یہ ہُوا کہ مَیں نے محسُوس کیا کہ خُدا کے متعلق وُہ تصور جو میرے دل
میں ہے اور اس تصویر کے خُدا میں بڑا ہی فرق ہے۔ یہ سچ ہے کہ ابھی تک
ہمیں "آئینے میں دھندلا سا دکھائی دیتا ہے" اور ہمیں پُوری واقفیت نہیں
ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ اُس لازوال اور ازلی ذات کو ظاہر کرنے کے لئے
جو ہم نے علامات بنا رکھی ہیں وُہ ناقص ہیں۔ لیکن جب صبر سے ہم اُس دوڑ
میں دَوڑتے ہیں جو ہمارے سامنے ہے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ خداوند
مسیح خود اُس شاہراہ پر ہمارے آگے جا رہا ہے۔ وُہ نہ صرف رہنما
ہی ہے بلکہ وُہ ہمارے ایمان کو تکمیل دینے والا بھی ہے۔

پانچواں باب

میری تبدیلی

اس کہانی کو میں بڑے سادہ طریق سے بیان کروں گا کیونکہ جب میں اسکول سے فارغ ہو کر کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہُوا تو مجھ میں نئی زندگی آگئی۔ میں اسی گہری تبدیلی کا حال بیان کروں گا۔ میں خارجی حقائق بیان کروں گا کیونکہ یہ باتیں میرے لئے آج بھی اتنی ہی صاف ہیں جیسے اُس وقت تھیں۔

میں بادشاہ ایڈورڈ ششم کے اسکول واقعہ برمنگھم میں زیرِ تعلیم تھا کہ مجھ پر شباب کی بہار آئی۔ یہ زمانہ بڑی بڑی آزمائشوں اور مشکلات کا تھا۔ میں ناتجربہ کار تھا اور ایسی باتوں کے لئے ہرگز تیار نہیں تھا۔ میرے والدین اور اساتذہ کرام نے زندگی کے اس اہم حصے کے متعلق مجھے کبھی خبردار نہیں کیا تھا۔ اس لئے گھریلو زندگی میں مجھے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلے پہل میں اسکول کی وسیع وعریض عمارت میں بڑے ہی عذاب میں مبتلا رہتا تھا۔ اسکول میں طلبہ کی کثیر تعداد سے بھی بڑا ہی پریشان تھا۔ میرے ہم جماعت اور دوسرے اسکول کے طلبہ مجھے "مریل" اور "لاغر" کے

نام سے پکارا کرتے تھے۔ عمر میں بڑے لڑکے مجھے چھیڑا کرتے تھے اس
لیے تنگ آکر میں چھوٹے لڑکوں کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ کیونکہ چھوٹے
لڑکے عام طور پر اس قسم کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ
بیماری جس نے بچپن میں مجھے لنگڑا بنا دیا تھا اس کے بُرے اثرات ابھی
تک میرے جسم میں نظر آتے تھے اور میں جسمانی طور پر بڑا ہی کمزور تھا۔ اس
لیے اس پبلک اسکول کے بوجھ نے میری دماغی صلاحیتوں کو جلا بخشی
اور ذہنی طور پر میں بڑی ہی ترقی کرنے لگا۔ لیکن میرا جسم ابھی تک بڑا
ہی کمزور تھا۔

ابھی تک میں نے اپنی رُوحانی قوّت کے سرچشموں کے متعلق علم
حاصل نہیں کیا تھا۔ میری بچپن کے زمانے کی مذہبی جبلّت ایسی نازک
تھی کہ وہ ایک جگہ سے دُوسری جگہ منتقلی کے صدمے کو برداشت نہیں
کر سکتی تھی۔ میں بڑی جلدی جلدی اپنی تعلیم کے مدارج طے کرنے لگا۔
مجھے ایک جماعت سے دُوسری جماعت میں ترقی ملنے لگی۔ یوں میں ہر
ایک جماعت میں سب سے چھوٹا لڑکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے دُوسرے
بڑے لڑکوں کو دِق کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ میں اپنے بچاؤ کی خاطر
یُوں کیا کرتا تھا کہ میں آہستہ آہستہ سکول کے ماحول کا عادی ہو گیا۔ جب
لڑکے مجھے چھیڑتے تو میں نے کبھی مزاحمت نہ کی۔ میں نے اُن لڑکوں کی
تقلید کرنی شروع کر دی جن کی پرورش میری طرح نہیں ہُوئی تھی۔ اس طرح
میں بُری عادات کا شکار ہو گیا۔ میرے ضمیر نے مجھے آگاہ کر دیا کہ یہ عادات

بُری ہیں۔ میری زندگی میں ناپاکی آگئی اور کچھ عرصہ تک میرے دل میں اُس کا مسکن رہا۔ بچپن کی وُہ خوشیاں جن کا مَیں نے ذکر کیا ہے ایک ایک کرکے مجھ سے رُخصت ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی وُہ حساس مذہبی صلاحیتیں جو گھر کے اچھے ماحول کی وجہ سے مجھ میں پیدا ہوئی تھیں سخت ہو گئیں۔

ظاہری معاملات میں مذہب کی رسمی باتیں مجھ میں رہ گئیں۔ مَیں ہر اتوار عبادت کے لئے گرجے جایا کرتا تھا لیکن جُوں جُوں میری عُمر زیادہ ہوتی گئی میرے لئے عبادت میں وُہ حقیقت نہ رہی۔ بچپن سے ان عبادات کو بڑا ہی پُراسرار بنا رکھا تھا اور ان کے ساتھ ایک خاص قسم کی ہیبت کا تعلق بھی تھا لیکن یہ دونوں چیزیں اب مفقود ہو چکی تھیں لیکن مَیں ظاہری ٹیپ ٹاپ میں بڑا ہی نیک اور پرہیزگار تھا۔ مَیں اپنے والدین کی نگاہوں میں ہی اس بہُت بڑے کُنبے کا واحد فرد تھا جو وقت آنے پر کلیسیا کی پاسبانی کی مقدس خدمت کو سرانجام دینے کے لئے مختص ہو چکا تھا۔ اس کے متعلق کبھی زیادہ گفتگو تو نہ ہوتی تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ مجھ سے اس کی توقع کی جاتی ہے۔

میرے بڑے بھائی صاحب کاروبار میں لگے ہوئے تھے اور میرے چھوٹے بھائی بھی غالباً یہی کاروبار کرنے والے تھے۔ لیکن مجھے اپنے والد محترم کے نقشِ قدم پر چلنا اور بشارت کی خدمت کا وارث بننا تھا۔

آخر وُہ وقت نزدیک آن پہنچا کہ مَیں کنگ ایڈورڈ ہشتم اسکول سے فارغ التحصیل ہو کر کیمبرج جاؤں۔ مَیں نے پمبروک[1] کالج میں وظیفہ

---

[1] PEMBROKE COLLEGE.

حاصل کیا۔ میری اس کامیابی پر میرے والدین خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ اب اِن کے دِل میں تسلی تھی کہ مَیں یونیورسٹی میں داخلہ لے سکُوں گا۔ میری ترقی کی شاہراہ کھُل چکی تھی۔

ایک دِن میں اپنے والدِ محترم کے ساتھ سیر کو نکلا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُنہوں نے ایک گلی میں اس موضوع پر باتیں کرنا شروع کیں کہ اُن کے دِل میں میرے مُستقبل کے متعلق کتنی اُمیدیں ہیں۔ اُنہوں نے تجویز کیا کہ میں مُبشّر انجیل بن کر خُدا کی کلیسیا کی خدمت سرانجام دُوں۔ چُونکہ وُہ رسُولی کلیسیا کے پاسبان رہے تھے اس لئے وُہ چاہتے تھے کہ مَیں بھی اسی کلیسیا میں خادم الدین بن کر شکر کاٹے کلیسیا کی خدمت کرُوں۔ اس موقع پر اُن پر رقت طاری تھی اور وُہ کہہ رہے تھے کہ اُن کی یہ دِلی تمنّا ہے کہ مَیں پاسبانی کی خدمت سرانجام دینے کیلئے تیار ہو جاؤں۔ مجھ پر اُن کی باتوں کا بہُت اثر ہُوا لیکن مجھ میں اتنی جرأت نہ تھی کہ مَیں اُن سے یہ کہہ سکتا کہ مَیں اس قسم کی مُلاہٹ قبُول کرنے سے ہچکچاتا ہُوں۔ اگر مَیں اس قسم کے حالات میں اُن کی خواہشات کا احترام کر کے کہہ دیتا کہ مَیں اُن کے حکم کو بسر و چشم قبُول کرتا ہُوں تو مَیں ریاکار کہلاتا۔ مَیں اُن کی باتیں سُن کر خاموش رہا اور مَیں نے یہ اعتراف کر لیا کہ مَیں اس خدمت کیلئے تیار نہیں ہُوں۔

اس کے بعد کئی ہفتوں تک مَیں اپنے والدِ محترم کی اس گفتگو کی وجہ سے بڑا بے چین رہا اور چُونکہ مَیں نے کھُلم کھُلا اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا تھا اس لئے مجھے بڑی ہی کوفت ہونے لگی۔ میں نے جتنا زیادہ اپنی دیانتداری

کا اظہار کرنا چاہا اُتنا ہی میرا ضمیر بیدار ہونے لگا۔ اب میرے لئے ضروری ہوگیا کہ میں اپنے والد محترم سے صاف صاف کہہ دوں۔ میرے دل میں اپنے والد محترم کے لئے بڑی محبت تھی کیونکہ وُہ بڑے نیک اور سادہ مزاج تھے تاہم میں اُن سے بات کرنے سے ہچکچاتا رہا۔ میرے لبوں پر بات آتی تھی لیکن بات کچھ ایسی تھی کہ میں اُسے اُن سے کہہ نہیں سکتا تھا۔

ایک شام کا ذکر ہے کہ میں اپنے کمرے میں اکیلا تھا اور آرام کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ حسب معمول میں دُعا کے لئے اپنی چارپائی کے پاس دو زانو ہُوا۔ مجھے اس دن محسوس ہُوا کہ میں بڑا گنہگار اور ناپاک ہوں۔ میرا بند بند دُکھنے لگا۔ مجھ پر حقیقتِ حال کھلی اور تمام پردے ہٹ گئے۔

میں دُکھ اور درد سے نڈھال ہوگیا۔ میں اپنی اُس وقت کی حالت کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ میرا سارا بدن چُور چُور تھا۔ سارا دن کوئی ایسی بات نہیں ہُوئی تھی جس کی وجہ سے مجھ پر یہ کیفیت طاری ہوتی۔ میں صبح کے وقت گرجے میں گیا تھا لیکن پاسبان نے وعظ میں دل کی تبدیلی پر کوئی زور نہیں دیا تھا کہ مسیحی زندگی میں تبدیلی ایک ضروری مذہبی قدم ہے اور اس کے بغیر رُوحانی ترقی ناممکن ہے۔ یہ چیز بڑی ہی دُکھ دینے والی اور خوفناک تھی۔ مجھے اس کی کوئی توقع نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مجھ پر بجلی کوندی ہے اور بھونچال پیدا ہُوئی ہے۔ اس کے بعد میرے چاروں طرف گھُپ اندھیرا چھا گیا۔ میں نے اپنے ہاتھوں میں اپنا سر چھُپا لیا اور دو زانو ہو کر دُعا کرنے میں مشغول رہا۔ میں وہ وقت خدا کے

حضُور میں تھا۔ مَیں دُنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر تھا۔ مَیں اس اندھیرے میں روشنی کی تلاش کرتا رہا۔ میرا غم اتنا شدید تھا کہ مُجھے بالکل معلُوم نہ ہُوا کہ وقت کتنی سُرعت سے گزر رہا ہے۔

رات بھر مَیں اسی کشمکش میں مُبتلا رہا۔ آخر کار مُجھے بڑی راحت محسُوس ہُوئی۔ ایسا معلُوم ہوتا تھا کہ میرے تمام گُناہ مُعاف ہو گئے ہیں۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ میری طبیعت اب بہُت ہی ہلکی تھی۔ مجُھ میں ایک عجیب وغریب قسم کی تبدیلی آ گئی تھی۔ مَیں اس تبدیلی کو صحیح طور پر بیان کرنے سے قاصر ہُوں۔ میری حالت یہ ہے کہ مَیں نے دیدہ و دانستہ اس کی وضاحت نہیں کی لیکن مجُھے اس وقت معلُوم تھا کہ خُداوند مسیح میرا بچانے والا اَور میرا نجات دہندہ ہے اَور اُس کی محبّت نے ہمیشہ کے لئے میرے دِل کو مسخر کر لیا ہے۔ اب بُری عادات کا سلسلہ ٹوٹ چُکا تھا اَور اُن کا مُجھ پر کوئی اثر نہیں تھا۔

میرے دِل میں جو سب سے پہلا خیال آیا وُہ عملی قدم تھا۔ انجیلِ مُقدّس میں مجُھے اُن دس کوڑھیوں کی کہانی یاد آئی جنہوں نے اپنے کوڑھ سے شفا پائی تھی۔ مجُھے ایسا معلُوم ہونے لگا کہ مجُھے اس ایک کوڑھی کی طرح واپس لَوٹ کر خُدا کا جلال ظاہر کرنا چاہیئے۔

گرجا ہمارے گھر سے ایک میل سے زیادہ دُور تھا۔ وہاں روزانہ چھ بجے صبح عبادت ہُوا کرتی تھی۔ مَیں اس سے پیشتر اتنی سویرے اُٹھ کر

کبھی گرجے نہیں گیا تھا۔ میں خاص خاص موقعوں پر ہی گرجے جایا کرتا تھا اور مجھے کبھی خیال نہیں آیا تھا کہ مجھے صبح سویرے بھی گرجا جانا چاہیئے۔

بڑے دن کے تہوار پر صبح سویرے ہم خاندان کی صورت میں گرجے جایا کرتے تھے لیکن میری زندگی میں یہ پہلا دن تھا کہ میں صبح سویرے عبادت کے لئے گرجا میں گیا۔ میں بہت زیادہ سونے کا عادی ہوں۔ عام موقعوں پر میرے لئے بیدار ہو کر اتنی سویرے گرجے میں عبادت کے لئے جانا ناممکن تھا لیکن اب آدھی رات گزر چکی تھی۔ مجھ پر ایک کیفیت طاری تھی اس لئے اب میرے سامنے کوئی مشکل نہ تھی۔ میں بڑے اطمینان سے سو گیا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ میں ٹھیک وقت پر بیدار ہو جاؤں گا۔

صبح کے وقت جب میری آنکھ کھلی تو رات کے واقعہ کی دھندلی سی یاد میرے ذہن میں محفوظ تھی لیکن جب میں نے اپنی گھڑی دیکھی تو ساڑھے پانچ بجنے کو تھے۔ یک لخت میری آنکھوں کے سامنے میری زندگی میں تبدیلی کے تمام واقعات پھرنے لگے۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے بدلے۔ میرے دل میں خوشی تھی اور میں دعا شروع ہونے سے پہلے گرجے میں پہنچ گیا۔ عبادت کے دوران میرے خیالات ادھر اُدھر پھر رہے تھے۔ مجھے رات کا واقعہ یاد آیا اور میں نے شکرگزاری سے اپنا سر جھکا لیا کہ خداوند مسیح نے رات کو مجھے خوشی اور اطمینان عطا فرمایا ہے۔ اُس نے اپنی محبت سے میرے گناہوں کو معاف کر دیا ہے۔

اور ہمیشہ کے لئے مجھے اپنا بنا لیا ہے۔

دُعائیں گا گا کر مانگی گئیں اور خُدا کے کلام میں سے ایک ورد پڑھا گیا۔ مَیں نے بمشکل ان دُعاؤں کو سُنا کیونکہ اس دوران میں میرے دل میں ایک نیا گیت تھا اور میرے خیالات زمین سے اوپر دُور آسمان کی طرف پرواز کر رہے تھے۔ عبادت کے دوران میری یہی حالت رہی لیکن جب دُعائیں ختم ہُوئیں تو اس کے آخری الفاظ میرے کانوں میں یہ پڑے :-

" خُداوند یسُوع مسیح کا فضل اور خُدا کی محبّت اور رُوح القُدس کی شراکت آپ سب کے ساتھ ہو۔ آمین"

اس کے بعد جو کچھ ہُوا مَیں اُس کی کس طرح سے وضاحت کر سکتا ہُوں؟ آسمان سے مجھ پر خُدا کی رحمتیں نازل ہُوئیں۔ مجھ پر اُس کا فضل ہُوا۔ خُدا نے خُود اپنی محبّت سے مجھے اُس موقع پر برکت دی۔ مُعافی کی وُہ خُوشی اور اطمینان جو مجھے رات کو حاصل ہُوا تھا اب مجھے محسُوس ہونے لگا۔ اب تو وُہ ہزار گُنا زیادہ تھا۔ خُدا کی محبّت کے سیلاب نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ایسا معلُوم ہوتا تھا کہ اُس کی محبّت کے سمندر کی لہریں مجھ تک پہنچ رہی ہیں۔ مَیں دو زانو تھا اور اُس کے حضُور سر جُھکائے ہُوئے تھا۔ مَیں گرجا میں تھوڑی دیر تک انتظار کرنے لگا۔ مَیں بڑی شُکر گزاری سے اُس کی حمد و ستائش کر رہا تھا۔ مَیں دُنیا و مافیہا سے ایسا بے نیاز تھا کہ آخر کار گرجے کا دربان آیا اور اُس نے میرا شانہ ہلایا۔ اُس نے سمجھا کہ شاید مَیں سو گیا ہُوں۔ وُہ گرجے کے

دروازے بند کر کے گھر جانا چاہتا تھا۔ مجھے سب کچھ اچھی طرح یاد ہے کہ کس طرح جب خُدا نے میری دُنیا کو یکسر بدل دیا تو مَیں نے پہلے ہی دِن گرجا میں کیا رویّہ اختیار کیا۔

جب مَیں گرجا سے واپس گھر کی طرف آ رہا تھا تو سُورج کی سُنہری کرنوں نے سڑکوں اَور گلیوں کو بقعۂ نُور بنا دیا تھا۔ میرے دِل میں بھی نئی زندگی کی ایک سہانی صبح طلُوع ہو چکی تھی۔ میری ماں اَور باپ نے مجھ میں اس خاموش تبدیلی کو دیکھ لیا تھا لیکن جو کچھ واقعہ ہُوا تھا مَیں نے اس کے متعلق کسی سے بات تک نہ کی اَور بڑی مُدت تک مَیں اس بات کو دُوسروں کو بتانے کے لئے تیار نہ ہُوا۔ یہ بات میرے لئے اتنی مقدّس اَور پاک تھی کہ مَیں اپنے عزیز و اقارب کو بھی نہیں بتانا چاہتا تھا اَور میرا خیال تھا کہ اس کا تعلّق باطن کے ساتھ ہے اَور باطن کی چیزوں کو دُوسروں کو نہیں بتانا چاہیئے۔ انجیل مُقدّس میں ہم پڑھتے ہیں کہ کس طرح مُقدّسہ مریمؑ نے یہ سب باتیں اپنے دِل میں رکھیں"۔ اس زمانہ میں میرے دِل میں بھی اسی قسم کے خیالات تھے۔

اس واقعہ کو گذرے ہُوئے چالیس۴۰ سال ہو گئے ہیں لیکن وُہ تبدیلی جو مُجھ میں ظاہر ہوئی اُس سے کسی طرح سے چھٹکارا نہیں حاصل کر سکتا۔ مَیں بڑے سوچ بچار اَور ہچکچاہٹ کے بعد اس واقعہ کو اس کتاب میں درج کرنے پر رضامند ہُوا ہُوں۔ مجھے اُمید ہے کہ اس سے بہت سے لوگوں کو فائدہ حاصل ہو گا۔ مَیں اپنے اس تجربہ

کو کسی طرح سے فراموش نہیں کر سکتا۔ اُس وقت سے لے کر آج تک خُداوند مسیح میرے لئے زندہ مسیح ہے۔ مَیں اُس کے متعلق جب انجیل مُقدّس میں پڑھتا ہُوں تو مَیں اُسے محض یہی تصور نہیں کرتا کہ وُہ انجیل کا مسیح ہے اَور مَیں ––– اپنے تصوّرات ہی گلیل کے ساحل تک اُس کے نقشِ قدم پہ چلتا ہُوں، بلکہ مَیں نے اُس کی روزمرہ کی شرکت کا راز معلوم کر لیا ہے۔ وُہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ وُہ ایک حقیقت ہے۔ بعض اوقات وُہ پہلے کی نسبت زیادہ قریب نظر آتا ہے لیکن وُہ لامُبدّل مسیح ہے جو کل اَور آج اَور ہمیشہ یکساں ہے۔

چنانچہ میرے لئے وُہ زندہ مسیح ہے۔ میرے لئے یہ ناممکن ہے کہ مَیں اُس کے متعلق کسی اَور طرح سے سوچ سکوُں یا بات کر سکوُں کیونکہ ایک مسیحی کی حیثیت سے میری واضح زندگی اُسی دن سے شروع ہُوئی اَور میرے تمام گھرے خیالات اُسی واقعہ کے تاثر کے رنگ میں رنگے ہُوئے ہیں۔ وُہ شخص جو میری زندگی میں مسیح کے مفہوم کو سمجھنا چاہتا ہے اَور یہ بھی جاننا چاہتا ہے کہ مجھ پر اُس کے کیا احسانات ہیں اُسے اس بات کو حقیقت تسلیم کرنا چاہیئے۔

اس واقعہ کے بعد کچھ مزید کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ خُداوند مسیح کے متعلق مجھے زندگی میں ہر روز تجربہ حاصل ہوتا رہا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے مَیں اس کی وضاحت کر دُوں، اگرچہ بعض لوگ یہ خیال کریں گے کہ مَیں پُرانی باتوں کو دُہرا رہا ہُوں۔ یہ

مسیح وُہ نہیں تھا جس کا تصوّر بچپن کے زمانے میں میرے ذہن میں تھا کیونکہ میرے ماں باپ نے مجھے کچھ اس قسم کی مذہبی تعلیم دی تھی کہ مَیں خیال کیا کرتا تھا کہ وُہ آسمان میں بادلوں پہ ظاہر ہوگا اَور مَیں اُس کی آمد پر اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ سکُوں گا۔ یہ تو محض بچّوں کا سا تصوّر تھا۔ لیکن جُوں جُوں مَیں جوان ہُوا میرا اسی قسم کا تصوّر رہا۔ یہ محض سپنوں کی تصویر تھی۔

لیکن زندگی کی وُہ ثبوت جواب مجھے حاصل ہُوئی بالکل نئی قسم کی تھی۔ کوئی خواب میری رُوح میں اس قسم کی تبدیلی کبھی نہیں پیدا کرسکتا تھا۔ میری اخلاقی زندگی بالکل تبدیل ہوگئی اَور مَیں نئے سرے سے پیدا ہُوا۔ یہ سب کچھ خُدا کی قُدرت سے ہُوا۔ میری نظروں میں یہ عجیب کام تھا۔ خُدا مسیح کے وسیلے رات کے وقت مجھ پہ ظاہر ہُوا تھا۔ پاک زبُور کے الفاظ میں وُہ میرے راستہ اَور میری خوابگاہ کی چھان بین کرتا ہے اَور میری سب روشوں سے واقف ہے:۔ "مَیں اُس کی حضُوری سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ اگر مَیں بلندیوں میں پرواز کرتا تو وُہ وہاں تھا اَور اگر مَیں زمین کے پاتال میں اُتر جاتا تو وُہ وہاں تھا۔" اس زبُور میں خُدا کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اب اُس کا مجھ پر بھی اطلاق ہو رہا تھا۔ خُدا اب ہمیشہ میرے ساتھ تھا۔

ایک چیز اَور بھی تھی جو اس زبُور میں موجُود نہیں ہے۔ میرے دِل میں مُعافی آگئی تھی۔ اُس نے مجھے وُہ مُعافی عطا کی جو سمندر

کی طرح گہری اور نیلگوں آسمان کی طرح فراخ تھی۔ وہ مُعافی اپنی الہٰی محبّت کے اعتبار سے اتنی گہری تھی کہ اُسے ناپا نہیں جا سکتا۔ اس چیز نے مجھے بالکل چکناچُور کر دیا۔ اب میں ایک نیا انسان تھا۔ خُدا نے مجھ پر احسانِ عظیم فرمایا تھا۔ مجھے اُس رات اُس کی محبّت کی اتھاہ گہرائیوں کی سمجھ آئی۔ اُس نے اپنے آپ کو میری خاطر دے دیا۔ میں اس وجہ سے اُس کے بہُت قریب آ گیا۔ میرے دِل میں خوف نہیں تھا بلکہ محبّت نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ میں نے اُس کامل محبّت کا مزا چکھا جو تمام خوف کو دُور کر دیتی ہے۔ خُدا کی مقدّس حضُوری نے اَور مُعافی بخشنے والی محبّت کی رُوح نے جو میرے چاروں طرف تھی مجھ میں ایسی تبدیلی پیدا کر دی۔

جو کُچھ ہُوا یہ میرے دماغی تصوّرات کا کرشمہ نہ تھا۔ نہ ہی یہ خواب تھا جو بیدار ہونے پر دُھند کی طرح غائب ہو جاتا ہے بلکہ مجھ میں ایک تبدیلی آ گئی تھی۔ میں رُوحانی طور پر نئے سِرے سے پیدا ہو چُکا تھا۔ مجھ میں گناہ پر فتح پانے کی قوّت آ گئی تھی اور میں موت پر فتح حاصل کر سکتا تھا۔ میں جو کُچھ بیان کرنے کی کشمکش میں ہُوں وہ الفاظ میں ظاہر نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر انسانوں کی طرح قوّتِ گویائی سے ایک حقیقت کو واضح کرنا ممکن ہو تو میں ایک بات صاف صاف کہنا چاہتا ہُوں۔ مجھے خُدا کی محبّت کا یہ نیا شعُور کسی اَور طرح سے نہیں بلکہ خُداوند مسیح کے وسیلے ہُوا۔ میں نے خُدا اور خُداوند مسیح دونوں کو کبھی مساوی سمجھا۔ میں نہ ہی اُس کی کوئی اس وقت تشریح کر سکتا تھا اور نہ ہی

آج اُس کی کوئی منطقیانہ توضیح کر سکتا ہوں لیکن میرے خیالات میں خُداوند مسیح اور صرف خُداوند مسیح ہی تھا اور جب کبھی مَیں خُدا کے متعلق سوچتا تھا تو خُداوند مسیح کا چہرہ ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتا تھا۔

یہ سچ ہے کہ مجھے ظاہری طور پر تو کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی تھی مَیں نے خُداوند مسیح کی رویا نہیں دیکھی جس طرح ساؤل نے دمشق کی راہ پر دیکھی تھی تاہم وُہ محبت اور مُعافی جس کا مَیں نے تجربہ کیا تھا صرف خُداوند مسیح کے ذریعہ سے ہی مجھ پر ظاہر ہُوئی۔ اُس کی محبت اور مُعافی مجھے اسی طرح سے حاصل ہُوئیں۔ پولُس رسُول کے الفاظ کے معنی اب میری سمجھ میں آئے "کہ خُدا نے مسیح میں ہو کر اپنے ساتھ دُنیا کا میل ملاپ کر لیا اور اُن کی تقصیروں کو اُن کے ذمّہ نہ لگایا" کیونکہ اُس برکت کے وقت خُدا باپ مسیح میں میرے گُناہوں کو مُعاف کر رہا تھا۔ وُہ مجھے شفا بخش رہا تھا اور مجھے نیا مخلُوق بنا رہا تھا۔ خُداوند مسیح کے بغیر یہ سب کُچھ غیر شخصی اور مجرّد ہوتا۔ خُداوند مسیح میں خُدا خُود انسان بن گیا۔ وُہ متشخص اور حقیقت بن گیا۔ ہندوستان میں اس حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے ایک لفظ موجود ہے۔ مَیں اس کے ذریعہ مغرب کے باشندوں کو اپنا مطلب سمجھانے کی کوشش کرُوں گا۔ پُرانے زمانے کی سنسکرت میں خُدا کی لامحدودیت کو ظاہر کرنے کے لئے کہا جاتا ہے کہ اُس کی کوئی "صُورت و شکل" نہیں ہے اس لئے اُس

کو سمجھنا محال ہے لیکن وہ جو بغیر شکل و صورت کے ہے وہ شکل اختیار کرنا چاہتا ہے۔ وہ جو لامحدود ہے محدود بن رہا ہے۔ اب اس نقطہ پر بات یہ ہے کہ براہِ راست مذہبی تجربہ میں جس کا میں نے ذکر کیا ہے انسانی رُوح کے لئے خُداوند مسیح کی شخصیت کا اصلی مطلب ظاہر ہو جاتا ہے۔ اُس کے وسیلہ سے تمام مجہول باتیں خُدا میں حقیقت بن گئیں۔ وُہ سب کچھ جو غیر شخص تھا شخص بن گیا گویا لامحدود محدود ہو گیا۔ اس طرح سے خُداوند مسیح مجھے خُدا کی صُورت، خُدا کا کلام اور حقیقت نظر آنے لگا۔ اب مَیں اُس کو سمجھ سکتا تھا۔ وُہ خُدا کا نشان تھا۔ وُہ غیر مرئی خُدا کو مرئی بنا رہا تھا۔ جس طرح ہم اندھیرے میں خوفزدہ بچّوں کی طرح "ابّا یعنی اَے باپ" پکارتے ہیں، اسی طرح خُدا اندھیرے میں سے ہمیں جواب دیتا ہے اور اپنے ہاتھ سے ہمیں چھُوتا ہے۔ وُہ جواب اور وُہ لمس مسیح ہے۔ خُدا کو میری محبّت کی تمنّا ہے اور مجھے اُس کی محبّت کی تمنّا ہے۔ یہ اُس کی فطرت ہے کہ وُہ انسانی طریقوں سے اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ وُہ اس طرح سے خُداوند مسیح میں کرتا ہے۔ خُدا نے اپنی محبّت کا اظہار خارجی صُورت میں کر دیا ہے اور وُہ خارجی صُورت خُداوند مسیح ہے۔ پس خُداوند مسیح ہمارے لئے خُدا کا کامل کلام ہے۔ اُس میں خُدا کی آواز صاف صاف سنائی دیتی ہے۔ اُس کے وسیلے خُدا کا ہاتھ تو پردے کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے اور ہم اس میں خُدا جو لامحدود ہے اور جس کی کوئی شکل و صُورت نہیں، شکل و صُورت اختیار

کر لیتا ہے۔

بنی نوع انسان کو اور بھی نشان دیئے گئے ہیں۔ ہر ایک نبی اور رسول خدا کی آواز تھا۔ اُنہوں نے خدا کے متعلق کلام کیا۔ اُنہوں نے خدا کے پیغمبر ہونے کی حیثیت سے اُس کی منادی کی۔ عبرانیوں کے نام کا خط عظیم نشان الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔ "اگلے زمانہ میں خدا نے باپ دادا سے حصہ بہ حصہ اور طرح بہ طرح نبیوں کی معرفت کلام کیا لیکن یہ آیت یہیں ختم نہیں ہو جاتی ہے۔ اس خط کا مصنف کہتا ہے کہ اُسی خدا نے "آخری زمانہ میں ہم سے بیٹے کی معرفت کلام کیا۔"

ہم اگلے زمانے کے نبیوں اور داناؤں کی معرفت اُس کے نام کے معانی اور اُس کی سچائی کی ایک کرن اور اُس کے حسن و جلال کا نظارہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں لیکن خداوند مسیح میں ہم خدا کی صاف صاف تصویر، صحیح معانی اور اُس کی ذات کا نقش دیکھتے ہیں۔ پولُس رسول کہتا ہے کہ "وہ اَن دیکھے خدا کی صورت ہے۔" یہی وہ نشان ہے جس کے ذریعہ انسان پر خدا ظاہر ہو سکتا ہے۔ اسی کلام کے ذریعہ خدا کی وضاحت کی جا سکتی ہے۔

تلسی داس نے رامائن لکھی ہے۔ وہ ایک دانا تھا۔ خدا اُس سے ہم کلام ہوا۔ رامائن میں ایک فقرہ یوں ہے۔ اُس فقرے میں یہ چیز موجود ہے کہ اُس کی "شکل و صورت" کی تمنا کتنی عالم گیر ہے جو اُس کی موجودگی کو انسان پر ظاہر کرتی ہے۔ تلسی داس اپنی اس رزمیہ نظم میں بیان کرتا ہے

کہ ایک فلسفی جو صحیفوں میں ماہر تھا اُس نے خُدا کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنا شروع کیا جس کی کوئی شکل و صورت نہیں ، وُہ لا محدود ہے غیر مشخص ہو، غیر مرئی ہے اور اس کو سمجھنا انسانی عقل و فکر سے باہر ہے لیکن تلسی داس نے اس فلسفی سے کہا کہ براہِ نوازش توقف فرمائیے اور چِلا کر کہا "جناب عالی! ہمیں مجسم حقیقت دکھائیے"۔

مغرب کے بڑے بڑے شعرا نے بھی انسانی دِل کی اُس تمنا کا اظہار کیا ہے جو دُنیا کے کُل مذہبی لٹریچر میں موجود ہے۔ انگلستان کے شہرۂ آفاق شاعر رابرٹ براؤننگ نے اپنی نظم "ساؤل" میں کتنے شاندار انداز میں ایک نظارہ پیش کیا ہے۔ نظم کا یہ بند بہت بُلند ہے۔ داؤد مغنی بادشاہ ساؤل کے سامنے بربط پر فضاؤں میں نغمے بکھیر رہا ہے۔ بادشاہ غم و اندوہ کا مجسمہ ہے اور خیالات کی دُنیا میں مستغرق ہے۔ داؤد کے تخیل کی پرواز بہت بلند ہے اور وُہ یوں کہتا ہے ۔

اَے بادشاہ! جتنی تیری محبت اعلیٰ اور قوت والی ظاہر ہوئی ہے تو گرُدوں وقار ثابت ہو۔

اَے بادشاہ! تو محبوب ہے اور تیری قوت اسی سے ظاہر ہوتی ہے۔ وُہ جس نے زیادہ کام کیا ہے وُہ زیادہ ہی برداشت کرے گا۔ سب سے زیادہ طاقتور سب سے زیادہ کمزوروں کا مقابلہ کرے گا۔

مَیں طاقت میں کمزوری کے لیے پکارتا ہُوں۔ مَیں اپنا ہی بدن خُدا کی شخصیت میں تلاش کرتا ہُوں۔ مَیں ڈھونڈتا ہُوں اور پاتا ہُوں۔

اُسے مسافر! وُہ چہرہ مجھ سا ہی ہوگا جو مجھے قبُول کرتا ہے تُو میری ہی طرح محبت کرے گا اور تجھ سے ہمیشہ تک محبت کی جائے گی۔ اسی طرح کا ہاتھ ہی تیرے لئے نئی زندگی کے دروازے کھول دے گا۔

دیکھ! مسیح دروازے پر کھڑا ہے۔

اپنی تبدیلی کے بعد اکثر اوقات میرے دِل کی گہرائیوں سے اِس قسم کی باتیں نکلتی تھیں۔ یہ باتیں مجھے بالکل نئی معلوم ہوتی تھیں کیونکہ وُہ سارا دِن اُسی نغمے کی گنبد کی صدائیں بنی رہیں جو سارا دِن میرے دِل میں رہا۔ مَیں وُہ چیز پھر دُہراتا ہُوں جسے دُہرانے کی مَیں کوشش کر رہا ہُوں۔ خُداوند یسُوع مسیح کا راز یہ ہے کہ جُونہی کوئی دِل اُس کی حضُوری کو محسُوس کرتا ہے وُہ اُس میں داخل ہوتا ہے۔ خُدا کی محبت کو فانی آنکھیں بھی دیکھ سکتی ہیں اور وُہ انسانی شکل میں بھی نظر آ سکتا ہے۔ اب ہمارے سامنے ایک ایسا خُدا نہیں جسے ہم نہیں جانتے اور اُس کی پرستش کرتے ہیں۔ اُس کی صرف نفی سے ہی وضاحت کی جا سکتی ہے بلکہ ہمارا خُدا ایسا خُدا ہے جس کی فطرت اور جس کا نام محبت ہے۔ وُہ انسانوں کی طرح ہے۔ وُہ ہمارے اِس قدر قریب ہے کہ وُہ ہمارے دُکھوں میں شریک ہے۔ ہمارے گناہوں کی وجہ سے اُس کا دِل کُڑھتا ہے۔ محبت کی خاطر وُہ اپنے آسمانی تخت کو چھوڑ کر ہمارے درمیان آ کر رہتا ہے۔ وُہ اِس طرح سے ہمارے درمیان رہتا ہے کہ ہم اُس کا جلال دیکھ سکتے ہیں۔ یہ مجسّم محبت کا جلال ہے۔ وُہ صرف دِل کی خاطر سب کُچھ برداشت کرتا

ہے ۔ وہ ناقابلِ بیان شرمندگی سہتا ہے ۔ وہ ٹھٹھوں میں اُڑایا جاتا ہے۔ اُسے کوڑے پڑتے ہیں اور وہ محبّت کی خاطر صلیب کی اذیت بھی برداشت کرتا ہے۔

ہم نہ صرف اُس کی باتوں پر منطقی طور پر ایمان لاتے ہیں بلکہ ہم نے اُس کے کاموں کو بھی دیکھ لیا ہے کہ خدا محبّت ہے ۔ خدا کوئی نظریاتی مفروضہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک ٹھوس حقیقت ہے ۔ خدا کی محبّت کا یہ کام ہمیں حمد وثنا کرنے پر مجبور کرتا ہے اور ہمارے دِل محبّت کا ایک نیا گیت گانا شروع کرتے ہیں ۔

اگر ہم سے ہمارے ایمان اور عبادت کرنے کی وجوہات پُوچھی جائیں تو ہمارے پاس لاخطا ثبوت موجود ہیں ۔ ہر زمانے میں انسانی دِل کی یہ آواز ہے۔ " اَے خدا ! تُو نے اپنے آپ کو مُجھے دکھا، کسی اَور کو نہیں بلکہ اپنے آپ کو مجھ پر ظاہر کر"۔ اگر انسانی زندگی عقلی اور استدلالی ہے اور اگر خدا سچّا ہے تو وہ پُکار یُونہی نہیں ہو سکتی ۔ ہماری اپنی انسانی زندگی کا یہ تجربہ ہے کہ ہر ایک نسلِ انسانی میں انسان کی رُوح الٰہی رُوح کے ساتھ پیوست ہونا چاہتی ہے اور "ابا یعنی اَے باپ" کی پکار ہماری رُوحوں کے ساتھ یہ گواہی دیتی ہے کہ ہم خدا کے فرزند ہیں ۔ ہر زمانے میں اور ہر مذہب میں اس قسم کی چیز محسوس کی گئی ہے ۔ یہی چیز رُوحِ انسانی کو خدا تک لے جاتی ہے ۔ خداوند مسیح میں یہ پُکار مکمل ہوئی ۔

اس وجہ سے وہ اولیا اور شہدا جو رسُولوں کے زمانے کے بعد زندہ رہے

اور بہر خداوند میں سو گئے مثلاً پولس اور یوحنا اور آگسٹین، مونیکا، برنارڈ اور اسسی کا فرانسس، سینا کی کیتھرائن اور اس کے بعد کے زمانے کے سینکڑوں لوگ یک زبان ہو کر یہ گواہی دیتے رہے "اب میں زندہ نہ رہا بلکہ مسیح مجھ میں زندہ ہے اور میں جو اب جسم میں زندگی گذارتا ہوں تو خدا کے بیٹے پر ایمان لانے سے گذارتا ہوں جس نے مجھ سے محبت رکھی اور اپنے آپ کو میرے لئے موت کے حوالہ کر دیا۔ یہ تجربہ نہ صرف اولیائے کرام کو ہوا، بلکہ ہر زمانہ کے سادہ، معمولی اور منکسر المزاج عورتوں اور مردوں نے بھی اس قسم کا تجربہ حاصل کیا ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے خداوند مسیح کی محبت کا مزا چکھا ہے خواہ وہ انگلستان کے ہوں یا امریکہ کے بھارت کے ہوں یا افریقہ کے، چین کے ہوں یا جاپان کے، ہمیشہ اسی قسم کا اعلان کرتے ہیں۔ خداوند مسیح خود اُن کی زندگی میں کام کرتا ہے اور اُن کی زندگیوں کو بدلتا ہے۔ وہی اُن کو قوت عطا فرماتا ہے اور وہی اپنی محبت سے اُنہیں اُبھارتا ہے کہ وہ اُٹھیں اور دنیا کے اُن تاریک علاقوں میں جا کر انجیل مقدس کی منادی کریں جہاں ابھی انجیل کا نور نہیں پہنچا ہے۔ اُنہیں بشارت کی خدمت بجا لانے کو کہا جاتا ہے۔ خداوند مسیح کی اسی محبت نے میرے دل کو بالکل بدل دیا ہے۔ اسی نے میری سیرت کو ایک سانچے میں ڈھال دیا ہے اور اسی اہم بات کے لئے میں خداوند مسیح کا احسان مند ہوں۔

چوتھی انجیل میں انجیل نویس نے مہمان خانے میں آخری فسح کا نقطہ...

پیش کیا ہے۔ فلپس کہتا ہے "اے خداوند! باپ کو ہمیں دکھا۔ یہی
ہمیں کافی ہے۔" خداوند نے جواب دیا "میں اتنی مدت سے تمہارے ساتھ
ہوں۔ کیا تو مجھے نہیں جانتا؟ جس نے مجھے دیکھا اُس نے باپ کو دیکھا۔
تو کیونکر کہتا ہے کہ باپ کو ہمیں دکھا۔" خداوند مسیح نے جو بات فلپس سے
کہی تھی وہی میری زندگی میں بھی ہوئی کیونکہ مجھ پر یہ واضح ہو گیا کہ
خداوند مسیح کو دیکھنا، باپ کو دیکھنا اور اُس کی محبت کو سمجھنا ہے۔

میرے لئے ضروری نہ تھا کہ میں اسے ایک عقیدے کی صورت میں
ترتیب دیتی۔ یہ ایک روحانی شعور تھا جو مجھے حاصل ہوا۔ یہ کوئی علمی
تعریف نہیں ہے اور جب کبھی میں نے روحانی احساس سے ہٹ کر اسے
مادی "حقیقت" کی اصطلاحات میں اُس کی تعریف کرنے کی کوشش کی
ہے تو قوت کی بجائے مجھے کمزوری حاصل ہوئی ہے۔ سچائی کی جگہ مجھے
بے یقینی ملی ہے۔ میں اپنے تجربہ کو انسانی زبان میں تشریح کرنے کی جرأت
کو اچھی طرح سمجھتی ہوں لیکن الفاظ تو علامت ہیں جس سے کسی سچائی
کو ظاہر کیا جا سکتا ہے اور یہ اپنی ذات میں سچائی نہیں ہے۔

اگلے ہی دن میں نے اس نئی خوشی کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔
اس گرجا کے قریب جہاں میں ہر اتوار عبادت کے لئے جایا کرتی تھی
غریب لوگوں کے گھر تھے۔ اس جگہ کے رہنے والے شرابی تھے اور
اُن میں طرح طرح کی دیگر سماجی برائیاں موجود تھیں۔ غربت اور افلاس
نے اُن میں بد عادتیں پیدا کر دی تھیں۔ اس سے پیشتر مجھے بھی غریب

لوگوں کے پاس اُن کے گھروں میں جانے کا خیال نہیں آیا تھا لیکن جب
خُداوند مسیح کی خاطر وُہ مجھے بے حد عزیز تھے۔ میں اب اپنی باطنی تبدیلی
کے متعلق زیادہ باتیں کر سکتا تھا اور میری جبلت مجھے لب کرنے سے
منع کرتی تھی۔ لیکن اپنے دوست بنانا میرے لئے کوئی مشکل نہ تھا۔ اب
میں گھر گھر جا کر لوگوں سے ملتا، اُن سے گفتگو کرتا اور اُن کی مشکلات
میں اُن کی امداد کیا کرتا تھا۔ اسی طرح کئی ہفتے اور مہینے گذر گئے اور
خُداوند مسیح کی وُہ رویا ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہنے لگی۔

چھٹا باب

کالج کا زمانہ

جو کچھ مَیں نے بیان کیا ہے مجھے اُس کی ایک دم ہی سمجھ نہیں آگئی تھی لیکن میرے ہاتھ میں خزانوں کی چابی تھی۔ نیا عہد نامہ اب میرے لئے ایک قیمتی کتاب تھی۔ اب مَیں کئی کئی گھنٹوں تک نئے عہد نامہ کو پڑھنے اور اُس کے مطالب کو سمجھنے میں گزار دیتا تھا۔ مجھے غور و فکر کرنے میں بڑی خوشی ہوتی تھی۔ اب میرے لئے لئے عہد نامہ کے مشکل ترین حصّوں اور ژرف نگار مصنفین کو سمجھنا ممکن ہو گیا۔ پولُس رسُول کو دمشق کی راہ میں اسی قسم کی رویا دکھائی دی تھی۔ رسُول کا تجربہ اور میرا تجربہ ایک جیسے تھے۔ خدا کے پاک کلام کی یہ آیات میرے لئے چشمۂ نُور تھیں۔ "کون ہم کو مسیح کی محبت سے جُدا کرے گا؟" یا "مسیح کی محبت ہم کو مجبور کر دیتی ہے" یا یہ آیت "میرے لئے زندہ رہنا مسیح ہے"۔ یہ آیات میرے لئے ایسی تھیں کہ گویا خداوند مسیح مجھے براہِ راست پیغام دے رہا ہے۔ مَیں نے بڑی خوشی سے ان آیات کی عظمت کو معلوم کیا اور مَیں نے انہیں قیمتی نگینوں کی طرح اپنے دل میں بٹھا لیا لیکن خُدا کے مقدس کلام میں سے ایک حوالہ جسے مَیں بہت ہی پسند کرتا ہُوں۔ اس کے الفاظ یُوں ہیں:-

"خدا نہ کرے کہ مَیں کسی چیز پہ فخر کروں سوا اپنے خداوند یسوع مسیح کی صلیب کے جس سے دُنیا میرے اعتبار سے مصلوب ہُوئی اور مَیں دُنیا کے اعتبار سے"۔

اس شاندار زمانے میں ایک بات بالکل صاف تھی کہ میرے اُفق پر کوئی نئی چیز طلوع ہُوئی ہے اور اُس نے روزمرہ کی چیزوں کو بالکل تبدیل کر دیا ہے۔ اب آسمان پہلے کی نسبت زیادہ نیلا تھا اور قدرت کا حُسن پہلے سے زیادہ مسحُور کُن تھا۔ مجھے وُہ رات اچھی طرح سے یاد ہے کہ چاندنی چھٹکی ہُوئی تھی۔ مَیں بستر سے اُٹھا اور باہر نکلا۔ مَیں چاند کی حسین چاندنی میں اکیلا چلتا گیا حتّٰی کہ سُورج مشرق سے طلُوع ہونے لگا۔ اس دوران میں مَیں نے کسی چیز کی حاجت محسوس نہیں کی۔ مَیں اُس کی حمد وستائش کے گیت گاتا جاتا تھا۔ خدا اور کائنات میرے بہترین رفیق تھے۔ اسی قسم کے واقعات میری زندگی کا معمُول بن گئے، کیونکہ اب مَیں رُوح کی جلالی دُنیا میں رہتا تھا۔ اپنے بچپن کے زمانہ میں قُدرتی مناظر کو دیکھ کر جو لُطف مجھے حاصل ہوتا وُہ اب پہلے سے دُگنا ہو گیا تھا۔

مَیں جب کسی انسان کے چہرے کو دیکھتا تھا اُس میں میرے لیئے ایک قسم کی کشش ہُوا کرتی تھی۔ خصُوصاً اس وقت جب کوئی چہرہ بڑا ہی مغموم اور اُداس نظر آیا کرتا تو میرا دل ہمدردی سے بھر جایا کرتا تھا۔ میرے دل میں ہمیشہ تمنا رہتی تھی کہ مَیں غمزدوں اور دُکھیوں کی مدد کروں۔ اگر مَیں کسی کی تھوڑی سی خدمت بھی کرتا اور اُس کا کسی دُوسرے کو علم نہ ہوتا تو اس

سے مجھے زیادہ خوشی حاصل ہوا کرتی تھی اُس وقت خداوند مسیح کے ان الفاظ
کے معنی بالکل واضح تھے کہ "تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے، تجھے بدلہ دے گا۔"

میں ایک اور گہرا باطنی تجربہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تجربہ میرے دل میں
ہر وقت تازہ رہتا ہے اور یہ ایک سہانے سپنے کی طرح ہے۔ موسم خزاں
کی ایک سہانی صبح تھی۔ درختوں کے پتے زرد اور سنہری تھے۔ میں ایک
جھونپڑی سے نکل کر دیہات میں لِچفیلڈ جا رہا تھا۔ ہم اس جگہ چھٹیاں گزار
رہے تھے۔ میرے دل میں ایک خاص قسم کی روشنی تھی اور چاروں طرف
بھی روشنی ہی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں ایک سڑک سے مڑنے کو تھا کہ
ایک پہاڑی پر مجھے درختوں میں سے کیتھیڈرل نظر آیا۔

مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ راستہ میں بھی کوئی گرجا ہوگا۔ میں نے جب
میں نے کیتھیڈرل کو دیکھا تو دُور سے بے حد خوبصورت نظر آرہا تھا۔
میرا دل خوشی سے لبریز ہوگیا اور میں حمد و ثنا کے گیت گانے لگا اور
کیتھیڈرل کی طرف روانہ ہُوا۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ جیسے میں ہوا
کے دوش پر پرواز کر رہا ہوں۔ آخرکار میں کیتھیڈرل میں داخل ہوگیا۔

شام ہونے کو تھی۔ یہ عبادت کا وقت تھا اس لئے میں بڑے اطمینان
سے بیٹھ گیا۔ میری رُوح بڑی شادمان تھی۔ میں کیتھیڈرل کی محرابوں اور
اُس کی محراب دار چھت کو دیکھنے لگا۔ مجھ پر ہیبت طاری ہوگئی۔ شام کی
روپہلی شفق میں گرجا کی بالائی منزل کی کھڑکیوں سے گرجا میں نور برس رہی
تھی۔ گرجا ایسا جگمگا رہا تھا کہ ایسے نظارے کو دیکھ کر انسانی دل خود بخود

لہ LICHFIELD

اس دُنیا سے دُور بلندیوں میں پرواز کرنے لگتا ہے۔ راستباز انسانوں کی رُوحوں نے آسمان کے مقدسین کی جماعت کے ساتھ مل کر کیتھیڈرل کی فضا کو پُر وقار بنا دیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد شام کی عبادت شروع ہُوئی اور گانے والی پارٹی نے آرگن کی رسیلی سُروں کے ساتھ گانا شروع کیا۔ میرے کانوں میں گانے کی آواز آئی۔

اس کے بعد ایک ایسا واقعہ ہُوا کہ مَیں اُسے بیان نہیں کر سکتا۔ مُجھے زمان و مکان کا کوئی شعور نہ رہا۔ مَیں ایسی نُورانی فضاؤں میں پرواز کرنے لگا جو وہم و گمان سے پرے ہیں۔ جب عبادت ختم ہُوئی تو مَیں پھر وُہی تھا۔ میرے گرد و پیش وُہی چیزیں تھیں۔ مَیں نے دوبارہ اپنا سفر شروع کیا۔ آج مَیں خوشی سے پھُولا نہیں سماتا تھا۔

جب مَیں کیتھیڈرل سے باہر آیا تو مُجھے ایک بھکارن ملی۔ اُس نے مُجھ سے خیرات مانگی۔ مُجھے اب بھی یاد ہے کہ مَیں نے کس خُوشی سے اپنی جیبیں خالی کر دیں اور جتنے پیسے میرے پاس تھے مَیں نے اُس بھکارن کو دے دیئے۔ مَیں نے کھانا نہیں کھایا تھا اور میرا گھر ابھی بہت دُور تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ مَیں بذریعہ ریل واپس آؤں گا اور اسی لئے مَیں نے پیسے لے لئے تھے۔ لیکن جب مُجھے کیتھیڈرل میں اتنا سرور حاصل ہُوا تو اُس وقت مَیں خُداوند مسیح کے خیال کے سوا کسی دُوسری بات کو سوچ نہ سکا۔ میرے دِل میں تو بس خُداوند مسیح کی یاد تھی۔ وُہ میرے لئے سب کُچھ تھا۔ مُجھے نہ تکان محسُوس ہُوئی اور نہ ہی مَیں بھُوک کی وجہ سے نڈھال

ہُوا کیونکہ مَیں نے محبت کی خاطر ایسا کیا تھا۔ مَیں نے اُس الٰہی محبت کرنے والے کی خاطر سب کچھ کیا جس نے بڑی قیمت دے کر مجھے اپنا بنایا تھا۔ باتوں کی بجائے عمل نے مجھے خوشی بخشی۔ جو کچھ ابھی تک واقع ہُوا تھا مَیں نے اُس کو کسی پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ مَیں کم گو اور شرمیلا تھا۔ شرمیلا پن میری فطرت بن چکی تھی لیکن جب بھی مجھے خاموشی سے خُداوند مسیح کی چھوٹی سی خدمت کرنے کا موقع ملا ہے تو میرے دل سے خوشی کے چشمے پھُوٹ نکلے ہیں۔ میرے دل میں خُداوند مسیح کی خدمت کرنے کی تمنا تھی، وہ پُوری ہو گئی ہے۔

اب مَیں ایک معمولی اور غیر اہم واقعہ کی مثال دیتا ہُوں۔ یہ واقعہ مجھے ابھی تک یاد ہے۔ ہمارے پاس کھانے کے سامان کی ایک بڑی سی ٹوکری تھی۔ مَیں اُسے اُٹھا کر شہر تک لے آیا اور اس طرح مَیں نے ایک معمولی سی خدمت سرانجام دی۔ مجھے اس سے بڑی خوشی حاصل ہُوئی۔ اس سے پیشتر مَیں اس قسم کے کاموں کو بڑا ہی ذلیل سمجھا کرتا تھا۔ مَیں اپنے حصے کا تھوڑا سا سامان اُٹھا لیا کرتا تھا اور بس۔ لیکن اب تو اتنے بڑے بوجھ کو اُٹھانے میں جو خوشی مجھے محسوس ہوتی اس سے مجھے خوشی حاصل ہوتی تھی۔ اس خوشی کے زمانہ میں جب مَیں خُداوند مسیح کے بہت قریب تھا مجھے ایسا دکھائی دیتا تھا کہ کوئی چیز میری اس زندگی کو چھین نہ سکے گی۔ سکندریہ کے کلیمنٹ[۱] نے ایک بڑا پیارا محاورہ استعمال کیا ہے۔ اُس نے مسیحی زندگی کو "بہارِ جاودان" سے تشبیہ دی ہے۔ اس خوبصورت

۱۔ CLEMENT.

زمانے میں میری بھی یہی کیفیت تھی اور غموں اور دکھوں کے باوجود اس
زمانہ کی تر و تازگی ہمیشہ میری زندگی میں رہی ہے۔

میں صبح سویرے گرجا میں عبادت کے لئے بلا ناغہ جایا کرتا تھا۔
یہی وہ مقام تھا جہاں مجھے خداوند کی ملاقات ہوتی تھی۔ جب تک میں
برمنگھم میں رہا میں شاذ و نادر ہی اس عبادت سے غیر حاضر رہا۔ دعائیں،
مزامیر اور اسباق اب نئی زندگی کے حامل تھے۔ میں جب گرجے
سے واپس آتا تو خوشی سے لبریز ہوتا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا
تھا کہ میں نے کوئی فتح حاصل کر لی ہے۔ گرجا سے گھر کی طرف
آتے ہوئے میں راستہ میں حمد و ثنا کے گیت گایا کرتا تھا کیونکہ خدا کی
رحمتوں اور شفقتوں نے میرے دل پر نعمتوں کی بارش برسا دی تھی۔

میرے مالک خداوند مسیح کی مہربانی سے یہ سب کچھ اس وقت
واقع ہوا جب میں نے اکتوبر سنہ ۱۸۹۰ء میں پیمبروک کالج میں میں نے
ابھی داخلہ نہیں لیا تھا یعنی یہ بات میرے یونیورسٹی میں جانے سے
پیشتر کی ہے کیونکہ اگر یونیورسٹی میں جانے سے پیشتر مجھ میں یہ تبدیلی
نہ ہوتی تو ضرور میں کسی گڑھے میں جا گرتا لیکن اس کے برعکس میرا
رواں رواں خدا کی محبت کے نور سے جگمگا اٹھا۔ علاوہ ازیں خوش قسمتی
سے مجھے ایک قابل اور مہربان استاد کی صحبت میسر آئی۔ ان کا اسم
گرامی ہیرس ہرٹن ہرائر تھا۔ وہ مجھ سے عمر میں کافی بڑے تھے اور
ان کی شخصیت میں ایک خاص قسم کی جاذبیت تھی۔ وہ بڑے سمجھدار

اور دانا تھے۔

جب مَیں کالج میں داخل ہو کر اُن کی خدمت میں حاضر ہُوا تو اُنہوں نے اپنی ذہانت سے اندازہ لگا لیا کہ مُجھ پر کیا کچھ بیتی ہے۔ اُنہوں نے میرا سارا راز معلوم کر لیا۔ وُہ میری اس نئی خوشی میں شرکت کیا کرتے تھے۔ میرے لئے یہ ایک نئی بات تھی کہ مَیں بڑی آزادی سے اُن کے ساتھ اپنی تبدیلی کے متعلق گفتگو کیا کرتا تھا۔ اُنہوں نے اپنی جوانی کے دنوں میں اسی قسم کی بیداری کا تجربہ حاصل کیا تھا۔ اُنہوں نے کمال شفقت سے میری جھجک اور شرمیلے پن کو دُور کر دیا۔ ہمارے راستے میں کوئی مصنوعی دیوار نہ تھی۔ مَیں بلا روک ٹوک اُن کے ساتھ گفتگو کر سکتا تھا۔ مَیں دل سے اُنہیں چاہتا تھا اور اُن کی عزت کیا کرتا تھا اور جُوں جُوں مَیں اُن سے واقف ہُوا مَیں اُن کا احترام کرنے لگا۔

مَیں ابھی گریجوایٹ نہیں تھا اور اُن کے سینکڑوں طالب علموں میں سے ایک تھا۔ اُنہوں نے ازراہِ عنایت مجھے اپنا دوست بنا لیا۔ وُہ اتنے نیک اور مہربان تھے کہ اُن کا گھر مَیں اپنا گھر سمجھنے لگا۔ اُنہوں نے فوراً معلوم کر لیا کہ مَیں بچوں کو بہت پیار کرتا تھا۔ اس لئے اُن کی اہلیہ محترمہ اور اُنہوں نے مجھے خاندان کا ایک رُکن سمجھنا شروع کر دیا۔ . . . .

. . . . اُنہوں نے میرے مذہب کے متعلق کبھی بحث نہیں کی اور نہ ہی اُنہوں نے میرے مذہبی عقائد کو رد کرنا چاہا بلکہ اس کے برعکس اُنہوں نے مجھے تلقین کی کہ جب تک اس مذہب کا مجھ پر اثر رہے

میں اس کے تمام احکام بجا لاؤں۔ انہوں نے میری محبت اور دوستی سے یہ فائدہ نہیں اٹھایا کہ میں اُن کے اپنے مذہبی عقیدے کی طرف مائل ہو جاؤں لیکن جب اس کے بعد میں استدلالی سوالات کا جواب نہیں دے سکتا تھا تو میں حلِ مشکلات کے لئے اُن کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ اُن کی دانائی بھی اُن کی ہمدردی و نیکی کا جذبہ تھی۔ اس قسم کی باطنی تکلیف کے وقت وہ تپتی ہوئی دھرتی پر کسی چشمہ یا بادل کے سایہ کی طرح تھے۔ کتاب مقدس سے وہ یسعیاہ نبی کی کتاب کے پینتیسویں باب کے بڑے مشتاق تھے۔ وہ باب یوں شروع ہوتا ہے:-

"بیابان اور ویرانہ شادمان ہوں گے اور دشت خوشی کرے گا اور نرگس کی مانند شگفتہ ہوگا۔"

یہ آیت مجھے اچھی طرح سے یاد ہے اور جب کبھی یہ آیت میرے سامنے آتی ہے تو اُن کے بلند اخلاق کی خوشبو بھی اس کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن انہوں نے یہ سارا باب مجھے پڑھ کر سنایا اور جب ہم اس باب کی آخری آیت پر پہنچے جو یوں ہے:-

"اور جن کو خداوند نے مخلصی بخشی، لوٹیں گے اور صیون میں گاتے ہوئے آئیں گے اور ابدی سرور اُن کے سروں پر ہوگا۔ وہ خوشی اور شادمانی حاصل کریں گے اور غم و اندوہ کافور ہو جائیں گے۔"

تو اُن کی آواز بھرا گئی اور اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

چارلس پرائر بڑے عالم و فاضل تھے۔ وہ بڑے بیدار مغز، ذہین اور

بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ لیکن اتنے عالم فاضل ہونے کے باوجود بھی وہ بڑے منکسر المزاج اور ننھے بچے کی طرح تھے۔ کالج کے زمانہ میں وہ بڑے نیک طینت اور پاک باطن تھے۔ یہ اُن کا فیضان اور اثر تھا کہ زندگی کے پُر آشوب زمانے میں میرا مسیحی ایمان کمزور ہونے کی بجائے مضبوط ہوتا چلا گیا اور آخرکار جب علم کی وجہ سے بہت سے نظریات میں تبدیلیاں ہوگئیں تو خداوند مسیح کو ہی مرکزی مقام حاصل رہا۔ اور جب تک ہندوستان نہ آیا مجھے اس قسم کی رفاقت نصیب نہ ہوئی جو مجھے اُس وقت حاصل ہوئی جب مجھے اُس کی بے حد ضرورت تھی۔

تھوڑے عرصہ کے بعد میرے شک وشبہ کے طوفان کا زور ٹوٹ گیا۔ میرے بچپن کے زمانہ کے بودے پن کے اعتقادات اس طرح سے بکھر گئے جیسے تیز آندھی کے سامنے پتیاں ادھر اُدھر اُڑ جاتی ہیں اور میری زندگی کا نازک سفینہ جو سفر کے لئے بالکل تیار تھا ایسے سمندروں میں چلنے لگا جن سے میں ناواقف تھا۔ اس اہم اور پر آشوب زمانے میں وہ عجیب وغریب قسم کا مذہبی اعتقاد جو بچپن کے زمانہ سے میری زندگی کا ایک خاص جزو تھا چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا اور میں ایک ایسے درماندہ ملاح کی طرح تھا جو ایک ویران ساحل پر چھوڑ دیا گیا اور کف دریا نے اُسے اندھا کر دیا ہو اور وہ تند موجوں سے نجات حاصل کرنے میں کوشاں ہو۔ جب اس قسم کا روحانی شک اور بے چینی رُوح کو جھنجھوڑنا شروع کرتے ہیں تو تلاطم خیز ہواؤں کے ساکن ہونے سے پیشتر اُن کی تندی اور تیزی اپنے

انتہائی عروج پر ہوتی ہے۔

انسانی دوستی کتنی شاندار چیز ہے۔ جب میں ایام گذشتہ کی طرف نظر اٹھاتا ہوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ اس نئی ذاتی رفاقت کے سحر کے ذریعہ ہی سے میں اس روحانی کشمکش میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ میرے لئے کوئی راہِ فرار نہ تھی اور کئی مرتبہ میں جنگل میں بھی گیا تاکہ مجھے اس کا کوئی جواب مل جائے۔ جب میں واپس آتا تو چارلس پرائر صاحب میری دلجوئی فرماتے اور کہتے کہ میں اپنی تگ و دو جاری رکھوں۔

جب میں کالج میں داخل ہوا۔ تو یہ قدرتی بات ہے کہ میں انٹر کالجیئٹ[1] کرسچن یونین کے لیڈروں کی طرف مائل ہونے لگا۔ یہ لیڈر مذہبی معاملات میں بڑے ہی نڈر تھے اور بعض اوقات مذہبی خیالات میں انتہا پسند تھے اُن کے خلوص اور پاکیزگئ باطن نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ وُہ خُداوند مسیح کے نام کے گویا سچے عاشق تھے۔ اُن میں سے بعض لفظی الہام کے قائل تھے۔ میرا اُن سے اس بات پر اختلاف تھا لیکن اس کے باوجود مجھے اُن کے ساتھ رفاقت سے تقویت حاصل ہوتی تھی۔ میں باقاعدہ اُن کی دُعائیہ مجالس میں شامل ہوا کرتا تھا۔

انٹر کالجیئٹ کرسچن یونین کے ممبر گناہ کی ابدی سزا کے معتقد تھے۔ اُنہوں نے یہ عقیدہ کتاب مقدس کے مختلف حوالہ جات سے اخذ کیا تھا اور لفظی الہام کے نظریہ کی وجہ سے یہ عقیدہ بڑی اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ مجھے تو یہ کُفر معلوم ہوتا تھا کہ وُہ خُدا جو محبت ہے خُداوند مسیح نے ظاہر کیا ہے

[1] INTER COLLEGIATE.

اُس کے متعلق اس قسم کا عقیدہ رکھا جائے۔ سب سے زیادہ صدمہ مجھے اس چیز سے ہوتا ہے کہ خُداوند مسیح خود جہنم کی خوفناک سزا کے عقیدے کا محرّک ہو۔ وُہ خُداوند مسیح جس نے بڑے پیار سے خُدا کی محبت کو بیان کیا تھا کہ اگر کوئی چڑیا گرتی ہے تو خُدا کو اُس چڑیا کی بھی فکر ہے۔ خُداوند مسیح نے فرمایا تھا کہ تمہارے سر کے بال بھی گنے ہُوئے ہیں۔ خُداوند مسیح نے خود چھوٹے بچوں کو گود میں لیا تھا اور انہیں برکت دی تھی اور اس خُداوند مسیح کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وُہ ابدی سزا کے خوفناک نتیجے کا محرّک ہے۔

ایک شام ہارٹفورڈ کرسچین یونین کے شرکاء کے ساتھ گفتگو کرنے کے بعد میں اپنے گھر واپس لوٹا اور میں نے اپنی بائبل کھولی اور بڑی دیر تک کرسچین یونین کے شرکاء کے ساتھ جو بحث و تمحیص ہوئی تھی اُس کے متعلق غور و خوض کرنے لگا۔ میرے سامنے کئی دُوسرے سوالات بھی تھے۔ وُہ رُوح کی روشنی جو میری رہنمائی کیا کرتی تھی، کم ہونے لگی۔ میں نے بہت سے وُہ عقائد جنہیں میں بہت ہی مقدس سمجھا کرتا تھا، چھوڑ دیا۔ لیکن میں یہ عقیدہ کہ خُدا کی فطرت میں محبت ہے چھوڑ نہیں سکتا تھا، چاہے میرے سامنے کتاب مقدس کے ہزارہا حوالہ جات کیوں نہ پیش کئے جاتے کیونکہ اگر میں ایسا کرتا تو یہ رُوحانی خودکشی کے مترادف ہوتا۔

میں ایک گھنٹہ تک اسی سوچ بچار میں رہا۔ سوچتے سوچتے مجھے بہت تھکن محسوس ہُوئی۔ اُس وقت میں نے ایک رویا دیکھی اور مجھے روشنی

نظر آئی۔ اس واقعہ کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ میں اُسے کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر میری زندگی کو تبدیل کر دیا۔ اس مرتبہ میں نے کوئی شبیہ تو نہیں دیکھی لیکن میرے دل میں سکون اور اطمینان تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مجھے ابدی بازو سنبھال رہے ہیں اور مجھے آرام حاصل ہو رہا ہے۔ یہ روشنی باطنی تھی نہ کہ خارجی۔ اس نے میری ہستی کو منور کر دیا۔ مجھے یہ اطمینان اچانک ہی حاصل ہوا اور اس سے پہلے اسی طرح سے، مجھے نئی زندگی نصیب ہوئی تھی۔ دراصل میرے ابتدائی زمانے کے تجربات کی یہ تکمیل تھی اور میری زندگی میں اطمینان اور سکون تھا۔ مجھے ایسی خوشی حاصل ہوئی جو بیان سے باہر ہے۔ اس واقعہ کے بعد کئی مہینوں تک میری خوشی میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ ایسا نظر آتا تھا جیسے میری ہستی خوشی اور شادمانی کے سیلاب میں تھی۔

میں اپنے اس نئے عقیدے کو دوسروں کے سامنے بیان کرنے سے ہچکچاتا تھا۔ میرے لئے اسے دوسروں کو بتانا ناممکن تھا۔ لیکن جہاں کہیں مجھے جرأت کی ضرورت تھی اس نئے تجربہ نے مجھے جرأت عطا کی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اندرونی روشنی جو مجھ میں ہے تازہ ہو گئی ہے اور یہ روشنی میری رہنمائی کرتی ہے۔

میرے کالج کے ایام دھیرے دھیرے گزر رہے تھے۔ گھر کی پریشانیوں نے میرے دل و دماغ کی مشکلات میں اضافہ کر دیا تھا۔ میرے والد محترم دل کی بیماری میں مبتلا تھے اور اُن کی یہ بیماری کسی وقت بھی

مہلک ثابت ہو سکتی تھی۔ یکے بعد دیگرے اِن پر دِل کے کئی دَورے پڑے اَور رفتہ رفتہ وُہ بڑے ہی کمزور ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے بار بار یہ ہدایت کی تھی کہ وُہ جسمانی اَور دماغی تفکرات سے دُور رہیں۔

میری والدہ کو قدرتاً سب سے زیادہ فکر تھی لیکن وُہ بڑی مخلص تھیں اَور اُنہیں خُدا پر بھروسہ تھا، اس لئے وُہ اپنی تمام پریشانیوں پر قابو پا لیتی تھیں۔ کیمبرج میں میرے عقائد میں جو فرق رُونما ہُوا اَور جس قسم کی کشمکش میں مَیں مُبتلا رہا، مَیں اپنے والدِ محترم پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا تاکہ اُن کو یہ چیز شاق نہ گزرے کیونکہ اب وُہ ایسے بوجھ برداشت کرنے کے قابل نہیں تھے۔ شروع شروع میں جب اُنہیں میرے عقیدے میں تبدیلی کا علم ہُوا تو وُہ اس بات کو سراہتے نہیں تھے، کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ مُجھ میں علمیت کا غرور ہے، ورنہ مَیں کبھی اپنے عقیدے کے خلاف کوئی بات نہ کرتا۔ جب مَیں بڑے سخت اعتراض کیا کرتا تو وُہ اس بحث کو اس طرح سے بند کر دیا کرتے تھے کہ وُہ اپنا ٹالک بیرج میں خود ثبوت کیا کرتے تھے۔ کیا مَیں ایک لمحہ بھی یہ یقین کر سکتا تھا کہ خُدا کے متعلق اُن کا تجربہ محض جُھوٹ تھا؟

اِن حالات میں مَیں بڑے افسوس کے ساتھ اُنہیں یقین دلایا کرتا تھا کہ مَیں اُن کے خلوص پر شک نہیں کرتا اَور نہ ہی مَیں اُن کی رُوحانی نعمتوں کے متعلق کوئی سوال کر سکتا ہُوں، لیکن اس کے ساتھ ہی مَیں پہلے کی طرح اب اُن کے عقیدے کا قائل نہ تھا۔ اُن کے ساتھ شخصی طور پر بحث کرنے کی بجائے مَیں اپنے خطوط میں اپنے موقف کی وضاحت کیا کرتا تھا۔

لیکن اِن خطوں سے وُہ اتنے جوش میں آجایا کرتے تھے کہ اب مَیں نے
تہیہ کر لیا کہ اُنہیں خطوں میں ایسی باتیں نہیں لکھا کروں گا کیونکہ مجھے ڈر تھا
کہ ایسا کرنے سے کوئی اُنہیں نقصان نہ پہنچے۔

جو کچھ مَیں نے چند الفاظ میں بیان کیا ہے وُہ کئی سالوں کی مسلسل کشمکش
کا نتیجہ ہے۔ رفتہ رفتہ میرا یقین پختہ ہو رہا تھا کہ اب مَیں اپنے والدِ محترم کے
عقیدہ سے پر عمل نہیں کر سکتا تھا۔ آخرکار مَیں نے اُن کا عقیدہ چھوڑ دیا اَور اِس
سے ہم میں غم انگیز غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔ ہماری بحث لاحاصل اَور بے اثر
ثابت ہُوئی۔ دونوں طرف دِل دُکھی تھے۔ اِن زخموں کو وقت ہی مندمل کر
سکتا تھا۔ والدہ محترمہ بالکل خاموش تھیں۔ اُنہوں نے میرے ساتھ کبھی
بحث نہیں کی تھی لیکن سب سے زیادہ وُہ دُکھی تھیں اَور مَیں بھی اس چیز
کو محسوس کر رہا تھا۔

مَیں نے اپنے ایک عزیز اَور وفادار دوست کے کہنے پر ایک آخری خوفناک
قدم اُٹھایا بیسل ویسٹ کاٹ صاحب ڈرہم کے مرحوم بشپ کے بیٹے تھے۔ میرے
کالج کے تمام ہم عمروں میں وُہ میرے سب سے زیادہ عزیز دوست تھے۔
وُہ مسز پرائر کے بھائی تھے اَور مَیں نے پہلے پہل مسٹر پرائر کے گھر ہی اُن
سے واقفیت حاصل کی تھی۔ ہماری ہر ایک چیز مشترکہ تھی جس طرح
دُنیا میں ہم جماعت لڑکے رہتے ہیں، ہم کبھی اکٹھے رہا کرتے تھے۔ ہم
روزانہ ایک دُوسرے کے کمرے میں جا کر پڑھا کرتے تھے۔ ایک دِن
بڑی مشکل سے اپنے اس عزیز دوست سے اپنے عجیب و غریب مذہبی

BASIL WESTCOTT — DURHAM — MRS. PRIOR

سیرت بشپ نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر مجھے برکت دی تو میرا دل
اور بھی زیادہ مغموم ہو گیا۔

اس کے بعد میں اپنے والدین اور اپنے بہن بھائیوں کے پہلو بہ پہلو
اُس گرجا میں عشاء ربانی کی رسم میں شریک نہیں ہوا کرتا تھا۔ جب کبھی
میں کیمبرج سے گھر آتا اور اتوار کی صبح عبادت کے لئے جاتا تو میرا عبادت
کا طریقہ اُن سے مختلف ہوتا تھا۔ میں اپنے ہی عمل سے اُن سے علیحدہ
ہو چکا تھا۔

اس آپ بیتی میں آگے چل کر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اب میرے
خیالات میں بہت تبدیلی اور وسعت آ چکی ہے۔ بڑی سوچ بچار
کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میری یہ تفہیم کہ میں کلیسیائے انگلستان
کا ایک شریک ہونے کی وجہ سے اپنے والدین کے ساتھ عشاء ربانی میں
شریک نہیں ہو سکتا، غلطی تھی۔ ہمارے مذہبی عقائد کی وجہ سے
اگرچہ ہمارا راستہ ایک دوسرے سے بہت مختلف تھا تاہم ہمارا مسیح
پر ایمان تھا اور اس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ میں نے
یہ محسوس کیا کہ اپنی تبدیلی کے پیشتر کے زمانہ کی نسبت اب میں زیادہ
مسیح کے قریب تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگرچہ ہم میں کچھ عقلی طور پر
اختلافات تھے مگر روحانی طور پر ہم پہلے کی نسبت ایک دوسرے
کے زیادہ قریب ہو گئے تھے۔ ہمارے نظریات میں اختلاف تھا
لیکن اس کے باوجود ہم نے نئے سرے سے مسیح کی رویا کا تجربہ کیا تھا۔

اَور یوں ہم اس کی صلیب کے قریب آ گئے تھے۔ بالآخر میرے والد محترم کو اس بات کی سمجھ آ گئی کہ مَیں نے جو کچھ کیا تھا وہ مسیح کی خاطر کیا تھا اَور وہ اس بات پر متفق ہو گئے کہ ہم دونوں اکٹھے ایک ہی سیکرامنٹ نہیں لے سکتے۔

فطرت خلا کو ناپسند کرتی ہے جب مَیں اس رُوحانی کشمکش کی تلخیاں برداشت کر چکا تو مَیں قدرتاً کلیسیائے انگلستان کے گرجوں کی عبادت میں شریک ہونے لگا۔ اب مَیں اپنے پہلے گرجے میں عبادت کے لئے نہیں جایا کرتا تھا۔ پہلے پہل تو مجھے کوئی لُطف نہیں آتا تھا، کیونکہ یہاں عبادت میں وہ جوش و خروش اَور گرمی نہ تھی لیکن جلدی ہی روزانہ عشاءِ ربانی میں شرکت کی وجہ سے مجھے اس عبادت میں گرمی اَور زندگی محسُوس ہُوئی۔ مجھے رُوحانی خُوشی حاصل ہُوئی۔ اب مَیں سینٹ میری چرچ میں ہر روز عشاءِ ربانی کی عبادت میں شریک ہُوا کرتا تھا۔ یہ چھوٹا سا گرجا ہیمبروک کالج کے عین سامنے ہے۔ عشائے ربانی کی عبادت میں شریک ہونا میری رُوح کے لئے لنگر کا کام دیتا تھا کیونکہ اس وقت میرے ایمان کی بُنیادیں بُری طرح ہل رہی تھیں۔ صبح کے وقت سیکرامنٹ کے موقع پر مَیں نے خُداوند مسیح کی حضُوری کو محسُوس کیا اَور مجھے عشائے ربانی میں شریک ہونے کی عادت پڑ گئی۔ شروع شروع میں یہ گہرا طبعی ملکہ مجھے ایسا نظر آنے لگا جیسے اس کا تعلق ہائی چرچ یعنی انگلستان کی کلیسیا کی اُس جماعت سے ہے جو پادریوں کی حکومت اَور اقتدار کی قائل ہے لیکن اس کے بعد مَیں اس کا قائل ہو گیا کہ مَیں خُداوند مسیح کے ساتھ اس شراکت کو زیادہ عام گیر طریقے

سے محسوس کر سکوں۔

ابھی تک جو کچھ میں نے لکھا ہے اُس میں مَیں نے اپنی کہانی کے ایک حصے کو بالکل صاف صاف بیان کیا ہے لیکن مجھے معلوم ہوتا ہے کہ مَیں نے بڑے اختصار سے کام لیا ہے کیونکہ اس تصویر سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ شکوک اَور مشکلات زیادہ تر ایک ہی طرف سے نازل ہوئے لیکن یہ تحریر کرنا زیادہ حقیقت ہے کہ کیمبرج کے اس انقلابی زمانہ میں میرے دل میں ہر ایک قسم کے سوالات اَور شکوک تھے جن کا تعلق میری اُس تعلیم کے ساتھ تھا جو مجھے خدا اَور مسیح کے بارے میں دی گئی تھی۔ مجھے یہ بھی تعلیم دی گئی تھی کہ موت کے بعد بھی زندگی ہے۔ تبدیلی کے اس زمانہ میں کسی چیز کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

یہ زمانہ عقل و شعور کا تھا اَور کیمبرج یونیورسٹی سائنسی دریافت اَور علمِ ریاضی کی تحقیق میں بڑی مشہور تھی۔ اس یونیورسٹی میں نئے نئے خیالات اَور تحریکات عام تھیں۔ کئی پُرانے خیالات اَور نظریات نئے علم کے سیلاب میں بہہ گئے۔

اسی فضا میں میری مسیحی زندگی کو نشوونما حاصل کرنی تھی۔ مَیں کیمبرج میں اپنی زندگی کے ان ایّام کو بڑا ہی قیمتی سمجھتا تھا کیونکہ ان ایّام میں میرے دل و دماغ کو تقویت پہنچی تھی۔ عنفوانِ شباب کا یہ زمانہ بڑا ہی پُرآشوب زمانہ تھا۔ اس قسم کی تنقیدی فضا میں میرے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ مَیں ساحلِ سمندر پر ہی کھڑا رہوں اَور میری زندگی کی کشتی پُرسکون پانیوں میں بےحس و حرکت رہے۔ خدا کا شکر ہو کہ میرے لئے یہ نہایت ہی ضروری ہو گیا

کہ میں گہرے سمندر میں اپنی کشتیٔ حیات کو لے جاؤں اور تلاطم خیز موجوں کے تھپیڑے کھاؤں اور اس طرح طوفانی سمندروں میں خداوند مسیح پر میرا ایمان غیر متزلزل ثابت ہو۔

مجھے اِن طوفان خیز سمندروں میں کبھی کبھی پُر سکون لمحے میسر آئے ہیں۔ میں نے اِن ہی ایّام میں اپنی کہانی کے آئندہ صفحوں کو سپردِ قلم کیا ہے۔ میں انگریزی کے مشہور شاعر ملٹن کے الفاظ میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ عارضی یا مشقت نیکی" میرے لئے کسی دلکشی کا باعث نہ تھی۔ خداوند مسیح کی پیروی کرنے میں مجھے ایسے راستوں پر چلنا پڑا ہے جنہیں میں اس سے پہلے نہیں جانتا تھا۔ میں اجنبی ممالک میں بھی گیا ہوں۔ میں نے نئے ساحلوں کی تلاش میں متلاطم سمندروں کو عبور کیا ہے۔ مسیح کی بلاہٹ نے میری رُوح کو بار بار بیدار کیا ہے اور جب کبھی میری ہمت مجھے جواب دے دیتی ہے اور میرا دل بیٹھ جاتا ہے تو اُس کی آواز مجھے یہ کہتے ہُوئے سُنائی دیتی ہے کہ تمہارا دل نہ گھبرائے۔"

ساتواں باب

مُلک کا شمالی حصّہ

یہی قدم اُٹھا چکا تھا۔ میری رُوحانی زندگی میں ایسا انقلاب آیا تھا جس نے مجھے میرے والدین کے ساتھ مذہبی رسُومات کو ادا نہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہم ایک دُوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ میں جبلّی طور پر ہر روز اس بات کا منتظر رہا کہ چرچ آف انگلینڈ میں میرا آرڈی نیشن[*] (مخصُوصیت) ہو جائے۔ میری سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ میں غریب لوگوں میں خدمت کرنے کے لئے اپنی زندگی وقف کر دوں۔ میں دل سے اسے پسند کرتا تھا۔ میں ہر روز اسی کے متعلق سوچتا رہتا تھا۔ ان غریب عوام میں ہی میں نے خداوند مسیح کو پا لیا تھا۔

ابھی میں گریجوایٹ نہیں ہُوا تھا اور جب کبھی مجھے موقع ملتا تھا میں والورتھ[*] میں ہمارے کالج مشن کے لوگوں میں رہا کرتا تھا۔ والورتھ لندن کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ یہاں مجھے غریب لوگوں میں کام کرنے سے بڑی خوشی حاصل ہوتی۔ کالج کے ایام میں وہ مشکلات اور شکوک جو میرے سامنے تھے، سب جاتے رہے۔ زندگی یہاں بے حد سادہ تھی۔ غریب بڑے دُکھ کی زندگی بسر کر رہے تھے اور وہ انسانی ہمدردی

---

[*] ORDINATION. [*] WALWORTH

کے طلبگار تھے۔ ایسی حالت میں خُداوند مسیح میرے قریب تھا اور میں شعوری طور پر اُس کی خدمت میں حِصّہ لے رہا تھا۔ یہی میری سب سے بڑی خوشی تھی۔ میں اُس کی حضوری میں سارا دِن خوش و خُرّم رہتا تھا۔

میرے اُستادِ محترم اور دوست چارلس پرائیر نے اس بات کو معلوم کر لیا اور اُنہوں نے بڑی محبت سے میرے اس ارادے کی حمایت کی کہ میں مخصوص ہو کر کالج مشن میں غریبوں میں بشارت کی خدمت کو سرانجام دُوں اور کیمبرج میں کام کرنے کے لئے میری مخصوصیت نہ ہو۔ اُنہوں نے یہ چیز معلوم کر لی تھی کہ میرے لئے یہ ضروری ہے کہ میں تھوڑی مدت تک یُونیورسٹی سے بالکل جدا ہو جاؤں تاکہ مجھے عملی زندگی کے ٹھوس حقائق کا علم ہو جائے چنانچہ میں مسکینوں کی دُنیا میں رہنے لگا۔

اس خاص مقصد کو مدِ نظر رکھتے ہُوئے اور کالج مشن کے لئے ضروری تیاری کی خاطر مسٹر چارلس پرائیر نے انگلستان کے شمال میں ایک بہت ہی افلاس زدہ علاقے کا انتخاب کیا۔ اس جگہ آب و ہوا بے حد سرد ہے۔ اس علاقے کے مرد اور عورتیں اور چھوٹے بچے بڑی مصیبتوں کا سامنا کر رہے تھے۔ میں اپنی پُرسکون زندگی میں ایسی مشکلات سے کبھی دو چار نہیں ہُوا تھا۔ اس لئے میں ۱۸۹۵ء کے موسم خزاں میں تھوڑی دیر کے لئے یُونیورسٹی کو چھوڑ کر ایک بے مین کارندے یعنی مبشّرِ انجیل کی حیثیت سے ڈرہم کے مستقفی حلقہ میں پہنچا۔ مسٹر بیسل کے والد محترم اس حلقہ کے بشپ تھے۔

مسٹر پرائر نے میرے رہنے کے لئے جو گھر منتخب کیا تھا وہ بڑا شاندار تھا۔ اس معاملہ میں بھی اُنہوں نے بڑی احتیاط کا ثبوت دیا تھا۔ ریائے وئیر کے دہانے پر ایک بندرگاہ کے پاس میرا پیرش تھا۔ اس کا نام سینٹ پیٹرز منک وئیر ماؤتھ تھا۔ اس جگہ جو گرجا تھا وہ سیکسن کے زمانے سے بھی پیشتر کا تھا۔ یہاں جو رہ و بار تھی وہاں کسی زمانے میں ایک بیرونی خانقاہ کی مقدس عبادت گاہ تھی۔ یہ خانقاہ ایک راس پر تعمیر کی گئی تھی جو شمالی سمندر سے ناروے کے رُخ کو تھی۔ کئی صدیوں سے یہ مقام بڑا ہی شاندار تھا۔ ہر قسم کے جہاز دریا کے بالائی حصّوں کی طرف جاتے ہُوئے اس کے پاس سے گُزرا کرتے تھے۔ یہ جہاز طُوفانی سمندر سے پناہ کی خاطر دریا میں کسی محفوظ مقام پر لنگر انداز ہوا کرتے تھے۔ گزشتہ زمانہ میں کئی مرتبہ یہ خانقاہ آگ سے جل کر راکھ ہو گئی اور پھر تعمیر کی گئی۔ اس خانقاہ نے کئی طُوفانوں کا مقابلہ بھی کیا تھا اور بڑی پامردی سے سمندر میں کھڑی تھی۔ اس طرح سے یہ خانقاہ چرچ آف انگلینڈ کی عظمت کا نشان تھا۔

موجُودہ زمانے میں یہ پیرش جہاز سازی کے لئے مشہور ہے۔ صبح سے شام تک کل پُرزوں کے بنانے کی آواز آتی رہتی ہے۔ جہاز سازی کا کام بڑا ہی محنت طلب ہے لیکن ہفتہ بھر کی اُجرت بہت ہی قلیل ہے۔ ڈرہم کے مزدور بے حد سخت زندگی بسر کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود اُن کی بڑی مشکل سے بسر اوقات ہوتی ہے۔ غربت اور بھوک عام

WEAR ؎۱ ST. PETERS MONKWEAR MOUTH ؎۲ PARISH ؎۳

ہے۔ اُن کے پاس تن ڈھانپنے کو کپڑا نہیں ہوتا۔ اور اُن کے ننگے دھڑنگے مریل سے زرد زرد بچے اِدھر اُدھر پھرتے رہتے تھے۔ اُن کا کوئی پُرسانِ حال نہیں تھا۔

اس پیرش میں جانے سے پیشتر میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ خداوند مسیح کے اس سُنہری اُصول پر عمل کروں گا کہ اپنے پڑوسی سے اپنی مانند محبت رکھ، اس لئے میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ میرا رہنے سہنے کا معیار وہی ہو جو ان مزدوروں کا ہے کیونکہ وُہی میرے ساتھی تھے۔ اس پیرش کے پادری صاحب نے ازراہِ کرم مجھے ایک کمرہ دے دیا تھا جس سے مجھے بڑا ہی فائدہ ہُوا اور مجھے کرایہ نہ دینا پڑا۔ میں نے دس شلنگ میں ایک ہفتہ تک اپنی خوراک اور دُوسری ضروریات کو پُورا کرنے کا اہتمام کر لیا۔ چونکہ میں نے سادہ اور غریبانہ زندگی بسر کرنی شروع کر دی تھی اس لئے مجھے کبھی کبھی بھُوک ستایا کرتی تھی۔ مجھے اچھی طرح سے علم تھا کہ کھانا کھانے کے بغیر رہنے کا کیا مطلب ہے لیکن اس سادگی میں مجھے بڑی خوشی حاصل ہوتی تھی کیونکہ خداوند مسیح کی پیروی کرنے کا یہ اچھا طریقہ تھا۔

پیرش کے پادری صاحب بڑے فراخ دِل تھے۔ وُہ اعلیٰ پایہ کے عالم و فاضل بھی تھے۔ وُہ تیس سال سے اس پیرش میں خدمت کر رہے تھے اور سب غریب لوگ اُن کی مسیحیانہ زندگی کی وجہ سے اُنہیں بہت پیار کرتے تھے۔ وُہ مسٹر پاٹر کے گہرے دوست تھے اور اُن کے سائنڈ کالج

میں پڑھا کرتے تھے اور اُس وقت سے لے کر اب تک اُن میں گہرے مراسم تھے اس لیئے اُنہوں نے پہلے ہی دن سے کچھ تو مسٹر پارٹر کی خاطر اور کچھ میری خاطر مجھے ہاتھوں ہاتھ اُٹھا لیا۔

سنڈرلینڈ میں یک واقعہ ہُوا جو اس کتاب میں درج کرنے کے قابل ہے۔ منک ویرماؤتھ کے ہیرش چرچ کا بہرا (دربان) جان جابلنگ ایک لحیم و شحیم شخص تھا۔ اس سے پیشتر وُہ تمام مذاہب کا تمسخر اُڑایا کرتا تھا اور شراب پینے میں بدنام تھا۔ اس کے علاوہ وُہ علاقے بھر میں شرط لگانے کے باعث اور اپنی جسمانی طاقت کی وجہ سے بڑا مشہور تھا۔

یہ ایک حادثہ ہی ہے کہ وُہ ایک شام گرجا میں ایک سوشل اجتماع میں آگیا۔ وُہ شراب میں مست تھا۔ اُس نے سنڈے اسکول کی ایک معزز خاتون کی بے عزتی کی۔ اس پر گرجا کے نائب پادری نے آگے بڑھ کر اُسے ایسے زور سے تھپیڑ رسید کیا کہ وُہ زمین پر اوندھے مُنہ گرا۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو نائب پادری یعنی ایک مذہبی اور صُلح کُن شخص کا یہ فعل قابلِ گرفت ہوتا کہ اُس نے متشددانہ رویّہ اختیار کیا ہے لیکن ہُوا یہ کہ جان فوراً زمین پر سے اُٹھ بیٹھا اور اُس کا نشہ اُتر گیا اور اُس دن سے وُہ باقاعدہ گرجے میں حاضر ہونے لگا۔ وُہ ایک نیا انسان بن گیا اور اُس نے اپنا تن اور من خداوند مسیح کی خدمت کے لیئے وقف کر دیا۔

۱۸۹۵ء میں جب میری اُس سے ملاقات ہُوئی تو اتنے سالوں

لے SUNDER LAND سے JOHN JOBLING.

کی آزمائشوں اور تگ و دو کی وجہ سے اُس کا ایمان خُداوند مسیح پر پختہ ہو چُکا تھا اب خواہ اُسے کتنا ہی مشتعل کیوں نہ کیا جاتا، وُہ بڑی خاموشی سے اپنی توہین برداشت کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ وُہ کبھی غصّے میں نہیں آتا اور دُوسروں کے لئے اُس کے دِل میں بڑی محبّت تھی۔ جب سے اُس کی تبدیلی ہُوئی تھی اُس نے شراب کو بھی ترک کر دیا تھا۔ ہماری دوستی کو ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہُوا تھا کہ جان ہجابلنگ نے خود اپنی اچانک تبدیلی کا ماجرا مجھے بتایا اور ابھی تک اُس کے رُوحانی اثرات مجھ میں ہیں۔ اُس کی کہانی اُس اندھے کی طرح تھی جس کا ذِکر یُوحنّا رسُول کی انجیل میں موجُود ہے۔ خُداوند مسیح نے اُسے بینا کر دیا تھا۔ اُس کی کہانی اُس اندھے کی کہانی کی مانند تھی جس نے یہ کہا تھا کہ مَیں "ایک بات جانتا ہُوں کہ پہلے مَیں اندھا تھا اب دیکھتا ہُوں"۔

مُقدّس یُوحنّا رسُول کے الفاظ کا اطلاق جان ہجابلنگ پر حرف بحرف ہُوا۔ وُہ بڑی حلیمی سے مجھے بتایا کرتا تھا کہ خُداوند مسیح نے میرے لئے بڑے کام کئے ہیں۔ اُس نے مجھے تبدیل کر دیا ہے اور ایک نیا انسان بنا دیا ہے۔

مسز ویربا وُکنڈ کے پیرش میں ایک عمر رسیدہ بیوہ تھی۔ وُہ افلاس زدہ تھی۔ اُس کی زندگی بُھوک اور غربت میں گُذری تھی اور خُوشی اور سکُون سے نا آشنا تھی۔ وُہ سچّے دِل سے خُدا پر تو ایمان رکھتی تھی لیکن اُس کے ایمان نے اُسے وُہ باطنی روشنی عطا نہیں کی تھی جو رُوح

انسانی کو مکمل طور پر تبدیل کر دیتی ہے۔

مبارک جمعہ آیا۔ مَیں نے اس سے پہلی رات دعا میں گزاری۔ مَیں نے یہوواہ کی بیوفائی اور خداوند مسیح کے دکھوں کو یاد کیا۔ وُہ رات بڑی سہانی اور پُرسکون رات تھی۔ اب بھی مجھے یاد ہے کہ عید قیامت کا چاند بڑی آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ آسمان میں بادلوں کا نشان تک نہیں تھا۔ مبارک جمعہ کو تین گھنٹے کی عبادت کے بعد وُہ اپنا غم ہلکا کرنے کے لئے میرے پاس آئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسے کسی اندیکھی قوّت نے میرے پاس بھیجا ہے۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اُس کی رُوح کو معافی کا اطمینان میسّر نہیں ہو سکا حالانکہ اُس نے اس ضمن میں بڑی تگ و دو کی ہے۔ اُس نے خدا کی محبّت کی خاطر روزے بھی رکھے تھے لیکن اُس کے دِل میں شک اور خوف تھا جس کی وجہ سے وُہ الٰہی روشنی سے محرُوم تھی اور اُس کے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

میرے دِل میں صلیب کی کہانی تھی۔ پس مَیں نے اُسے بڑی سادگی سے کہا کہ "جب خداوند مسیح نے صلیب سے وُہ سات کلمے کہے اور کہا تھا "کہ پُورا ہُوا" تو کیا اُس نے تمہارے اور میرے گناہوں کا خاتمہ نہیں کر دیا تھا؟ میری آواز میں ایسا اثر تھا کہ اُسے معافی کی خوشخبری کی سمجھ آگئی۔

مَیں تاحیات یہ بھُول نہیں سکتا کہ جب اُس نے میری باتوں کو سُنا تو اُس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک آگئی اور اُس نے میری

طرف غور سے دیکھا۔ یہ الٰہی محبت کا ایک معجزہ تھا کہ ایک نہایت ہی کمزور
آدمی کے وسیلے سے ایسا ہوا۔ اُس لمحہ سے اُس کی زندگی میں تبدیلی آ گئی
اور وہ خوشی سے لبریز ہو گئی۔ اُس نے خداوند مسیح کو دیکھ لیا تھا۔

مَیں نے کیمبرج میں کالج کے آخری دو سالوں میں کفارے کے عقیدے
کا خاص طور پر مطالعہ کیا اور اس پر ایک مقالہ بھی لکھا۔ لیکن جب ہمارا
سامنا براہ راست انسانی رُوح کی ان آرزوؤں سے ہوتا ہے تو صرف
محبت ہی ایک ایسی قُوّت ہے جو شخصی طریق سے محبت کا جواب محبت
سے حاصل کرتی ہے اور اس قابل ہوتی ہے کہ وہ فضل کے معجزہ کو
عملی صُورت میں لائے۔

اگرچہ انگلینڈ میں قیام کے دوران ذہنی تجربہ کے فقدان کی وجہ
سے مَیں اپنے دل میں اس الٰہی صداقت سے بے خبر رہا تو مَیں مجبور تھا کیونکہ
ان افلاس زدہ جھونپڑوں کے گھروں میں دُکھ اور تنگ و غربت کے
سوا اور کیا تھا۔ صرف آگ ہی آگ جلا سکتی ہے۔ انگلستان کے شمالی
علاقہ میں منک ویرماؤتھ میں مجھے ایک [illegible] پاکیزہ خوشی حاصل
تھی۔ وہ گرجا کی عمارت جہاں ہم ہر روز عبادت کیا کرتے تھے اُس
پرانی خانقاہ کا راہب خانہ تھی جس کا مَیں نے ذکر کیا ہے۔ یہی وجہ
ہے کہ اس جگہ کو منک ویرماؤتھ کہا جاتا تھا۔ [illegible] خانقاہ [illegible]
چودہ سو سال کی روایات وابستہ تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ بشپ بینیڈکٹ[1]
ڈیکن جیمس[2] اور مقدس ماب بیڈ[3] اسی جگہ عبادت کیا کرتے تھے۔ اس کے

۱۔ BENEDIC. ۲۔ DEACON JAMES. ۳۔ VENERABLE BEDE

پتھر ابھی تک اُسی جگہ ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ پتھر بھی خدا کی حمد و ثنا میں محو رہتے ہیں۔

مجھے میرے بچپن کے زمانہ میں مذہب کے متعلق جو مذہبی تعلیم میرے والدین نے مجھے دی تھی وہ تمام تر آئندہ زندگی کے متعلق تھی اور خداوند مسیح کی آمدِ ثانی کا خیال باقی تمام باتوں پر حاوی تھا۔ یہ سچ ہے کہ نیا عہدنامہ پرانے زمانہ کی خوبصورت باتوں سے لبریز ہے۔ جب میری والدہ محترمہ مجھے کہانیاں سنایا کرتی تھیں تو نئے عہدنامہ کے اوراق مجھے حقیقت سے جنّی نظر آیا کرتے تھے۔ بچپن میں مجھے ایک اور کتاب بے حد پسند تھی جس کا نام "الدین بونش لائن" ہے۔ اس کے مطالعہ سے مجھے بڑی خوشی حاصل ہوتی تھی۔ میں اسے بار بار پڑھا کرتا تھا اور یہ کتاب مجھے زبانی یاد ہو گئی تھی۔ لیکن اس ابتدائی زمانہ میں مجھے تواریخی کلیسیا اور مقدسوں کی شراکت کا کوئی علم نہ تھا۔ اور مجھے غیر واضح طور پر معلوم تھا کہ مسیحی ایمان کے لئے یہ چیز کتنی اہم ہے۔

پیرمنگ وید باؤکنڈ میں بھی کھاڑی میں تھا جہاں کئی زمانوں سے مقدسین عبادت میں دو زانو ہوا کرتے تھے۔ جب سمندر میں طوفان برپا ہوتے تھے تو جہاز پناہ لینے کے لئے یہاں آ جاتے تھے۔ چٹان پر روشنی جلائی جاتی تھی جو جہازوں کی رہنمائی کیا کرتی تھی۔ راہب اسی جگہ دعائیں کیا کرتے تھے۔ ڈینش حملہ آوروں نے ساحل کو تاخت و تاراج کیا تھا لیکن وہ مسیحی ایمان کو کوئی گزند نہ پہنچا سکے۔ اس جگہ بے شمار تبدیلیاں

ہُوئی تھیں لیکن خُداوند مسیح آج، کل اور ہمیشہ یکساں ہی ہے۔

اس زمانہ کی یاد ابھی تک میرے دِل میں تازہ ہے۔ مَیں دِل کی آنکھوں سے اُس جگہ کا نظارہ کر سکتا ہُوں۔ یہ نظارہ لافانی ہے۔ یہ جمالیاتی احساس کا کوئی مصنوعی محرّک نہیں ہے جو اِن واحد میں نظروں سے اوجھل ہو سکتا ہے اور دُنیا کی دُوسری چیزیں اُسے دبا کر یاد سے محو کر سکتی ہیں۔ اس کے برعکس یہ رُوح کی ایک گہری حقیقت تھی جس نے میری زندگی میں انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

اسی طرح سے میرے آرڈی نیشن سے پہلے ہی میرے دِل میں کلیسیائے انگلستان کے لئے بڑی محبت تھی۔ اس کی روایات بڑی پُرانی ہیں میری محبت ہمیشہ ایسی ہی ہے جسے میرے دِل سے کوئی نہیں لے جا سکتا لیکن اگر اس کے بعد مَیں نے کئی باتوں کے خلاف بغاوت کی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میری محبت میں کمی آگئی ہے یا میرا یقین متزلزل ہو گیا ہے بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ مشرقی ممالک میں کئی سالوں تک زندگی گزارنے کے بعد بھی مَیں اپنے وطنِ عزیز کی طرزِ زندگی اور طریقۂ عبادت کو پسند کرتا ہوں۔

اب مَیں کلیسیا کا پاسبان بن گیا ہوں۔ مجھے توقع ہے کہ مَیں ہمپ وِک کالج مشن واقع محمد میں غریبوں میں بشارت کی خدمت سرانجام دُوں گا۔ میرے اُستادِ محترم بشپ رلسن آرامر نے میرے لئے یہ ایک انتظام بڑی احتیاط سے کر رکھا تھا۔ مجھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ میں

روزمرہ کے عام کام میں غریبوں، بوڑھوں اور بچوں میں خداوند مسیح کو تلاش کر لیا تھا۔

میرے دل میں سنک ویرا کے زمانہ کی ایک اور حقیقت یاد آتی ہے۔ مجھے شادی خانہ آبادی کی خوشی نصیب نہیں ہوئی۔ چونکہ میں شادی کی ان نعمتوں سے محروم رہا ہوں اس لئے میرے دکھ کا اندازہ محال ہے لیکن جو زندگی مجھے اختیار کرنی پڑی اُس میں بیوی بچوں کو اپنے پاس رکھنا میرے لئے ناممکن تھا۔ میں تو بے گھر بے در ادھر اُدھر سیاحوں کی طرح پھرتا رہا ہوں۔ اس لئے میرے لئے اشد ضروری ہے کہ میں کسی اور ڈھنگ سے اپنی زندگی بسر کروں جس سے [illegible] پیدا ہو سکے۔ لیکن اگرچہ میں اس خاندانی خوشی سے محروم رہا ہوں جو شادی سے حاصل ہو سکتی ہے تاہم میں اپنے کردار کی نفاست کی تعمیر میں صنف نازک کا مرہون منت ہوں۔ میں نے اپنے دل میں خداوند مسیح کی مرضی دیکھی ہے۔ میری یہ رویا کسی خاتون کے سچے ایمان کی قوت سے [illegible] ختم ہو جاتی کیونکہ جب میں اپنے ماضی کی پہنائیوں میں نگاہ دوڑاتا ہوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ اس ضمن میں میری والدہ محترمہ کا مجھ پر بہت زیادہ اثر ہے۔

انگلستان کے شمالی علاقہ کے قیام کے دوران میں میرے دل میں ایک اولوالعزم نازک اندام خاتون کے لئے بڑا احترام تھا۔ وہ میرے عزیز دوست باسل ولیم کی ہمشیرہ تھیں۔ وہ اپنے بچپن سے ہی صاحب فراش تھیں یعنی وہ چارپائی پر ہی پڑی رہتی تھیں۔ اس فانی دنیا میں اب اُن کی مصیبتوں کا

ختم ہونے کو تھا۔ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھیں اور اس وقت کی
منتظر تھی کہ کب وہ اس دنیا سے خوشی خوشی رخصت ہوں۔ وہ بشری طور
پر [illegible] تھیں۔ انہوں نے اپنے رنج کو راحت میں تبدیل کر لیا
تھا۔ ان کا چہرہ بڑا ہی حسین تھا اور اس پر گویا آسمانی نور تھا۔ وہ اپنی شکل و
صورت میں مقدسہ نظر آتی تھیں۔ جب کبھی مجھے ان سے ملنے کی سعادت نصیب
ہوتی تو وہ تکیوں کے سہارے اپنے پلنگ پر بیٹھی ہوتیں۔ ان کو دیکھ کر میں یہ
محسوس کرتا تھا کہ میں خداوند مسیح کی حضوری میں پہنچ گیا ہوں۔ وہ دل و جان سے
اپنے روحانی بیٹے کو پیار کرتیں اور رات دن اس کے لئے دعا کیا کرتی تھیں۔

چونکہ میں بھی ان سے بے حد محبت کرتا تھا اس لئے وہ اپنی
روزمرہ کی دعاؤں میں مجھے بھی یاد رکھتی تھیں۔ وہ اپنے نازک ہاتھوں سے مجھے
خط بھی لکھا کرتی تھیں اور میں انہیں بار بار پڑھا کرتا تھا۔ وہ ہر خط کے اوپر
کیبل کے مسیحی سال[1] سے آیات لکھ دیا کرتی تھیں۔ میری زندگی کے نشیب و
فراز کے وقت انہوں نے مجھے جو خط لکھا ہے۔ مرتے دم تک وہ مجھے باقاعدہ
خط لکھتی رہی ہیں۔ میں ان خطوط کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا کرتا تھا۔
وہ خداوند مسیح سے بہت پیار کرتی تھیں اور اسی محبت سے وہ اپنے دکھ درد
کو برداشت کرنے کے قابل تھیں۔ ان کو دیکھ کر خداوند مسیح کے لئے میری محبت
اور مضبوط ہو گئی۔

وہ کلیسیائی کیلنڈر کو دیکھ کر مسیحی تہواروں کا اہتمام کرتی تھیں۔ ان موقعوں
پر اگر ممکن ہوتا تو وہ پاک عشا میں بھی شریک ہوتی تھیں لیکن اگر وہ اس سیکرامنٹ

لے KEBLE'S CHRISTIAN YEAR.

میں شرکت نہ کرسکتیں تو وہ نہ، نہ مسیح سے روحانی شرائط کے رشتہ کو اُستوار کرتیں ہیں سے، اُن کی زندگی میں اس چیز کی خوبصورتی کو دیکھا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی بڑی ہی نفاست پسند اور محتاط تھیں۔ وہ پھولوں جو اُن کے پلنگ کے پاس پھولدان میں رکھے جاتے، اُن کو سجانے میں بڑی دلچسپی لیا کرتی تھیں۔ اپنی دُعا کی کتاب میں اُنہوں نے اپنے نازک ہاتھوں سے خوبصورت نشانیاں لگا رکھی تھیں۔ اپنے کمرے کو سجانے اور اپنی چیزوں کو قرینے سے رکھنے میں وہ بڑے سلیقے کا ثبوت دیا کرتی تھیں۔ وہ کمرے کو اس طرح رکھتی تھیں کہ سورج کی کرنیں اُس میں بلا روک ٹوک داخل ہو سکتی تھیں۔ اُنہیں ہر ایک ننھی اور نازک چیز سے اُنس تھا۔ اُن کے تین بھائی ہندوستان میں تھے اس لئے اُن کا دل انگلستان کی بجائے ہندوستان میں اپنے بھائیوں کے ساتھ تھا۔ جب آخر کار بیل بھی اپنے بھائیوں کے پاس چلا آیا تو اُن کے بیٹوں کا یہ دیس اب اُن کے خیالات کی بیدار دُنیا میں ہر وقت رہنے لگا۔ وہ ہندوستان کی خواتین کو بے حد سراہتی تھیں۔ میں نے اکثر اوقات اس کے بعد کے زمانہ میں اُن کو یاد کیا ہے اور اُن کا نازک ساحسین چہرہ میری آنکھوں کے سامنے اُبھر آتا ہے۔ اس تجربہ نے مجھے سرزمین مشرق کی خواتین کے باطنی حسن کو سراہنے کے قابل بنا دیا ہے۔

یہ خاتون محترم کیتھولک کلیسیا کو بڑا پسند کرتی تھیں کیونکہ اس میں ولیوں اور شہیدوں کی وافر تعداد موجود ہے۔ وہ اپنی ہر روز کی دُعاؤں میں مشرق کی کلیسیاؤں کو بھی یاد کیا کرتی تھیں، لیکن سب سے زیادہ وہ ہندوستان

اَور چین کو یاد کرتی تھیں۔ وُہ کمرہ جس میں وُہ صاحبِ فراش تھیں اَور جس سے وُہ دائم المریض ہونے کی وجہ سے کبھی باہر نہیں نکلی تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس میں ساری دُنیا موجُود ہے۔ اُن کے پاس رہ کر ساری دُنیا کے منظر نظر آتے تھے۔ علاوہ ازیں اُن کی باتوں اَور اُن کی زندگی کی ہر روش سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُنہیں ساری دُنیا سے والہانہ محبّت ہے۔ اُن کے کمرہ میں سب کُچھ مَوجُود ہے۔

جِتنا عرصہ مَیں مُلک کے اِس شمالی حصّہ میں رہا مُجھے خُداوند مسیح کی یہ تصویر کہ وُہ ابنِ آدم ہے، حقیقی طور پر نظر آتی رہی اَور مَیں ذاتی طور پر اُس کی محبّت میں سرشار رہا۔ جُوں جُوں تاریخِ انسانی اپنی ارتقائی منازل طے کرتی رہی تُوں تُوں خُداوند مسیح کے قدموں کے نقُوش ہر زمانہ اَور ہر مُلک میں نظر آنے لگے۔ خُداوند مسیح نہ صرف میری زندگی کو ایک مخصُوص سانچے میں ڈھال رہا تھا بلکہ وُہ میرے اُن حالات کو بھی تبدیل کر رہا تھا جن میں رہ کر مَیں ایسے مقام پر پہنچ رہا تھا جس کی مُجھے تمنّا تھی۔ میرے اپنے مُلک کے ولی اَور مُقدّسین مثلاً کولمبا[۱] اَور ایڈن[۲]۔ بیڈ[۳] اَور ہلڈا[۴]۔ ہیو[۵] آف لنکن۔ ناروچ کی مدر جُولین[۶]۔ وِکلِف[۷] اَور رِڈلے[۸]۔ جارج فوکس[۹] اَور جان ویزلی[۱۰]۔ کیبل[۱۱] اَور جوزیفین[۱۲] اَور بٹلر[۱۳] کی ایسی جماعت تھی جنہوں نے خُداوند مسیح کی خاطر زندگی بسر کی اَور پھر اُسی میں مر گئے۔ اُنہوں نے خُداوند مسیح کی خاطر دُکھ

---

[۱] COLUMBA [۲] AIDAN [۳] BEDE [۴] HILDA [۵] HUGH OF LINCOLN [۶] MOTHER JULIAN OF NORWITCH. [۷] WYCLIFF [۸] RIDLEY [۹] GEORGE FOX [۱۰] JOHN WESLEY [۱۱] KEBLE [۱۲] JOSEPHINE [۱۳] BUTLER.

اُٹھانے کو خُوشی سمجھا۔ اُنھوں نے اُس کی خاطر صلیب اُٹھائی۔ مَیں پولُس رسُول کے الفاظ دُہراتا ہُوں۔

"یہ سب کُچھ میرا ہے اَور مَیں مسیح کا اَور مسیح خُدا کا۔"

ممکن تھا۔ کالج کے زیرِ تعلیم طلبہ ہمارے پاس آکر ہمارے روزمرہ کے
کام میں ہمارا ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔ وہ ہمارے کھیل تماشوں میں بھی شریک
ہوا کرتے تھے۔ بعض اوقات پندرہ پندرہ طالب علم ہمارے گھر میں آ
جایا کرتے تھے۔ سونے کے کمروں میں کوئی گنجائش نہیں رہتی تھی۔ اکثر
ہمیں کیمپ کی چارپائیوں کی ضرورت پڑ جاتی تھی۔ میں نے ریورنڈ جے۔ پی۔
بی اور مسز ہیسن سے بچا رکھا تھا۔ وہ میرے ساتھ بڑی مہربانی
سے پیش آیا کرتے تھے۔ شب و روز کی محنت شاقہ کی وجہ سے ان
کی صحت بہت ہی خراب ہو گئی تھی تب سے جب وہ بشارت کی
خدمت کو جاری رکھنے سے معذور تھے۔

دالورنفہ میں زندگی بڑے مزے سے گزر رہی تھی۔ یہیں انسانی زندگی
کے بعض بنیادی اصولوں سے سابقہ پڑتا تھا۔ اس جگہ زندگی تمام تکلفات
سے پاک تھی۔ ہمارے چاروں طرف ایسی مخلوق رہتی تھی جو زندگی کی
ضروریات پوری کرنے کی غرض سے شب و روز محنت کی صعوبتیں برداشت
کرتی تھی۔ اپنی بھوک کو مٹانے کی خاطر وہ بیچارے ہر کام کو کرنے کے
لئے تیار رہتے تھے اور جہاں تک ہم سے ممکن تھا ہم اُن کی مذکورہ تکالیف
میں برابر کے شریک رہتے تھے۔ اس قسم کے لوگوں کی خدمت کرنے اور اُن
سے محبت کا برتاؤ کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی کیونکہ وہ محبت
کا جواب بڑی والہانہ محبت سے دیتے تھے۔ کئی بار سنگ دل سے
سنگ دل انسان بھی پسیج جاتے تھے۔

ہماری مشن کی عمارت کوئی معمولی گرجا نہ تھا بلکہ یہ عمارت اِرد گرد کے تمام علاقے کے لیے ایک مرکزی گھر تھا، جسے ہر ایک اپنا گھر سمجھتا تھا۔ یہ جگہ ایسی عام تھی کہ مسز پرچرڈ صاحبہ جو یہاں کی مہتمم تھیں، اس عمارت کے ایک کونے میں قیام پذیر تھیں وہ بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کی آمد و رفت سے بالکل نہیں گھبراتی تھیں۔ یہ لوگ یا تو اپنی ضروریات کو پورا کرنے کی خاطر آتے یا سلسلہ وار اُن کے باورچی خانہ میں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔ مسز پرچرڈ صاحبہ کو ہر روز یہ تکلیف اٹھانا پڑتی تھی۔ صبح سے لے کر شام تک لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ اتوار کو بھی یہی حال تھا۔ اُن کے ایمان کی سادگی اور بصیرت نے میرے ایمان کو ترو تازہ کر دیا تھا۔ میرے دل میں خداوند یسوع کی محبت کی شمع جگمگانے لگی۔ جب اس نیک دل خاتون کا انتقال ہو گیا تو اس علاقے کے جوان اور بوڑھے ایسا محسوس کرنے لگے کہ گویا اُن کی مادرِ مہربان کا سایہ اُن کے سر سے اُٹھ گیا ہے۔

مشن کے گرجا اور کلب کو ارکانِ زیادہ تر بچے آیا کرتے تھے۔ انھیں عبادت کے وقت تو گرجا کا بڑا احترام ملحوظِ خاطر رہتا تھا لیکن دوسرے اوقات میں گرجا کے اس حصہ کو جہاں پادری کھڑا ہو کر عبادت میں رہنمائی کرتے ہے پردے کے ذریعہ علیحدہ کر دیا جاتا تھا اور گرجے کا باقیماندہ حصہ کلب میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ اس میں تمام قسم کی کھیلیں کھیلی جاتی تھیں۔ کھلاڑی مکے بازی کا کھیل بھی کھیلا کرتے تھے۔

ہر ہفتہ کے خاتمہ پر شام کے وقت پانچ بجے سے آدھی رات تک

کلب کے کمرہ میں گہما گہمی رہتی تھی۔ پہلے لڑکے اور لڑکیاں جانگلی قسم کے
کھیل کھیلا کرتے تھے۔ بعد میں بڑوں کی باری آتی تھی۔ یہ لوگ اپنے دن
بھر کے کاموں سے تھکے ہارے جلتی ہوئی آگ کے گرد بیٹھ کر تمباکو نوشی
کیا کرتے تھے۔ تمباکو کی بو تمام کلب گھر میں پھیل جاتی اور دھوئیں سے
ہوا اتنی کثیف ہو جاتی کہ اس میں سانس لینا محال ہو جاتا تھا۔ ہر سال
ہم ایک دن کے لیے پیمبروک کالج کیمبرج میں جایا کرتے تھے۔ کالج ہال
میں متعلقین ہماری ہر طرح سے خاطر تواضع کیا کرتے تھے۔ سہ پہر کو کرکٹ
کا مزیدار کھیل ہوتا تھا۔ شام کو رنگا رنگ کا پروگرام ہوتا اور آدھی رات کے
بعد کلب کے شرکا پھر والورتھ میں واپس لوٹ آتے تھے۔

اس کلب میں عورتیں سہ پہر کو کلب میں آیا کرتی تھیں۔ ان کی تعداد
مردوں سے زیادہ ہوتی تھی۔ ہر ہفتہ میں دو دن ان کے ادبی اجلاس منعقد ہوا کرتے تھے۔
مس لیٹی اور مس ولیٹ صاحبات ان کے اجلاس کی نگران تھیں۔
ایک صندوقچہ تھا، وہ ہر ہفتہ چندہ کے طور پر کچھ رقم ڈالتیں اور پھر اسی
رقم سے وہ بڑا لطف اٹھایا کرتی تھیں۔

ہم اپنے ماحول میں بے حد خوش و خرم رہتے تھے۔ یہ ایسا تھا کہ گویا کوئی
کسی بڑے سمندر میں غوطہ لگا کے، موجوں سے ہمکنار ہو اور پھر اس کی
رگوں میں خونِ زندگی دوڑنے لگے۔ مشکلات نے مکڑی کے جالے کی طرح
میرے دماغ کے گوشوں میں بڑی مدت سے اپنا قبضہ جما رکھا تھا۔ آہستہ
آہستہ مشکلات کے یہ جالے ایسے غائب ہو گئے کہ مجھے علم تک بھی نہیں ہوا۔

سے تھے ، مجھ میں ہچکچاہٹ پیدا کر دیتی تھیں ۔ اِن دفعات میں ایسی باتیں
بھی تھیں جن پر مَیں بغیر سوچے سمجھے دستخط نہیں کرسکتا تھا لیکن ناچار یہ فیصلہ
کرنے سے قاصر تھا کہ اگر مَیں دستخط کر دُوں تو کہاں تک وُہ تفصیلات پُوری
کر دُوں گا اَور کہاں تک یہ عام معانی میں دستخط کرنا ہی ہے اَور اسی کی ہی
ضرورت ہے ۔ میرے دِل میں یقین تھا کہ یہ خُدا کی مرضی ہے کہ مَیں غُربا
و مساکین میں کام کروں ، اس لئے میں دُعائے عام کی کتاب میں لکھی ہُوئی
مذہبی شرائط کو پُورا کرنے پر رضامند نہیں ہوتا تھا ۔ آخرکار مَیں نے اِن
دفعات پر اپنے دستخط ثبت کر دیئے ۔ لیکن مَیں ہر ایک شق کو قبُول کرنے
کے لئے تیار نہ تھا ۔ ابھی تک میرے دِل میں شُبہات تھے اَور یہ شُبہات
کبھی کم نہیں ہُوئے بلکہ جُوں جُوں وقت گُزرتا گیا یہ شُبہات بڑھتے ہی چلے گئے ۔
مجھے اپنی آرڈی نیشن کی رسم کی عبادت یاد آ رہی ہے مَیں توبہ و استغفار
کے لئے گھٹنے ٹیک کر دُعا میں مشغُول تو تھا لیکن میرے دِل میں طرح طرح
کے شکُوک تھے ۔ غالباً یہ سب کچھ میرے ایمان کی کمزوری کی وجہ سے
تھا ۔ عبادت کے دوران جب یہ گیت گایا گیا " اُس کے پاؤں پہاڑوں
پہ کیا ہی خُوش نما ہیں ، جو خوشخبری لاتا ہے اَور سلامتی کی منادی کرتا ہے
اَور خیریت کی خبر اَور نجات کا اشتہار دیتا ہے " تو مَیں بلندیوں پہ پرواز
کرنے لگا ۔ میری تقدیس کے لئے دُعائیں مانگی گئیں اَور مجھے اِس بات
سے نہایت خوشی ہُوئی کہ مَیں خُداوند مسیح کی خدمت کے لئے مخصُوص
ہُوا ہُوں اَور وُہی میرا مالک اَور خُداوند ہے ۔ اُس کے مقدس نام

کی بدولت مجھے تمام خطروں سے رہائی نصیب ہوئی۔ میں نے اپنے تن من اور رُوح کو اُس کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔

کالج مشن کی خدمت کے دوران یہ خوشی میرے شامل حال رہی۔ میں اپنے کام میں بے حد مگن رہتا تھا۔ میرے تمام خدشات دُور ہو گئے اور مجھے پُورے دل سے خداوند مسیح کی خدمت کرنے کی توفیق میسر ہوئی۔

مشن کے اس علاقہ میں جہاں میں بشارت کی خدمت سرانجام دیا کرتا تھا، ایک عورت تھی جسے میں اچھی طرح سے جانتا تھا۔ وہ شراب پینے کی عادی تھی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ پچھلے تیس سال کے عرصہ میں وہ متواتر شراب پیتی رہی۔ وہ شراب کی ایسی عادی تھی کہ اس کا علاج ناممکن تھا۔ ایک دن عبادت کے بعد وہ آگے آئی اور اُس نے اپنے آپ کو مسیح کے سامنے پیش کر دیا لیکن وہ نشہ میں نیم مدہوش تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ اس حالت میں اُس سے کوئی وعدہ لینا ٹھیک نہیں ہے لیکن مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے کہ خدا کا فضل گرے ہوؤں میں اپنی معجزانہ قوتوں کو ظاہر کرے۔ میں اُس کے ساتھ گھٹنے ٹیک کر دُعا کرنے لگا اور اُس نے خلوص دل سے یہ عہد کیا کہ وہ نئی زندگی بسر کرنے کی کوشش کرے گی۔ میں نے دُعا کے بعد اُس خاتون سے کہا کہ وہ اگلی صبح عبادت میں ضرور آئے۔ وہ اگلی صبح آئی۔ اب وہ نشے کی حالت میں نہ تھی بلکہ وہ تائب ہو چکی تھی اور اُس کا ایمان تازہ تھا۔ اُس نے بڑی کشمکش کا سامنا کیا اور آخر کار وہ ایک نئی مخلوق بن گئی۔ اس میں مقدسین کی رُوح پیدا ہو گئی اور اُس نے اپنی زندگی مسیح کی

خدمت کے لیے وقف کردی۔ خدا کے فضل کے وسیلہ سے وہ گناہ کی قید اور غلامی سے آزاد ہوگئی۔

جب انسان کو اس قسم کی خوشی حاصل ہوتی ہے تو اس کے شکوک اور خوف دور ہوجاتے ہیں۔ خداوند مسیح کی بخشش، خدا کی محبت اور پاک رُوح کی شراکت ہم میں موجود ہوتی ہے اور آزادی نجات کی یہ نشانیاں اُن تمام دفعات اور وعدوں سے بلند ہیں جنہیں انسانوں نے ترتیب دیا ہے۔

اگرچہ اب میرے تمام خدشات اور شبہات دُور ہوگئے تھے لیکن ابھی تک میرا ضمیر مطمئن نہ تھا۔ دو ایسے حوالہ جات تھے جن کو میں کلیسیا میں پڑھنے سے گریز کرتا تھا کیونکہ اُنہیں پڑھنے سے مجھے شرم محسوس ہوتی تھی۔ جب کبھی ممکن ہوتا میں ان حوالہ جات کو چھوڑ دیا کرتا تھا، لیکن ایسا کرتے وقت مجھے کوئی خوشی حاصل نہیں ہوتی تھی اور بعض اوقات مجھے مجبوراً وہ حوالہ جات بادلِ نخواستہ پڑھنے پڑتے تھے۔

ان میں سے ایک حوالہ مزامیر میں سے تھا۔ لعنت اور انتقام کے کئی مزامیر مہینے کے مختلف دنوں میں روزمرہ کی عبادت میں پڑھے جاتے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ زبور عبادت میں کسی نہ کسی جگہ پڑھے جائیں گے اس لیے میں اُنہیں دہرانے سے ڈرتا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس طرح کے کفر آمیز جملوں کو گرجے میں استعمال کرنا ٹھیک نہیں کیونکہ کلیسیا کا معیار تو پیار کی وعظ ہے اور اس کا سنہری حکم یہ ہے کہ اپنے پڑوسی

سے اپنی مانند محبت رکھ۔

میرے راستہ میں دوسری مشکل اتھانیسیئس کا عقیدہ تھا۔ اس عقیدے کے شروع میں کچھ لعنت آمیز جملے بھی آتے ہیں۔ مذہب کے ارکان میں تین عقائد میں سے ایک یہ ہے۔ کلیسیا اس عقیدے کو بھی مانتی ہے اور ان کا ماننا بھی ضروری ہے کیونکہ اس عقیدے کو کلامِ مقدس سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ اس عقیدے کے ماننے کے متعلق اپنی وجوہات کا اظہار کیا ہے کہ یہ عقیدہ حمد و ثنا کا کوئی نغمہ نہیں ہے۔ بلکہ رسمی طور پر اپنے ایمان کا اقرار کرتے ہیں۔ یہ دلیل مجھے اچھی طرح سے یاد تھی لیکن اس عقیدے کے شروع میں اس کے نہ ماننے والوں پر جو لعنت بھیجی گئی ہے اس کا بھونڈا پن اور اعتقادی تنگ نظری اس دلیل سے دور نہیں ہو سکتی تھی۔ میرے لئے یہ کہنا بڑا آسان تھا کہ تقدس مآب بشپ ویسٹ کاٹ صاحب بھی جو ایک مردِ خدا تھے اور میں ان کا بڑا احترام کرتا تھا، اس عقیدے کو تاریخی سمجھ کر پڑھا کرتے تھے لیکن اس سے میرا ضمیر مطمئن نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ غریب جن کا میں چوپان تھا بشپ صاحب کی طرح تاریخی باتوں کو سمجھنے کی تربیت سے بالکل بے بہرہ تھے۔

کانووکیشن کے کام کی یہ تفصیل نہایت ہی ضروری ہے۔ اس میں کچھ اچھی باتیں ہیں اور کچھ بری۔ اس میں تفکرات اور خوشی کے لمحات بھی ہیں۔ بعض اوقات مجھے غریب عوام میں خدمت کرنے سے بے حد خوشی ہوتی تھی۔ اس موقع پر مجھے اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار

لانا پڑتا تھا کیونکہ یہ کام خداوند مسیح کے جلال کے لئے کیا جا رہا تھا۔ میں
ہر صبح پاک عشاء کے وقت اِس محبت کی ضیافت میں شریک ہُوا کرتا تھا
لیکن کبھی کبھار شک و شُبہات کا وُہ پُرانا دَور لوٹ آتا تھا اور میں ساری
ساری رات اپنے بستر پر پڑا سوچتا رہتا تھا کہ کیا میں نے آرڈی نیشن میں
غلطی تو نہیں کی! اس سے میں کچھ خیالات کی دُنیا میں مستغرق ہو جاتا اور سوچنے
لگتا تھا کہ میں نے روحوں کو بچانے میں کیا کچھ کیا ہے۔ میں اپنے آپ کو اِس بات
پر بھی کوستا تھا کہ مجھ میں ایمان کی کمی ہے۔ حالانکہ خُدا مجھے بُلا رہا ہے کہ میں
زیادہ وفاداری سے اُس کی خدمت سرانجام دُوں لیکن اس کے برعکس میں
اُس کی آواز سُننے سے انکار کر رہا تھا۔

اِس سوچ بچار کا یہ نتیجہ نکلا کہ میرے نیم شعور میں اِس کا بہت زیادہ
اثر پڑا، اور نتیجہ یہ نکلا کہ میں مستقل طور پر روگی بن گیا۔ وُہ ڈاکٹر جو علاج کی
غرض سے مُجھے دیکھتے وُہ بڑے پریشان ہوتے۔ مجھ میں کسی بیماری کے آثار
تو نظر نہیں آتے تھے لیکن مُجھے ہلکا سا بخار رہتا تھا اور اس کے ساتھ ہی
مُجھے بے خوابی کی شکایت تھی۔

لندن کے بازاروں کی گہما گہمی اور ریل گاڑیوں کی آمد و رفت نے میری
صحت بحال نہیں ہونے دی بلکہ اس کے برعکس میری مُشکلات میں اضافہ
ہی ہوتا گیا۔

مُجھے کیمبرج میں درس و تدریس کی پیشکش کی گئی۔ قدرتی طور پر
میری یہی دلی تمنا تھی کہ میں غریبوں میں خدمت کرتا رہوں لیکن انہیں د

بھی قیمت پر چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھا۔ میں ایک مرتبہ یارک شائر میں مسٹر
اور مسز پرائر اور بشپ ویسٹ کاٹ کے ساتھ اپنی طویل چھٹیاں گزار
رہا تھا کہ مجھے یہ معلوم ہوا کہ صحت کبھی بحال نہیں ہو سکتی۔ ہر ایک کو یہ بات
بڑی اچھی طرح سے معلوم ہو گئی کہ میرا ڈاکٹر کے مشورہ پر عمل کرنا ورکاچ مشن
کو چھوڑ دینا لازمی ہے۔

مجھے کیمبرج میں آئے ہوئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ مسٹر پرائر
خود ناقابلِ علاج بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ ڈاکٹروں کی یہ تشخیص تھی کہ انہیں
سرطان ہے اور اُن کا اپریشن ناممکن ہے۔ آخر کار وہ فوت ہو گئے۔ میرے
لئے اُن کی موت کا غم سوہانِ روح تھا۔ اپنی زندگی میں مجھے اس قسم کا صدمہ
پہلی مرتبہ ہوا۔ اور مجھے اس غم کو برداشت کرنا ہی پڑا۔ زندگی کے آخری ایام
میں مسٹر پرائر کو معلوم ہو گیا تھا کہ اُن کا آخری وقت قریب ہے۔ اُن کی روح
خداوند مسیح کے نور سے اور بھی روشن نظر آنے لگی۔ انہوں نے بیماری کی تلخ
گھڑیاں بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کیں۔ اور مجھے دلوکھا کے غریب لوگوں
کے لئے ایک خاص پیغام دیا۔ انہوں نے فرمایا:-

"شاید تم اُن غریب لوگوں کو یہ باتیں بتا دو تاکہ انہیں اپنی علالت
کے دوران یہ باتیں راحت اور آرام دے سکیں۔ آخری غشی سے رہائی کے موقع
پر مجھے خداوند مسیح کا خیال آیا جو انگور کا حقیقی درخت ہے۔ اور خداوند مسیح کی
زندگی اُس کی شاخوں میں رواں دواں ہے۔ اگرچہ مجھے اس امر کا احساس تھا
کہ میں ایک حقیر ہوں لیکن مجھے اچھی طرح علم تھا کہ میں اُس حقیقی انگور کے درخت

میں ایک زندہ شاخ ہوں۔ اب جبکہ میں درد اور دُکھ برداشت کر رہا ہوں تو مجھے یہی خیال خوشی اور اطمینان دے رہا ہے۔ اور اگرچہ جسمانی انسان اِس دُنیا سے کُوچ کر رہا ہے لیکن باطنی انسان ہر روز نئی زندگی حاصل کر رہا ہے"۔

مسٹر پاٹر کا ایمان بڑا سادہ تھا۔ اُن کی اہلیہ محترمہ کو اِس ایمان نے رنج والم کے ایام میں بڑی تقویت دی تھی۔ وہ بھی اُن کے ساتھ موت پر فتح حاصل کرنے کے قابل ہو گئیں۔ اُن کے چار چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ جب ہم مرحوم کو دفن کرنے کے بعد قبرستان سے گھر واپس آئے تو اُنہوں نے اپنے بچوں کو اپنے پاس بُلایا اور اپنے پیارے شوہر کے دِل پسند گیت گانے لگیں۔ چارلس پاٹر کے لئے یہ بڑی اچھی بات تھی۔ مسز پاٹر جب گیت گا رہی تھیں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا میری اپنی ماں ہیں۔ جب میں بچوں کے ساتھ مل کر گیت گا رہا تھا تو میرے دل میں میرے اپنے بچپن کی یاد آنے لگی۔ لیکن ابھی تک مَیں نے اِن بچوں کی طرح کوئی صدمہ نہیں اُٹھایا تھا۔ مَیں اِن بچوں کو خلوصِ دل سے پیار کرتا تھا۔ میرے اپنے ماں باپ خُدا کی مہربانی سے ابھی صحیح و سلامت تھے۔ وہ بڑے عمر رسیدہ ہو کر فوت ہوئے تھے۔

میرے عزیز دوست بیسل ویسٹ کاٹ مشنری بن کر دہلی چلے آئے تھے۔ کالج کے زمانہ سے وہ میرے بڑے گہرے دوست تھے۔ اُن کی میرے ساتھ خط وکتابت رہتی تھی۔ وہ مجھے ہر ڈاک سے خط لکھا کرتے تھے۔ اور وہ اپنے ماحول کے متعلق مجھے بتایا کرتے تھے۔ اُن کا ایک ہندوستانی

مسیحی پروفیسر دوست تھا جس کا نام سوشیل کمار رُودرا تھا۔ وہ سینٹ سٹیفن کالج کے وائس پرنسپل تھے۔ سوشیل کی رفیقہ حیات فوت ہو چکی تھی۔ اور اُن کے تین بے ماں کے بچے تھے بیسیل اس صدمۂ جانکاہ میں اپنے عزیز دوست سوشیل کے شریک تھے۔ یہ دونوں دوست ایک دُوسرے کو بے حد چاہتے تھے۔

آخر کار بیسیل کی زندگی کا المناک انجام ہُوا۔ اُنہیں دہلی کے قلعہ میں ایک انگریز سپاہی کی تیمارداری کرنی پڑی جو ہیضہ کی مُہلک بیماری میں مُبتلا تھا۔ اُن کی اپنی صحت کچھ اچھی نہ تھی۔ اس لئے وہ بھی اِس مرض کا شکار ہو گیا۔ سوشیل اُن کی بیماری کے ایّام میں اُن کے ساتھ تھا۔ اُس نے مُجھے اُن کے آخری پیغام کے متعلق تحریر کیا تھا کہ وہ میرے لئے محبّت بھرا آخری سلام چھوڑ گئے ہیں۔

کیمبرج میں میری زندگی کے یہ ایّام اس طرح بسر ہُوئے کہ مَیں موت کے سایہ کی وادی میں سے گزرا۔ کبھی تو مَیں ایک دوست کے ساتھ ہوتا تھا اور کبھی دُوسرے کے ساتھ۔ حتیٰ کہ میں راہ کے تمام نشیب و فراز سے واقف ہو گیا۔ اِس زمانہ میں خُداوند مسیح کی حضوری اور نادیدنی دُنیا مُجھے اِس طرح سے حقیقت بن کر نظر آنے لگیں کہ اِس سے پیشتر مَیں نے کبھی ایسا تجربہ حاصل نہیں کیا تھا۔ جب میں اپنے عزیز دوستوں کے دمِ واپسیں کے وقت اُن کے پلنگ کے پاس ہوتا تو مجھے پُرانے عقلی معاملات نہیں ستاتے تھے۔ دُعا کے ذریعہ خُدا کے ساتھ میری رفاقت بڑی پُختہ ہو چکی تھی۔ یونیورسٹی کے وہ طلبا جنہیں ایمان کے متعلق کچھ مشکلات پیش آتی تھیں وہ اطمینان کی غرض سے میرے پاس آتے اور میں انہیں اپنے تجربات بتایا کرتا تھا۔ خُداوند مسیح میرے لئے سب کچھ تھا۔

بیشپ ویسٹ کاٹ کی وفات کے بعد مشن کے علاقہ میں کام کرنا میرے لئے ایک ایسا وسیلہ تھا کہ میں خُداوند مسیح کی پیروی کروں اور اُس کی اطاعت قبول کر لُوں۔ ابتدائی اوقات میں میرا دل وسطی افریقہ میں جانے کے لئے بے تاب رہتا تھا، کیونکہ وہاں بے حد مصائب کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن جب بیشپ ویسٹ کاٹ دہلی میں ہیضہ سے فوت ہو گئے تو میں نے دُوسری جگہوں پر مشن کا کام جاری کرنے کا خیال ترک کر دیا۔ اب میرے لئے یہ بات صاف تھی کہ میں ہندوستان جا کر بیشپ ویسٹ کاٹ کی جگہ کام کروں۔ لیکن سوال یہ تھا کہ مجھے کالج کے کام سے کب فارغ کیا جائے۔ آخر کار کیمبرج کے میرے ایک عزیز ترین دوست ڈاکٹر رائل[1] نے میری خاطر یہ کام کروا دیا۔ اُنہوں نے مجھ سے کہا:

"اب تمہاری عمر تینتیس[۳۳] برس کی ہے۔ اسی عمر میں ہمارے مُنجی خُداوند مسیح نے اپنی زمینی خدمت کو ختم کیا تھا۔ اگر تم ہندوستان میں جا کر بشارت کی خدمت سرانجام دینا چاہتے ہو تو تمہیں ہرگز ہرگز تاخیر نہیں کرنی چاہیئے۔ جُوں جُوں سال گزرتے جائیں گے، تمہارے لئے کیمبرج کو چھوڑنا مشکل ہوتا جائے گا۔ وہ جو ہل پر ہاتھ رکھ کر پیچھے دیکھتا ہے آسمان کی بادشاہی کے لائق نہیں ہے۔"

اُن کی باتوں سے میرا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اُسی وقت مجھے معلوم ہو گیا کہ

---

[1] DR. RYLE.

مجھے ہندوستان جانے کی اجازت مل چکی ہے۔ مجھے کسی لمحہ بھی یہ شک نہیں
گزرا کہ جو بات انہوں نے کہی تھی وہ خدا کی طرف سے نہ تھی۔

جب مجھے اِس ذہنی بحران سے مخلصی نصیب ہوئی تو میرا دِل خوشی سے
بھر گیا۔ میرے سامنے سے سب مشکلات ہٹ گئیں۔ میرے راستہ کی تمام
رکاوٹیں ایک ایک کر کے دور ہو گئیں۔ آخر کار ۲۸۔ فروری ۱۹۰۴ء میں بمبئی
اور دہلی کی طرف روانہ ہو گیا جس صبح میں اپنے وطن سے روانہ ہوا اُس دن
سردی اپنے پورے جوبن پر تھی۔ لیکن میرا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا۔ خوشی
نے غم کو بھلا دیا تھا۔ میں نے خدا کے مقصد کو انتہائی واضح طور پر معلوم کر
لیا تھا کہ میں نے اپنے والدین کو آخر کار قائل کر ہی لیا کہ مجھے سچ مچ حقیقی ہدایت
مل چکی ہے۔ میرے ماں باپ نے مجھے روکنے کی کوشش نہ کی اور اپنی مخلص
دعاؤں کے ساتھ مجھے برکت دے کر رخصت کیا۔

میری طویل چھٹیوں کے دوران مجھے کیمبرج میں ایک عجیب تجربہ ہوا۔
میں نے ابھی تک اس واقعہ کو صرف اپنی یادداشت میں رکھا تھا اور اسے
کسی پر ظاہر نہیں کیا تھا کیونکہ میرا خیال تھا کہ اس تجربہ کا تعلق صرف میری
ہی ذات سے ہے۔ لیکن اس نے مسیح میں میری باطنی زندگی میں کچھ اس
طرح سے انقلاب برپا کر دیا ہے کہ مجھے اس واقعہ کو بیان کرنا نہایت ضروری
ہے۔

یہ ایسا زمانہ تھا جب میں نادیدنی دُنیا میں رہا کرتا تھا۔ مہلک بیماریاں اور
مرنے والوں کے آخری پیغامات اور موت میرے رفیق تھے۔ گرمیوں کی ایک

شام کا ذکر ہے کہ میں کالج کے ہال کے باہر کھڑا تھا۔ میرا منہ چوکیدار کی کوٹھڑی کی طرف تھا۔ دونوں وقت مل رہے تھے اور شفق کی روشنی تھی۔ جو بالکل خاموش تھی۔ میں نے دیکھا کہ کوئی شخص عشاء ربانی کے لباس پہنے ہوئے میری طرف آہستہ آہستہ آ رہا ہے۔ اُس کے ہاتھ میں ایک برتن ہے۔ میرے دل میں فوراً خیال آیا کہ شاید سینٹ میری چرچ کے پادری صاحب کسی کے لئے ایک عشاء ربانی کا برتن لے کر جا رہے ہیں جو کالج میں بیمار ہے۔ جب میں نے اُسے اپنی طرف آتے دیکھا تو میرے دل میں کوئی ایسا خیال نہیں آیا کہ یہ کوئی اچنبھے یا خوف کی بات ہے۔ مجھے یہ بات بالکل قدرتی معلوم آتی تھی۔ میرے دل میں کوئی خدشہ نہیں تھا بلکہ میں بڑا ہی مطمئن تھا۔ میں تعظیماً اُن کے راستے سے ہٹ کر ایک طرف ہونے کو تھا کیونکہ میرا خیال تھا کہ پادری صاحب ہال میں سے گزر کر آئیوی کورٹ[1] کی طرف جا رہے ہیں۔ میں سوچنے لگا کہ کالج میں کون بیمار ہے کہ وہ شکل اولڈ کورٹ[2] کے ایک دروازے کی طرف مڑی اور پھر غائب ہو گئی۔ وہ دروازہ جس کی طرف اُس کا رُخ تھا اُس پر خود رو گھاس اُگی ہوئی تھی اور اب اُسے استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔

اِس واقعہ کے تھوڑی دیر بعد مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ رویا میرے اپنے ہی باطن سے اُٹھی تھی۔ میرے نیم شعوری دل سے یہ شکل نمودار ہوئی تھی کیونکہ میرے شعور میں کوئی ایسا خیال نہیں تھا جو اس قسم کی شکل کی تخلیق کا باعث

---

[1] IVY COURT. [2] OLD COURT.

بن سکتا۔ وہ شکل میری طرف کچھ اس طرح سے بڑھ رہی تھی کہ اس کا تعلق بیرونی دُنیا سے ہی ہو سکتا ہے۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ محض اس رویا کی وجہ سے ہی مَیں اس کے بعد کئی سالوں تک خدا اور خداوند مسیح کے ساتھ اپنا رُوحانی رشتہ قائم رکھنے کے قابل بن گیا۔ مجھے حیاتِ ابدی کا بھی تجربہ ہُوا اور یہ چیزیں غیرفانی ہیں۔

دُوسرے لوگ اس باطنی رویا کو کوئی خارجی چیز تصور کرتے ہیں اور اُسے کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اس بات کا چونکہ میری اپنی ذات کے ساتھ تعلق تھا اس لئے مَیں نے اسے اپنے دل میں رکھا اور مَیں ہمیشہ اس پہ غور کیا کرتا تھا۔ اس واقعہ نے مجھے میری شخصی زندگی میں خوشی سے رُوشناس کرایا ہے جس سے مجھے رُوحانی قوت حاصل ہوئی ہے۔

نواں باب

ہندوستان[1] میں نئی زندگی

میری زندگی میں ایک سالگرہ نئے سرے سے پیدا ہونے کی بھی ہے جس نے تقریباً تیس سال سے ہر ایک سال کی یاد کو میرے دل میں تازہ رکھا ہے۔ میں بڑی شکرگزاری سے خدا کو یاد کرتا ہوں جو تمام اچھی نعمتوں کا دینے والا ہے۔ وہ تاریخ ۳۰۔ مارچ ہے ۱۹۰۱ء میں اسی دن میں نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ اور مشرق میں اپنی نئی زندگی بسر کرنے لگا تھا۔ شمالی ہندوستان کی زبانوں میں ایک مشترک لفظ "دویجا" ہے جس کے معنی ہیں "دو مرتبہ پیدا ہوا"۔ یہ حقیقت ہے کہ میں "دویجا" ہوں کیونکہ میری زندگی دو حصوں میں بٹ چکی ہے۔ میں نے اپنی نصف زندگی مغرب میں گزاری ہے اور نصف زندگی مشرق میں۔ اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ میں مشرق اور مغرب کے درمیان ترجمان کے فرائض سرانجام دے سکتا ہوں تو اس کی صرف یہی وجہ ہے۔

جب میں نے پہلے ہی دن ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو مجھ پر یہ بات واضح ہوگئی کہ میں انسانی خیال کی ایک مختلف دنیا میں آگیا ہوں۔ چونکہ میں

---

[1] اس مقام پر "ہندوستان" کا مفہوم غیر منقسم ہندوستان ہے۔

اس دُنیا سے واقف نہیں ہُوں اِس لئے مَیں بڑا ہی متفکر رہنے لگا۔ اِس کے بعد مَیں انسانی اخلاق میں یگانگت کو سمجھنے کے قابل ہو گیا۔ اخلاق میں یہ یگانگت انسانی اختلاف میں موجود ہے۔ لیکن چونکہ اب ماحول بدل چکا تھا۔ میں نے اِس نظارے نے میری نگاہوں کو خیرہ کر دیا۔

مشرق میں تقریباً تیس سال گزارنے کے بعد کئی عظیم حقائق میری اپنی مذہبی زندگی کے پس منظر میں نظر آتے ہیں۔ ان حقائق میں سب سے عظیم یہ ہے کہ میری زندگی میں خُداوند مسیح کو مرکزی اور عالمگیر حیثیت حاصل ہے۔ اُس کی اہمیت کم نہیں ہے، کیونکہ وُہ عالمگیر طور پر انسانوں کے مُشابہ بنے۔ مَیں دیکھ رہا ہُوں کہ ایشیا اور یورپ کی تمام بہترین باتیں اسی کی بدولت ہیں۔

مَیں نے نئے سرے سے خُداوند مسیح کو مشرقی انداز میں پا لیا ہے،

اس لئے اب میرے لئے آسان ہے کہ خُداوند کی وُہ تصویر جو مغرب نے اپنے ماحول کے مطابق کھینچی ہے۔ اُس میں سے خامیوں کی نشاندہی کر سکوں۔ مغرب اسی وہم و گمان میں مبتلا ہے کہ خُداوند کی وُہ تصویر جو اُس نے کھینچی ہے ہر لحاظ سے مکمل ہے اور اُس کی قدرت کی معموری اُس میں موجود ہے۔ ان تصاویر میں صحیح تناسب موجود نہیں ہے۔ ان تصاویر میں خُداوند مسیح کی خوبیوں کا شائبہ تک موجود نہیں ہے۔ نیز بہت سی چیزیں بالکل مفقود ہیں۔ کسی دن مجھے خُداوند مسیح کی مشابہت کو نئے سرے سے بیان کرنا پڑے گا اور خُداوند کی اِس تصویر میں مَیں سرزمینِ مشرق کی فضاؤں کے تمام خوبصورت رنگ بھرنے کی کوشش کروں گا۔

خُداوند مسیح کی بلند سیرت کے عظیم معجزات یہ ہیں :۔

۱۔ نبی نوع انسان کی تاریخ میں خُداوند مسیح کے سوا کسی دُوسرے شخص میں تمام اقوام اور نسلوں کی خوبیاں موجود نہیں ہیں۔

۲۔ اُس کی جائے پیدائش اِس شاہراہ پر واقع تھی جہاں سے زمانہ قدیم کی انسانی زندگی کی دو بڑی بڑی ندیاں مشرق اور مغرب کو سیراب کرتی ہُوئی گزرتی تھیں۔ خُداوند مسیح انہی خوبیوں سے منوّر تھا۔ وُہ اُوپر سے تھا۔ آسمانی خوبیوں نے ابنِ آدم کو تمام دُنیا کے انسانوں سے بلند کر دیا تھا سب سے بڑا دعویٰ یہی ہے۔

انسانی تاریخ کے پہلے ادوار میں اِس قسم کا جائزہ ناممکن ہے کیونکہ اُس وقت دُنیا کے ایسے خطّے بھی موجود تھے جن کے حالات سے اُس زمانہ کے لوگ آگاہ نہیں تھے۔ لیکن ہمارے اپنے زمانہ میں یہ دعوٰے کیا جا سکتا ہے کیونکہ آج ہم انسانی تاریخ کے تمام ضروری حقائق سے واقف ہیں۔ وُہ لوگ جنہوں نے دُنیا کے دُوسرے لوگوں سے رابطہ اتحاد پیدا کیا ہے اور انہیں اُن لوگوں سے گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے۔ وُہ اِس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ ہر قوم اور ہر نسل خُداوند مسیح کی تعلیم کو سمجھتی ہے اور اس پر عمل کرتی ہے۔ انجیل مقدس میں ایسے واقعات موجود ہیں جن کا خاص طور پر اُنہیں کے ساتھ تعلّق ہے۔ خُداوند مسیح کی بادشاہت بنی نوع انسان میں موجود ہے۔ یہ ایسا سنہری رشتہ ہے جس نے زمانوں اور نسلوں کو ایک دُوسرے کے ساتھ باندھ رکھا ہے۔

دُنیا کی مختلف اقوام یہ پُوچھتی ہیں کہ یہ "ابنِ آدم کون ہے ؟ "
خُداوند مسیح کے بغیر دُنیا کا کوئی ایسا انسان موجُود نہیں ہے جس کے
دل میں انسانوں کے لئے اتنی ہمدردی ہو۔ دُنیا کا کوئی دُوسرا انسان
بنی نوع انسان کے دُکھ اور درد کو اپنا دُکھ اور درد نہیں سمجھتا۔ اس
قسم کی سیرت خُداوند مسیح ہی کی ہے۔ جب سے مَیں یورپ سے ہندوستان
آیا ہُوں، یہی خیال میرے لئے تسلّی دِلجمعی کا باعث بنا ہُوا ہے۔ اس
کے علاوہ مُجھے بہت سی الٰہی باتوں کے معانی معلوم ہوئے ہیں۔
مشرق کی سرزمین سے جو کچھ مَیں نے حاصل کیا ہے وُہ غیر متوقع
نہیں ہے، کیونکہ مَیں نے ویسٹ کاٹ سے تعلیم حاصل کی ہے۔ اُنہوں
نے ہندوستان کے مختلف مذہبوں کے خیالات کے متعلق خاص طور
پر تحقیق کی تھی۔

مُجھے انگلستان میں خُدا کے متعلق یہ عقیدہ سکھایا گیا تھا کہ وُہ
خالق ہے اور بنی نوع انسان پر حکومت کرتا ہے۔ یہ عقیدہ اسی طرح
سے شروع ہوتا ہے:۔

"مَیں اعتقاد رکھتا ہُوں خُدا قادرِ مطلق باپ پر جو زمین اور
آسمان کا مالک ہے"

وُہ تصویر جو مَیں نے اپنے ذہن میں خُدا کی بنا رکھی تھی، وُہ ایسی ہستی
کی تھی جو مُجھ سے علیحدہ ہے۔ وُہ لامحدود ہے، جس نے اپنی قدرت سے ساری
دُنیا کو تخلیق کیا ہے، اور وُہ کل نسلِ انسانی کی مملکتوں پر حکمرانی کرتا ہے۔

مجھے اپنے گھر میں ایسی تربیت دی گئی تھی کہ اس عقیدے نے میرے
دل میں اور بھی خوف پیدا کر دیا تھا۔ لیکن دعائے ربانی کے الفاظ "اے
ہمارے باپ" نے مجھے خداوند مسیح کی محبت سے روشناس کرا دیا اور
میرا تمام خوف دور ہو گیا۔

لیکن جب میں نے ہندوستان کے مذاہب کا گہرا مطالعہ کیا تو
مجھے معلوم ہوا کہ خدا کو روح میں روحانی اور باطنی طور پر معلوم کرنے کی
ضرورت ہے۔ مشرق میں بھی مغرب کی طرح خدا کے تصور میں ہیبت
ہے۔ لیکن مشرق میں یہ خوف زیادہ تر باطنی ہے۔ جب میں نے مکمل طور پر
اس خیال کو سمجھ لیا تو مجھے مقدس یوحنا رسول کی انجیل اور اس خیال میں
مماثلت نظر آئی۔ اس کا کسی علم مغربی تعلیم کے ساتھ کوئی تعلق نظر نہیں
آتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ صرف خداوند مسیح یہ کہہ سکتا تھا کہ "میں
اور باپ ایک ہیں" بلکہ ہم بھی جو خدا کے فرزند ہیں بڑی تعظیم کے
ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں۔

مشرق ازلی روح الہی یعنی پرماتما کو انسانی روح میں جاری و ساری
سمجھتا ہے۔ وہ زمان و مکان کی قید سے بالا ہے۔ لیکن اپنے آپ کو
ظاہر کرنے کی غرض سے وہ وقت اور زمانوں کا لبادہ استعمال کرتا ہے۔
وہ کسی چیز سے ظاہر تو نہیں کیا جا سکتا لیکن وہ انسانی روح کی گہرائی میں
پاک دلوں میں جلوہ گر ہے۔ وہ نظر تو نہیں آتا۔ لیکن عظیم انسانوں
میں اس کا عکس نظر آتا ہے۔ اس کی کوئی صورت نہیں لیکن وہ انسان کی

صُورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

خُدا کے متعلق سرزمینِ مشرق میں یہی تصوّر ہے۔ علامات اور تجربات کے وسیلے خُدا کو اسی طرح سے ظاہر کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے سادہ لوح دیہاتی کی سوچ بھی کچھ اسی طرح کی ہے۔ اس کی بتوں کی پوجا سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پرماتما کے بارے میں جو اُس کا تصوّر ہے وہ اُس کا منکر ہے۔

یہ سچ ہے کہ عہدِ عتیق میں بھی ایسے حوالے موجُود ہیں جن میں خُدا کے متعلق اسی قسم کا تصوّر ہے۔ مثلاً زبور ۸۴ میں خُدا کو "لشکروں کا خُدا" کہا گیا ہے۔ اور یہ تصوّر اس باطنی تصوّر سے ملتا جُلتا ہے۔ لیکن "لشکروں کے خُدا" کی عام تصویر خارجی ہے۔ مکالماتِ افلاطون میں بھی یونانی زبان میں اسی خیال کو ادا کیا گیا ہے۔ لیکن افلاطونیّت شمالی یورپ کی بے رنگ اور بے کیف فضاؤں میں نشوونما نہیں پا سکی۔ مقدّس یُوحنّا رسُول، کیمبرج کے افلاطونوں، جرمنی کے صوفیائے کرام، جارج فاکس[1] اور سوسائٹی آف فرینڈز[2] نے اسی باطنی نُور سے طمانیّتِ قلب حاصل کیا تھا۔ لیکن مغرب عام طور پر خُدا کو محیطِ کُل کی بجائے خلقی یا دنیاوی مانتا ہے۔ اسی سے ہم نے اپنے ذاتی تجربہ سے یہ چیز سمجھ لی کہ خُدا دنیا میں الوہیت اور انسانی تصویر کی کاملیت کے لئے مشرق و مغرب کے دونوں تصوّرات کی اسی طرح سے ضرورت ہے جس طرح بنی نوعِ انسان کے

---

[1] GEORGE FOX [2] SOCIETY OF FRIENDS.

لئے کرۂ ارض کے دونوں نصف کرّوں کی ضرورت ہے۔ لیکن مشرق و مغرب کے نقطۂ نگاہ میں بیّن تفاوت موجود ہے۔ عام اصطلاح میں یہ کوئی علمی نظریہ نہ تھا جس نے مجھے سچائی کے متلاشی کی حیثیت سے نئی مذہبی فضا سے روشناس کرا دیا۔ یہ مذہبی فضا میرے چاروں طرف موجود تھی۔

دہلی میں قیام کے دوران مجھے روزمرّہ کی زندگی کے حقائق سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ مجھے ہر نقطۂ نگاہ کو سمجھنے کے لئے بڑی احتیاط سے کام لینا پڑتا تھا، تاکہ ایسا نہ ہو کہ میں اپنے آقا و خداوند مسیح کی پیروی کرنے سے قاصر رہوں۔ یہ نئے خیالات میرے لئے بالکل اجنبی تھے۔ خداوند کی راہنمائی، دعا اور رفاقت سے میں آگے قدم بڑھاتا تھا اور مجھے معلوم ہوتا تھا کہ وہ راہ، حق اور زندگی ہے۔

بشپ کے مخلص ترین دوست سوشیل رودھرا نے دہلی میں بڑی خندہ پیشانی سے میرا خیر مقدم کیا۔ اُن کی اعانت سے میری تمام مشکلات جاتی رہیں، اور مشرق کی سرزمین اب میرے لئے اجنبی نہ رہی۔ کیونکہ میں نے محسوس کیا کہ سوشیل رودھرا میرے بڑے ہی مخلص دوست تھے۔ میں نے بہت جلد ہندوستانیوں کے مزاج کو سمجھ لیا اور ہندوستانی مجھے سمجھنے لگے۔ اِس بات سے بہت سے لوگوں کو حیرانی ہوتی ہے اور اس کا جواب بہت آسان ہے۔ میں اس راز سے پردہ اُٹھاتا ہوں۔ دراصل سوشیل رودھرا جیسے مخلص دوست ہر ایک کے نصیب میں نہیں ہوا کرتے۔ اُس نے اپنے عزیز ترین دوست بشپ

کی خاطر مجھے ہاتھوں ہاتھ اٹھا لیا۔ اس کے بعد وہ میری خاطر مجھ سے بڑے تپاک سے ملتے رہے۔ اور ہم ایک دوسرے کے بہترین رفیق بن گئے۔ وہ میں پچاس سے گزر چکے تھے۔ انہوں نے ادھیڑ عمر میں شادی کی تھی۔ اُن کے تین چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ جب اُن کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہوا تو اُن کا سب سے چھوٹا بیٹا ابھی شیر خوار ہی تھا۔

ہم ایک ہی گھر میں رہنے لگے۔ اُن کے معصوم بچوں نے اپنے باپ کے بعد مجھے اپنے دلوں میں جگہ دی، اس لئے شروع ہی سے مجھے ایک ہندوستانی گھر میں زندگی بسر کرنے کا موقع میسر ہوا۔ میرے لئے یہ بڑی سعادت تھی۔ میں اس خاندان کا ایک ایسا رکن تھا جس سے ہر ایک محبت کرتا تھا۔ اس خاندانی زندگی سے میں نے ہندوستانی زندگی کا بڑا گہرا مطالعہ کیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ ہندوستانی معاشرت میں روز افزوں کیا تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ اگر مجھے یہ سعادت نصیب نہ ہوتی تو میں اس گہرے مطالعہ سے محروم رہ جاتا۔ سوشیل خود بڑے ہی محبِ وطن تھے۔ وہ مجھے وہ سب مواد مطالعہ کے لئے دیا کرتے تھے جس سے معلوم ہو سکے کہ نوجوان ہندوستانی کے کیا خیالات ہیں۔ اُن کی اپنی حب الوطنی میرے دل میں نئے ولولے پیدا کرتی تھی۔ وہ کوئی معمولی محبِ وطن نہ تھے۔ میرے لئے سب سے بڑی قیمتی بات یہ تھی کہ ہم دونوں خداوند مسیح کے مقدس نام کے شیدائی تھے۔ سوشیل خداوند مسیح کو اپنا آقا اور خداوند مانتے تھے۔ اُن کے تمام کاموں میں اُن کی مذہبی زندگی کا رنگ غالب تھا۔ اُن کے تمام خیالات اور اقوال مسیحی سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ اُن کے

مسیحی ایمان نے اُن کے دل کو آزاد بنا دیا تھا۔ وہ اپنے لیے خود سوچ
سکتے تھے۔

سوشیل کے والد محترم پیارے موہن رُدرا ڈاکٹر ڈت صاحب کے
پند و نصائح سے مسحور تھے۔ ڈاکٹر صاحب اُس وقت کلکتہ میں بشارت
کے کام پر مامور تھے۔ ڈاکٹر ڈت کی سحر البیانی کی وجہ سے اعلیٰ ہندو
خاندانوں کے بہت سے تعلیم یافتہ بیدار مغز نوجوانوں نے خداوند مسیح
کو علانیہ طور پر اپنا نجات دہندہ قبول کر لیا تھا۔ اس زمانے میں اس قسم
کے فعل سے خداوند مسیح پر ایمان لانے والوں کو ہندو سوسائٹی سے بالکل
علیحدہ کر دیا جاتا تھا۔ ہندو خاندانوں میں سے آنے والے نوجوانوں پر
اس تبدیلی کا یہ ردِ عمل ہوا کہ اُنہوں نے مشرق کی ہر ایک چیز کو چھوڑ دیا
اور مغربی لباس، اطوار اور رسم و رواج کو بھی مسیحی مذہب کا جزو سمجھ کر اپنا لیا۔
لیکن سوشیل کے پتا نے اس طرح سے خداوند مسیح کی تعلیم حاصل نہیں
کی تھی اور نہ ہی اُنہوں نے اپنے بچوں کو خداوند مسیح کی پیروی کرنے کی اس
طرح کی تعلیم دی تھی۔ ظاہری باتوں میں وہ ہندو ہی رہے لیکن باطن
میں اُن کی زندگی کو خداوند مسیح نے بالکل تبدیل کر دیا تھا۔ ہندو مذہب کا
وہ ورثہ جو اُنہوں نے حاصل کیا تھا، اُن کے بیٹے نے بھی بڑی وفاداری
سے اُسے سینے سے لگائے رکھا۔

جونہی سوشیل جوان ہوا اُسے مذہب کی بہت سی آزمائشوں میں سے
گزرنا پڑا۔ ہم دونوں میں یہ چیز مشترک تھی لیکن ہماری مشکلات ایک جیسی نہ

تھیں۔ کلکتہ میں یونیورسٹی کی تعلیم کے زمانہ میں وُہ آکسفورڈ مشن ہوسٹل میں رہا کرتا تھا۔ اس ہوسٹل میں اُس نے دُعائیہ زندگی کے مناظر دیکھے تھے مسیحی جذبا خوشی سے عبادت میں حصّہ لیا کرتے تھے۔ جب سوشیل تشکیک کے طوفان میں گھر جاتا تو دُعائیہ زندگی اُسے سنبھالتی۔ اس میں خلوص اور یقین تھا، اس لئے وُہ طوفانوں کا مقابلہ کرکے اپنے سفینہ کو ساحل مُراد پر صحیح وسالم لے گیا۔

آخرکار وُہ کلکتہ سے دہلی میں چلا آیا۔ وُہ رُوح میں مضبوط تھا۔ اُن کا دِل خوشی اور اطمینان سے بھرا ہُوا تھا۔ وُہ اپنے منجی خُداوند مسیح سے والہانہ محبّت کرتا تھا۔ وُہ نئی زندگی سے رُوشناس ہُوا تھا۔ وُہ اُدھیڑ عُمر میں اُس نئی زندگی میں شریک ہُوا۔ مقدس یُوحنّا رسُول کی اس انجیلی آیت نے کہ "قیامت اور زندگی مَیں ہُوں" اُس کی زندگی میں تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ ہم دونوں میں یہی چیز مُشترک تھی اور اسی نے ہمارے دِلوں کو محبّت سے یکجا کر دیا تھا۔ ہم ایک دُوسرے کو اپنی اپنی اُمیدیں، مایُوسیاں اور شکوک بتا دیا کرتے تھے۔ چُونکہ ہم ایک دُوسرے کے خیالات میں برابر کے شریک تھے اس لئے ہمارا ذہن ایک جیسا تھا اور ہم دونوں میں محبّت کا رشتہ بہت زیادہ مضبُوط ہو گیا۔

اس تبدیلی اور نئے تجربہ کے زمانہ میں سوشیل کی محبّت اتنی پاک، بے لوث اور مخلص تھی کہ مَیں اس عطیے کے لئے ہمیشہ خُدا کا ہر روز شکریہ ادا کرتا تھا۔ وُہ بڑے ہی مُنکسر المزاج شخص تھے۔ اپنے چھوٹے سے چھوٹے کام میں بھی اُن کی عظمت نظر آتی تھی۔ اُن کے سامنے کبھی کسی نے کوئی غیر کلمہ

نہیں ہوا ہوں، لیکن اُن کی موجودگی سے کبھی کوئی ہراساں بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ دل کے اتنے نرم تھے کہ اُن کی یہ نرمی ضرب المثل بن گئی تھی، اگر نیومین کی وہ تعریف جو اُنہوں نے ایک معزز انسان کی کی ہے کہ وہ کبھی کسی کو دُکھ دینے کی جستجو نہیں کرتا درست ہے تو پیرسوشیل اس معیار پر پورے اُترتے ہیں۔ اپنی موت تک پورے بیس سال وہ مجھے دل سے پیار کرتے رہے اور اُن کی محبت ناقابلِ تبدیل تھی۔

ہم سیر کے لئے روزانہ کشمیر گیٹ سے ہو کر جایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ہم زنجی کے قلعے یا ہمایوں کے مقبرے کی طرف بھی نکل جاتے تھے۔ بعض اوقات ہم شہر میں اُن ہندو اور مسلمان دوستوں سے ملنے کے لئے بھی جایا کرتے تھے جن کے بچے ہمارے کالج میں زیرِ تعلیم تھے۔ کبھی کبھی ہم دریائے جمنا کے پل سے گزر کر ارد گرد کے دیہاتوں میں بھی چلے جاتے تھے۔ سوشیل ہندوستان کے ایک ممتاز مورّخ تھے۔ وہ ہندوستان کے دیہات کی اقتصادی حالت پر جو تبصرہ کرتے اُس پر تعمیر کے تمام پہلو مُہیّا کرتے تھے۔ ہم دیہاتیوں سے مل کر بڑے خوش ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ مجھے ہندوستان کی دیہات کی زندگی سے اُنس پیدا ہو گیا اور میں دیہاتی زندگی کا بڑا حامی بن گیا۔ اس سے میں ہندوستان کی معاشرت کا شہری زندگی کو ہی دیکھ کر اندازہ لگانے کی ایک مُہلک غلطی سے بچ گیا۔

ہم بڑی لمبی سیر کو جایا کرتے تھے۔ اس اثنا میں ہم نے ایک دوسرے کا گہرا مطالعہ کر لیا۔ ہم بیشپ ویسٹ کاٹ کو یاد کیا کرتے تھے اور اُن کی صاحب فراش

ـــ NEWMAN.

ہمشیرہ کا اکثر تذکرہ ہُوا کرتا تھا جو انگلستان میں تھیں اور بیماری کے بستر سے
بھی ہمارے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھے ہُوئے تھیں۔ اس
طرح میں کئی طرح سے ہندوستان کے حالات سے آگاہ ہوتا گیا۔ میرے
ملنے والے اس لئے میرے دوست بن گئے کیونکہ میں سوشیل کا دوست
تھا اور میں بھی اُن سے اسی عظیم المرتبت شخصیت کی وجہ سے گھُل مِل
گیا۔ سوشیل کی شخصیت میں بڑی دلکشی اور جاذبیت تھی اور دُنیا اُن کی شیدائی
تھی اور میں اُن کی ذات سے مستفید ہوتا رہا۔

دسواں باب

کیمبرج مشن[1]

ہندوستان میں آکر مجھے اکثر اوقات اس قسم کا تجربہ ہوا ہے جسے میں نہ تو عجیب و غریب خیال کرتا ہوں اور نہ ہی یہ سمجھتا ہوں کہ یہ بیان کرنے کے قابل نہیں ہے۔ جب کبھی میں کسی اجنبی سے ملتا ہوں یا میں کسی جگہ ہوتا ہوں تو مجھے خداوند مسیح کی حضوری کا احساس ہونے لگتا ہے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنے ملنے والوں کے چہروں میں اور اُن کی موجودگی میں خداوند مسیح کو حاضر و ناظر دیکھتا ہوں۔

مجھے اس امر کا بخوبی احساس ہے کہ میں متصوفانہ زبان استعمال کر رہا ہوں لیکن میں حقیقتِ حال کو کسی اور طرح سے بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ مجھے اپنا تجربہ بیان کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہی معلوم ہوتا ہے جو میں نے تحریر کیا ہے۔ اب جب ہم ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو کچھ اس طرح سے ملتے ہیں کہ گویا وہ میرے خویش و اقارب ہیں۔ ہمارا ایک دوسرے سے خطاب کرنے کا طریقہ ایسا ہے جیسے رشتہ دار ایک دوسرے سے خطاب کرتے ہیں۔ مجھے اُن سے ہمدردی ہے اور وہ مجھے اپنا عزیز سمجھتے ہیں۔ سوشیل میرے لئے کیا کچھ نہ تھا۔ اُس کا چہرہ خداوند مسیح کی طرح تھا۔

---

[1] CAMBRIDGE MISSION.

کی ریجنسی[1] کونسل کے صدر تھے اور بڑے نیک دل تھے۔ جب کبھی میں
انہیں ملنے کے لئے جاتا تو مذہب کے گہرے مسائل پر اظہارِ خیال کیا کرتے
تھے۔ ہم محض مناظرے یا بحث مباحثے کی خاطر ایسا نہیں کرتے تھے بلکہ ہم
اس لئے ایسے مسائل کے متعلق بات چیت کرتے تھے کہ ہم خدا سے محبت
کرتے تھے، اس طرح ہم میں بڑی گہری دوستی پیدا ہو گئی۔ انہوں نے کئی مرتبہ
خدا کے موضوع پر مجھے مذہبی کتابیں پیش کیں۔ یہ کتابیں اردو میں لکھی ہوتی
تھیں جب میں ان سے الوداع ہوتا تھا تو وہ مجھ سے بغلگیر ہوتے اور مجھے
ہمیشہ یہ کہتے کہ میں جلدی ہی ان کے پاس دوبارہ آؤں۔ ذوقی ذکاء اللہ
صاحب اور سردار صاحب دونوں ہی آنجہانی ہو چکے ہیں لیکن ان کی یاد
اب بھی میرے دل میں تازہ ہے، جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں تو ان کی
شکل میرے سامنے موجود ہے۔

اس وقت پنجاب میں مسیحی مشنیں[2] کام کر رہی تھیں۔ دوسرے مذاہب
کے ساتھ بحث مباحثے کا بازار گرم رہتا تھا۔ مناظرے ہوا کرتے تھے لیکن
میں ان مناظروں کے بالکل خلاف تھا۔ جب میں انگلستان میں تھا تو ہماری
برادرہڈ[3] کے ایک رکن نے مجھے کہا تھا کہ میں ایسی بحثوں سے گریز کروں۔
خوش قسمتی سے کیمبرج مشن کے نوجوان ممبر اسی عقیدے کے تھے چنانچہ میں
اس معاملہ میں اکیلا نہیں تھا۔ اس معاملہ میں پنجاب کے کئی مشنری ہمارے
ہم خیال نہ تھے۔ اس کے متعلق بڑی گرما گرم بحث ہوئی۔ دونوں طرف
سے کافی دلائل پیش کی جاتی تھیں۔ وہ بشپ صاحب جنہیں خاص طور پر

---

۱ REGENCY COUNCIL. ۲ CHRISTIAN MISSIONS ۳ BROTHER

اس مقصد کے لئے بُلایا گیا تھا۔ مُسلمانوں کے ساتھ مناظرہ کرنے میں بڑے مشہور تھے۔ اُنہوں نے ایک نابینا مولوی صاحب کو مُناظرے کے ذریعہ مُشرّف بہ مسیحیت کیا لیکن اب مذکورہ بشپ صاحب نے بھی محسوس کیا کہ اب حالات بدل چُکے ہیں اور مشنریوں کے نقطۂ نگاہ میں بھی تبدیلی آ جانی چاہیئے۔

یارک شائر میں مُجھے بشپ ویسٹ کاٹ صاحب کے ساتھ بہت جیبنے کی صداقت نصیب ہوتی رہتی تھی جب ہم سیر کے لئے باہر کُھلے میدانوں میں نکلتے تو اکثر اوقات ہم اسی موضوع پر باتیں کیا کرتے تھے۔ اُن کی صُحبت میں رہ کر میں ہندوستان میں آنے کے قبل جن چکا تھا۔ کیمبرج مدرسۂ فکر کی تین عظیم شخصیتوں نے جن کے نام لائٹ فٹ[1] ویسٹ کاٹ[2] اور ہورٹ[3] ہیں، کیمبرج کی بُنیاد ڈالی تھی۔ ابتدائی ایام میں سکندریہ میں کلیمنٹ اور اوریجن کے مدرسۂ فکر نے جس طرح کلیسا کی خدمت سرانجام دی تھی، اسی طرح کا مقصد کیمبرج مشن کے مدِنظر بھی تھا اس لئے دُوسری مشنوں کے مقابلے میں میرا مطمحِ نظر بڑا وسیع تھا۔

کیمبرج میں قیام کے دوران مُجھ پر ایک اور چیز نے بڑا اثر ڈالا اور میں اس کے لئے بڑا ہی شُکر گزار ہُوں۔ پروفیسر ای۔جی۔براؤن[4] میرے اپنے ہی کالج کے فیلو تھے۔ میں اُن کے عالمانہ لیکچر بڑے غور سے سُنا کرتا تھا۔ وہ خود بھی مشرق کی سرزمین میں آنے کے مشتاق

---

[1] LIGHTFOOT [2] WESTCOTT [3] HORT [4] PROF. E.G. BROWN.

تھے۔ میں نے اکثر اوقات اُن کے ساتھ بات چیت کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں مذہب اسلام کی اچھی اچھی باتوں کو سراہنے کے قابل ہو گیا۔ جب میں دہلی میں آیا تو ان چیزوں نے میری بڑی ہی مدد کی۔

اگرچہ مجھے ہر قسم کی بہتر سے بہتر تعلیم ملی لیکن ابھی تک میں اُن تعصبات سے پاک نہیں تھا جو جوانی سے مجھے ورثے میں ملے تھے۔ میرے والد محترم قدامت پرست تھے اور وہ ہندوستان کو برطانیہ کا مقبوضہ ملک سمجھتے تھے۔ یہ بات میرے غیر شعوری خیالات میں اتنی گہری چلی گئی تھی جو کہ ایک مستقل شکل تھی۔ بعض اوقات مجھے یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا تھا کہ تعصب بھرے خیالات کی جڑیں میرے خیالات میں اتنی گہری ہیں کہ اُنہیں اُکھاڑنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

اس معاملہ میں دوستی مجھے بڑی امداد دیا کرتا تھا۔ جب کبھی اُنہوں نے مجھ میں ہمارا ایسی ذہنیت کو اُبھرتے دیکھا تو اُنہوں نے نسلی برتری کے خیالات کو آہستہ آہستہ دُور کرنے کی کوشش کی۔ وہ مجھے بڑا سے دیا جتاتے تھے۔ وہ میرے ان خیالات سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔ اس لیے جب کبھی اُنہوں نے مذہبی یا نسلی برتری کے خیالات کو میری باتوں میں دیکھا تو وہ کبھی بے صبر نہیں ہوا۔ اُنہیں انگریزوں کے ساتھ رہتے ہوئے بہت عرصہ ہو گیا تھا اور وہ اُن کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا۔ اُس کے قول کے مطابق وہ جذبہ جو جارح ہو خواہ وہ سیاست میں ہو یا مذہب میں اُس کی مزاحمت کرنی چاہیے۔

اُسے سُن کر فوراً خداوند مسیح کے قدموں میں آجاتا تھا۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے
کہ میں بڑا ہی آزاد خیال تھا لیکن اس کے باوجود میں ہائی چرچ یعنی کلیسیا
میں بشپ کی برتری تسلیم کرنے والا تھا۔ اس معاملہ میں وہ میری پیروی
نہیں کرتا تھا۔ اگرچہ وہ عشاءِ ربانی کی سیکرامنٹ کی خوبصورتی کا بے حد
معتقد تھا تاہم ہم دونوں بڑی خوشی سے ہر اتوار صبح عشائے ربانی کی خاطر
اکٹھے گرجا جایا کرتے تھے۔

اگر کسی آدمی کو اعتقاد میں اختلاف ہوتا اور اُسے عشاءِ ربانی کی سیکرامنٹ
میں شریک ہونے پر پابندی لگا دی جاتی تو وہ اُسے ہرگز پسند نہیں کرتا تھا۔
وہ مجھے غصہ سے کہا کرتا تھا کہ انجیل مقدس میں صوبیدار کو مسیح خداوند نے
خدا کا فرزند ہونے کا حق بخشا، کیا پہلے اُس نے اُسے مرید بنایا؟ کیا خداوند
مسیح نے یہ اعلان نہیں کیا تھا کہ اُس نے اس صوبیدار جیسا ایمان سارے
اسرائیل میں نہیں دیکھا؟ کیا ہمیں اپنے مالک خداوند کی نسبت بنی نوع انسان
سے کم محبت کرنی چاہیئے؟ وہ کہا کرتا تھا کہ خداوند مسیح نے کہا ہے کہ شاگرد
کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ اپنے اُستاد جیسا ہو۔

میں انگلیکن کلیسیا سے تعلق رکھتا تھا لیکن آہستہ آہستہ مجھے معلوم
ہوگیا کہ میرے ہائی چرچ کے خیالات کی ہندوستان میں ترویج ناممکن ہے۔ اس
کے فوراً بعد ہی ایک ایسا وقت آیا جسے میں ایک فیصلہ کن لمحہ کہہ سکتا ہوں۔ انگریز
مشنری اور ہندوستانی مسیحی ایک روحانی مجلس میں شریک ہوئے۔ یہ فیصلہ پاس
ہوئی کہ عشائے ربانی کی متحدہ عبادت ہو جس میں معمر بزرگ پادری ڈاکٹر چیٹرجی

عشائے ربانی کی رسم ادا کریں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف پریسبٹرین تھے۔ جب میرے سامنے یہ صورت پیش ہوئی تو ہندوستانی مسیحیوں کے ساتھ سیکرامنٹ میں شریک ہونے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ میں اب اس وجہ سے عشائے ربانی سے انکار نہیں کر سکتا تھا کہ میں انگلیکن ہوں۔ سوشیل میرے ساتھ تھا اور ہم دونوں عبادت میں شریک ہوئے۔ یہ عبادت بڑی سادہ تھی۔ اس طرح ... کلیسیا میں بشپوں اور پادریوں کو بلند مقام دینے کی ہدایت ملتی رہی کیونکہ اس نے مجھے ان مسیحیوں سے دور کر دیا ہوتا جنہیں میں خداوند مسیح میں محبت کرتا تھا اور میری ان لوگوں سے کسی قسم کی رفاقت نہ ہو سکتی۔

اب ایک ایک کر کے تمام رکاوٹیں دور ہوتی جا رہی تھیں۔ ان مصنوعی پابندیوں نے مجھے دوسروں سے دور کر رکھا تھا۔ میں یکے بعد دیگرے تمام باتوں میں شریک ہونے لگا تھا۔ میں موسم گرما میں تیز بخار میں مبتلا ہو گیا۔ میری صحت ٹوٹ رہی تھی۔ مجھے نیند نہیں آتی تھی۔ دہلی میں ایک نوجوان بپٹسٹ مشنری رہتے تھے۔ وہ مجھے شہر سے باہر مشن کے بنگلہ میں لے گئے۔ انہوں نے میری تیمارداری کی اور میری صحت بحال ہوئی۔ میری تیمارداری کرتے کرتے وہ بھی بیمار ہو گئے۔ میں نے ان کی جگہ مشن کے گرجا میں عبادت کرانے کا وعدہ کیا کیونکہ اگر میں عبادت کرانے کی حامی نہ بھرتا تو عبادت نہ ہو سکتی۔ چونکہ میں نے ایسا کام کرنے کی پیشکش کی تھی اس لئے لاہور کے لارڈ بشپ صاحب نے مجھے بتایا کہ اس وجہ سے میرا پادری ہونے کا لائسنس منسوخ کر دیا جائے گا اور وہ ان کے حلقۂ اُسقفی میں پادری نہیں رہ سکیں گے۔ میں بشپ صاحب

موصوف کو دل سے پیار کرتا تھا کیونکہ وہ بڑے نیک دل تھے۔

اس واقعہ کو بیس سال سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ آج کل پنجاب میں یہ چیز نہیں ہو سکتی۔ اس وقت میرے سامنے ایک بہت ہی اہم معاملہ پیش تھا جس کا مجھے فوراً فیصلہ کرنا تھا۔ آخر کار میں نے بشپ صاحب موصوف کو بڑے ادب اور احترام سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں اس معاملہ میں انسان کی بات ماننے کی بجائے خدا کا حکم بجا لاؤں گا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ میری خدمت کا حلقہ پہلے سے زیادہ وسیع ہو گیا۔

انگلستان میں تو مذکورہ نوعیت کی بہت سی مشکلات پر قابو پا لیا گیا تھا لیکن ان مشکلات نے ہندوستان میں از سر نو سر اٹھایا مثلاً بشپ ویسٹ کاٹ اور بشپ آف کنٹربری[1] نے انگلستان میں مذہب کے انتالیس[2] ارکان پر اپنے دستخط ثبت کر دیئے لیکن ان ارکان کا ہندوستان کی نوزائیدہ کلیسیا پر لادنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔

میرے دل میں بہت سے احساسات اُبھر رہے تھے۔ اب میں یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ بعض انگریزوں نے ان کی اہمیت کو نہ سمجھنے میں بہت غلطی کی ہے۔ دہلی میں بشپوں کی ایک چھوٹی لیکن بڑی اہم میٹنگ ہوئی۔ اس میں بشپ آف لاہور اور کلکتہ کے میٹرو پالیٹن[3] صاحب شریک ہوئے۔ ہوتی لال راہوراسنے ایک مفصل پرچہ پڑھا اور ایسی باتوں کے خلاف احتجاج کیا۔ اس نے صاف الفاظ میں کہا کہ اس نے دل کی خوشی سے اس وجہ سے انکار کیا ہے کیونکہ وہ دعا مانگنے کے ان ارکان کی پیروی نہیں کر سکتا۔ جب مجھ سے

---

[1] ARCH BISHOP CANTERBURY [2] THIRTY NINE ARTICLE
[3] METROPOLITAN.

کہا گیا کہ میں اپنی رائے کا اظہار کروں تو میں نے سوسائٹی کی تائید کی اور ہندوؤں
کے امثال میں سے اقتباس پیش کر کے کہا کہ اب ہم شاگردوں کی گردن پر
ایسا جوا رکھیں گے جس کو نہ ہمارے باپ دادا اٹھا سکتے تھے نہ ہم" خدا کو
کیوں آزماتے ہیں؟

بغاوت کے یہ آثار دیکھ کر دونوں بشپ صاحبان کو بڑا صدمہ ہوا لیکن
ابھی تک ان خرابیوں کی اصلاح کا وقت نہیں آیا تھا۔ اب میرے وہ شکوک
اور شبہات نے جو انگلستان میں مجھے پریشان رکھتے تھے اور اب ختم ہو چکے
تھے بڑی تشویش ناک صورت اختیار کر لی۔ اب مجھے صاف نظر آتا تھا کہ
دیر یا سویر مجھے اس چیز کا انتخاب کرنا پڑے گا کہ آیا میں خدا کے احکام مانوں
یا آدمیوں کے حکموں کی تعمیل کروں۔

آخر ایک کرسمس کی صبح کو ان ساری باتوں نے انتہائی مشکل صورت
اختیار کر لی۔ صبح سویرے عشائے ربانی کی رسم ادا کی گئی۔ میرا دل خوشی سے
باغ باغ تھا۔ میں اپنے منجی خداوند مسیح کا بڑا ہی شکر گزار تھا کہ انہوں نے
دنیا پر بڑی مہربانی کی نظر کی اور اسے ایمان کی دولت سے سرفراز کیا ہے۔
میرے کانوں میں ابھی تک فرشتوں کے وہ الفاظ گونج رہے تھے "عالم بالا
پر خدا کی تمجید ہو اور زمین پر جن آدمیوں سے وہ راضی ہے صلح" میں
سوسائٹی کے ساتھ عشائے ربانی میں شریک ہوا۔

اس کے بعد صبح کی دعا شروع ہوئی۔ ہندوستانی عیسائیوں کی بڑی
جماعت موجود تھی۔ کوائر (گیت گانے والی پارٹی) کے لڑکوں نے سفید

لب میں چھپ رکھا تھا۔ میں کوائر کے عین پچھلی قطار میں تھا۔ بڑے دن کا گیت
بڑا شاندار تھا۔ عبادت کا آغاز ہوا۔ اتھاناسیس عقیدہ پڑھے جانے
کا اعلان ہوا۔ اس دن یہ خاص عقیدہ گایا جاتا تھا۔ یہ اعلان سن کر
میرا دل بیٹھ گیا۔ ننھے منے ہندوستانی بچوں نے جو میرے سامنے تھے
اردو میں اُسے کہنا شروع کیا۔ "اگر کوئی اس عقیدے کو مقدس نہ سمجھے، تو
بے شک وہ ابدی ہلاکت میں شریک ہوگا"۔ کوائر کے لڑکوں نے ان
الفاظ کو گایا لیکن وہ ان الفاظ کے خوفناک معانی سے بالکل بے بہرہ تھے۔
جماعت نے بڑی بے التفاتی سے جواب دیا۔ لیکن ممکن ہے کہ اس
ساری جماعت میں چند ایسے افراد بھی موجود ہوں جن کے ضمیر کو ان
الفاظ سے ٹھوکر لگ رہی ہو۔ سوشیل کی طرح کئی حساس اور عالم لوگ
اس جماعت میں حاضر تھے۔ خداوند مسیح کے مندرجہ ذیل الفاظ ہمیشہ تک
سچے ثابت ہوں گے:۔

"جو کوئی ان چھوٹوں میں سے جو مجھ پر ایمان لاتے ہیں کسی کو ٹھوکر کھلائے
گا تو اُس کے لئے بہتر ہے کہ ایک چکی کا پاٹ اُس کے گلے میں لٹکایا جائے
اور اُسے سمندر میں ڈالا جائے۔"

وہ بڑا دن میں نے بڑے غم میں گزارا۔ سوشیل اس عبادت میں شریک نہیں
ہوا تھا۔ جب میں عبادت کے بعد اُس کے ہاں گیا تو اس نے بڑی بے صبری
مگر تلخ لہجہ میں مجھ سے کہا "ہم کب تک اس غلامی کی سختیاں برداشت کرتے
رہیں گے؟" وہ مجھ سے فرمانے لگے کہ میں نے اپنے بیٹے سے کہہ دیا ہے

کہ وہ کسی صورت میں بھی مشن کی ملازمت اختیار نہ کرے۔

ایامِ گذشتہ کے متعلق جب میں سوچتا ہوں اور اپنے آپ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ میں نے ایسی باتوں کے خلاف اُس وقت کیوں نہ کھلم کھلا بغاوت کی جبکہ خدا صاف صاف لفظوں میں ہمکلام ہو رہا تھا تو اس کا جواب میں یہ دیا کرتا ہوں کہ مجھے اُس وقت یقین تھا کہ ابھی تک وہ وقت نہیں آیا کہ ایسی باتوں کے خلاف جہاد کیا جائے۔ مجھے سب سے بہتر یہ بات معلوم ہوئی کہ اس جنگ کو باطنی طور پر لڑنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں سوشیل کی ہمدردی اور رہنمائی میرے شاملِ حال تھی۔

ہندوستان میں اس سے بھی بدتر اور بُرائیاں موجود تھیں جن کے خلاف جہاد کی ضرورت تھی۔ یہاں رنگ اور نسل کی تمیز موجود تھی۔ ان باتوں نے مسیحی ایمان کے سوتوں کو دوسرے ممالک میں زہر آلود کر دیا اور اس طرح سے مسیحی ممالک میں اختلافات پیدا ہو گئے لہٰذا اس جہاد میں تباہی سے بچنے کی غرض سے اپنی حفاظت کا پورا پورا انتظام کرنا تھا۔ یہ قضیہ بڑا وسیع تھا۔ اس لئے دوسری جدوجہد کو اگرچہ وہ بڑی اہم تھی اس کے مقابلے میں چھوڑ دینا چاہیئے تھا۔

گیارہواں باب

شملہ کی پہاڑیاں

پچھلے باب میں، اگر میرے دہلی کے قیام کے زمانے کو یہ سمجھا جائے کہ میں کلیسیا کے خلاف ایک بغاوت برپا کرنے میں لگا رہا ہوں، اور تقدس مآب بشپ صاحب سے میرے تعلقات منقطع ہو گئے تھے۔ تو یہ تاثر قبول کرنا درست نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بشپ صاحب مجھ پر بے حد مہربان تھے اور وہ مجھے بہت پیار کیا کرتے تھے۔ اگر ہم کسی مسئلہ پر متفق نہیں ہو سکے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہماری محبت میں کمی واقع ہو گئی تھی۔ مجھے اس امر کا بخوبی احساس ہے کہ میرے کئی فیصلوں کی وجہ سے انہیں بڑا دکھ ہوتا تھا لیکن مجھے یہ بھی علم ہے کہ کئی معاملات میں میں نے ان کی اعانت کی ہے اور اس سے انہیں بڑی خوشی ہوئی ہے۔ بشپ صاحب موصوف جانتے تھے کہ میں خداوند مسیح کو دل سے پیار کرتا ہوں اور وہ ہم دونوں کا خداوند ہے۔

میں اپنے لاہور کے قیام کے دوران میں بشپ صاحب کی رہائش گاہ بشپ بورن میں رہا کرتا تھا۔ بشپ صاحب مجھے اپنے ہاں ٹھہرایا کرتے تھے۔ وہ بڑے پیار سے کہا کرتے تھے کہ میں تمہیں دیکھ کر بڑا ہی خوش ہوں۔ مجھے خوش آمدید کہتے وقت اُن کا چہرہ دمک اٹھتا تھا اور مصافحہ کرتے وقت

مجھے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بے حد مسرور ہیں اور اُن کی یہ خوشی حقیقی ہے۔
دہلی میں آنے سے پیشتر بشپ لیفرائے[1] صاحب مجھے ایک مثالی مسیحی مشنری نظر آتے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے وہ بہادر اور منکسر المزاج تھے۔ وہ آئرلینڈ کے رہنے والے تھے اور بڑے منس مکھ تھے۔ اُن کی طبیعت میں مزاح تھا اور وہ بڑے بلند ہمت تھے۔ اُن کے رتبہ کے نیک اور عالی وقار نسبن بشپ منٹگمری صاحب ہیں۔ اُن کا وطن مالوف بھی آئرلینڈ ہے۔ وہ اپنی زندگی کے آخری ایام بڑے آرام سے انگلستان میں گزار رہے ہیں۔ وہ بشپ لیفرائے کی طرح بڑے ہی مخیر ہیں۔ بشپ لیفرائے تو اپنے آسمانی مقام میں پہنچ چکے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام بڑے دکھ میں گزارے تاہم اُنھوں نے تمام جسمانی دکھوں کو بڑے صبر سے برداشت کیا۔
بشپ لیفرائے نظم و ضبط کے بڑے پابند تھے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کو بڑے سخت ضابطہ کے ماتحت کر رکھا تھا۔ وہ خطرات سے کبھی نہیں ڈرتے تھے۔ وہ متواتر اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ خداوند مسیح کی بادشاہت کی توسیع و اشاعت کے لئے وہ ایسے مقامات کی طرف جانے کے لئے تیار رہتے جہاں ابھی تک کوئی نہیں پہنچا۔ کسی نئے کام کو شروع کرنے کے لئے جب کبھی میں اُن کے پاس امداد کے لئے حاضر ہوتا تو وہ بڑی خندہ پیشانی سے میری بات سنتے اور میری حوصلہ افزائی فرماتے۔ مشکل کاموں کا آغاز کرنے میں اُنہیں بڑی خوشی ہوا کرتی تھی۔ وہ خداوند مسیح کے نام پر بشارتی مہمات کو شروع کیا کرتے تھے اور یوں میری خدمت کی نئی راہیں کھل جایا کرتی تھیں۔

---
[1] BISHOP LEFROY.

دہلی میں مجھے کالج کے کام میں بڑی دلچسپی تھی۔ میں بڑی خوشی سے اپنے فرائض سرانجام دیا کرتا تھا۔ میں نے سوشیل کی امداد سے شہر میں بہت سے دوست پیدا کر لیے تھے۔ اس وقت میرے دل میں یہ تمنا پھر اٹھی۔ میں غریب اور نادار لوگوں کے درمیان جا کر رہوں اور ان کی سی سادہ زندگی بسر کروں اور کالج میں درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھوں۔ سوشیل کے سوا میں نے کسی دوسرے سے اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ میں نے ان سے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔

پرانی دہلی کا ایک محلہ ہے جسے بازار منڈی کہا جاتا ہے۔ کالج سے یہ جگہ کوئی دور نہ تھی اور میں بڑی آسانی سے وہاں سائیکل پر جا سکتا تھا۔ اس محلے میں چمار رہتے تھے۔ یہ چمار اچھوت تھے اور ہندو ان سے کسی قسم کا برتاؤ نہیں رکھتے تھے۔ ان چماروں میں سے کچھ مسیحی ہو گئے تھے۔ وہاں ہم نے چھوٹا سا گرجا تعمیر کر رکھا تھا جہاں میں عبادت کرایا کرتا تھا۔ میں نے سمجھا کہ چماروں میں رہ کر بھی کالج میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا جا سکتا ہے۔

سوشیل اس معاملہ میں مجھ سے متفق تھے لیکن ڈرتا تھا کہ کہیں اس کا میری صحت پر برا اثر نہ پڑے۔ آخر کار میں نے مشن کے پرنسپل مسٹر آل نٹ[1] سے یہ بات کہی۔ انہوں نے میری درخواست بشپ صاحب کے پاس بھجوا دی۔ میں خود بشپ صاحب کے پاس لاہور حاضر ہوا۔ انہوں نے ازراہِ عنایت مجھے اس ایمان افزا کام کی اجازت دے دی۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ جب میں نے اپنے ارادے کے متعلق ان سے گفتگو کی تو انہیں بے حد خوشی ہوئی۔ لیکن جب اس تجویز پر عمل شروع ہوا تو یہ تجربہ کامیاب ثابت نہ ہوا اور

---

[1] MR. ALLNUTT.

آخرکار اس کام کو چھوڑ دینا پڑا۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ اُس زمانے میں دہلی
میں ملیریا کا متعدی مرض پھیلا ہُوا تھا۔ اس مرض نے بڑی خوفناک صورت اختیار
کر رکھی تھی اور اس بخار کی وجہ سے دہلی بدنام ہو چکی تھی۔ مجھے کئی دفعہ ملیریا بخار
ہُوا تھا جس سے ایسا معلوم ہونے لگا کہ مجھے دہلی کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر انگلستان
جا کر رہنا پڑے گا۔

بیماری کی وجہ سے میری صحت خراب ہو چکی تھی۔ اس لئے مجھے صحت
کی بحالی کی خاطر بڑی دیر تک پہاڑ پر رہنا پڑتا تھا۔ آخرکار میرے لئے یہ برکت
کا باعث ہُوا۔ اپنے پہاڑ پر قیام کے دوران میری ملاقات دو مشہور و معروف
شخصیتوں سے ہُوئی۔ اُن میں سے ایک سیموایل سٹوکس[1] تھے۔ وہ امریکہ کے
رہنے والے تھے اور اُن کا شہر فلاڈلفیا تھا ......
اُن کی وساطت سے میں سادھو سُندر سنگھ[2] کو ملا۔ اس زمانہ میں سادھو سُندر سنگھ
زندہ تھے اور پنجاب سے باہر اُنہیں کوئی نہیں جانتا تھا۔

مذکورہ بالا دونوں اصحاب میری اس تمنا کو بے حد سراہتے تھے کہ میں
غریبوں میں رہنا پسند کرتا ہوں۔ اُنہوں نے خود عملی طور پر ایسا کیا تھا۔ لفظی
طور پر اُنہوں نے سینٹ فرانسس[3] کی طرح خداوند مسیح کی پیروی کرنے کی
کوشش کی تھی۔ اُن کے پاس نہ تو بٹوا تھا نہ جھولی اور نہ دو کُرتے۔ وہ مسیح
کی خاطر بڑی خوشی سے غربت کی سختیاں جھیلنے کو تیار رہتے۔ اس قسم کی سادہ
مسیحی زندگی بسر کرنے سے اُنہوں نے پنجاب کی بے جان کلیسیا میں قربانی کا ایسا
جذبہ بیدار کر دیا تھا جس کا ذکر پہلی صدی کے مسیحیوں کے ایمان کے ساتھ کیا جاتا

---
[1] SAMUEL STOKES [2] SADHU SUNDER SINGH [3] ST. FRANSCIS.

سکتا ہے جب مردوں اور عورتوں کے دِل رُوح القُدس سے بھر گئے تھے جبکہ میری ہمت بے حد خراب تھی تو ایسے نیک سیرت انسانوں سے اس وقت مُلاقات کر کے مجھے بڑی برکت حاصل ہُوئی۔

مسٹر سٹوکس اور مس دھنونت سنگھ سے میری ملاقات پہاڑ پر ہُوئی۔ یہ دونوں بزرگ موسم سرما میں میدانی علاقے میں آجاتے اور ننگے پاؤں گاؤں گاؤں پھرا کرتے تھے۔ جب کبھی وُہ دہلی میں آتے تو وُہ سوشیل رُدھر کے ہاں ٹھہرتے۔ دو تین مرتبہ سوشیل کے ہاں مہمان ہُوئے۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک دہلی میں آتا تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ ہوتا۔ میں اُن کے ساتھ گاؤں میں اِدھر اُدھر جانے کے لئے بے چین رہتا۔ میں خُداوند مسیح کے نام کی خاطر اُن کے ساتھ ایسا سادہ زندگی بسر کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا تھا۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں جب دہلی کی گرمی اپنے شباب پر ہوتی تو میں سوشیل اور اُن کے دو بیٹے پیدل ہندوستان تبّت روڈ پر شملہ سے پانچ چھ پڑاؤ دُور نکل جاتے۔ یہاں ایک موڑ تھا۔ ہم اُس سڑک پر ایک مقام پر پہنچتے جسے براری[1] کی موڑ کہتے ہیں۔ اس جگہ ایک بیوہ مسز بیٹس[2] رہتی تھیں۔ وُہ ہمیشہ بڑی خندہ پیشانی سے ہمارا استقبال کیا کرتی تھیں۔ اپنے خاوند کی وفات کے بعد وُہ پہاڑ پر اسی جگہ رہا کرتی تھیں۔ اُن کے چائے کے باغات تھے لیکن اب اُن میں چائے کی کاشت نہیں ہوتی تھی۔ اس سڑک سے پانچ ہزار فٹ نیچے دریائے ستلج پہاڑوں میں بل کھاتا ہُوا بہتا ہے۔ یہاں سے کوہِ ہمالیہ پر برف کے سفید سفید تودے نظر آتے تھے۔ برف سے ڈھکی ہُوئی

---

[1] BARARI [2] MRS. BATES.

ان پہاڑوں کی پیشانی کو آسمان چُومتا ہے۔ اس موڑ کے آگے بُدھوں کے مندر نظر آتے ہیں۔ ہندوستان کے گاؤں یہاں ختم ہو جاتے ہیں۔ اس مقام سے تبّت زیادہ دُور نہیں ہے۔

بار تیری پہنچنے سے پہلے ہندوستان تبّت روڈ کے ذرا اُوپر برف سے ڈھکی ہُوئی پہاڑیوں کا نظّارہ بڑا ہی دلکش ہے جس دن مطلع صاف ہو برف سے ڈھکی ہُوئی پہاڑیاں نار کھنڈا سے ہی نظر آنے لگتی ہیں۔ یہ پہاڑیاں ایک نصف دائرے کی صُورت میں کھڑی ہیں اور اُن کا سلسلہ سطحِ سمندر سے چھبیس ہزار فٹ اُونچا چلا گیا ہے۔ اگر ہم ہاتو پہاڑ پر چڑھ کر دیکھیں تو یہ نظّارہ اور بھی خُوبصورت دکھائی دیتا ہے۔ اس پہاڑ پر نار کھنڈا سے چڑھ سکتے ہیں۔ دُنیا کے دورِ اوّلین کے جنگلات جن میں بہُت ہی بڑے بڑے درخت ہیں، یہاں موجود ہیں۔ جنگلات کا یہ سلسلہ بہُت ہی دُور گہری کھڈوں تک چلا گیا ہے۔ ایک دفعہ میں نے بشپ صاحب کے ساتھ نار کھنڈا کی طرف سے ہاتو پہاڑ پر چڑھنا چاہا۔ صبح کا وقت تھا ہم چاہتے تھے کہ ہم پہاڑ پر برف کا نظّارہ کریں۔ ابھی ہم پہاڑ کی چوٹی پر چڑھے ہی تھے کہ کہر چھا گئی۔ بادلوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ہم بڑے ہی مایوس ہوئے لیکن پھر بھی ہم نے ایک نفیس ترین نظّارہ دیکھ کر لطف اُٹھایا۔ ہمارے قدموں کے نیچے نیلے اور سفید رنگ کے ان گنت پھولوں کا خوبصورت فرش بچھا تھا۔ پہاڑ کی چوٹی ان پھولوں سے اٹی ہوئی تھی۔ اگرچہ ہم اُونچے پہاڑوں کا دُور سے نظّارہ نہ کر سکے لیکن ہم خدا کی خوبصورت

ف HATTU.

کاریگری کا اپنے بالکل نزدیک لطف اُٹھا سکتے تھے۔

جب ہم اس پہاڑی کے باہر نکلے ہُوئے حصّہ پر بیٹھ گئے تو لنب نما جب نے دُعائے عام کی کتاب نکالی اَور اُنہوں نے صبح کی نماز میرے ساتھ پڑھنی شروع کی۔ ہم یہ نماز ادا کرتے رہے اَور آخر کار ان الفاظ پر پہنچے "اَے خُدا، ہم تیری حمد کرتے ہیں، ہم تجھے خُداوند مانتے ہیں، ساری زمین تجھ ازلی باپ کی پرستش کرتی ہے"۔

اس کے بعد خُدا کی حمد و ثنا شروع ہُوئی:۔ "اَے مسیح! تُو جلال کا بادشاہ ہے" اَور پھر جب یہ حصّہ ختم ہُوا تو سُورج بڑی آب و تاب سے کُہر میں سے چمکنے لگا۔ بادلوں میں سے ہم نے ازلی برف کے سینوں کو دیکھا جو اپنے سفید سروں کو آسمان کی طرف اُٹھائے ہُوئے تھے اَور سُورج کی کرنوں نے اُن سروں پر سنہری تاج سجا رکھے تھے۔ ہمارے نیچے اَور ہمارے چاروں طرف بادل ہی بادل تھے۔ یہ نظّارہ جو ہم نے دیکھا، ایسا معلُوم ہوتا تھا کہ وُہ ہمارے بہشت ہی قریب لایا گیا ہے۔ وُہ نظّارہ بڑا ہی پُر شکوہ اَور خُوبصُورت تھا۔

اس نظّارے کو دیکھ کر ہم نے اپنی نماز کے دوران جبّی طور پر توقّف کیا اَور ہم نے بڑی خُوشی سے پھر ان الفاظ کو دُہرایا جو ہم نے ابھی کہے تھے:

"اَے مسیح! تُو جلال کا بادشاہ ہے تُو باپ کا ازلی بیٹا ہے"۔

یہ خوبصُورت رویا جو ہم نے دیکھی تھی بڑی دیر تک مجھے یاد رہی۔ اب مجھے سمجھ آگئی کہ خُداوند مسیح کے تین چُنے ہُوئے شاگردوں نے کس طرح

محسوس کیا تھا جب پہاڑ پر خداوند یسوع مسیح کی شکل بدل گئی تھی شاگردوں کے سامنے خداوند مسیح کا چہرہ ایسا جلالی ہو گیا تھا کہ اُن کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں اور پطرس نے کہا تھا:-

"اے خداوند ہمارا یہاں رہنا اچھا ہے"۔

ایک مرتبہ ہیموآئی سٹوکس، سادھو سُندر سنگھ کے ہمراہ اِن پہاڑیوں کے قریب پہنچے۔ یہ سال کا اختتام تھا۔ سردی اپنے پُورے شباب پر تھی۔ شدت کی سردی کی وجہ سے سادھو سُندر سنگھ کی طاقت جواب دے گئی لیکن مسٹر سٹوکس اُنہیں تھوڑی دُور آگے لے گئے۔ آخر کار ان میں بھی آگے جانے کی ہمت نہ رہی۔ اس وقت اُنہیں یقین ہو گیا کہ اُن کا آخری وقت نزدیک آن پہنچا ہے۔ سٹوکس نے مجھے بتایا ہے کہ اس وقت میں نے خداوند مسیح کو رویا میں دیکھا۔ میں سراپا کمزور ہی تھا لیکن اپنے پیارے خداوند کو رویا میں دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ خداوند نے مجھے تسلی دی اور مجھے نئی قوت بخشی۔ آخر کار وہ سردی کے سبب مرنے سے بچ گئے۔ کچھ مسافر اس طرف سے گزرے۔ اُن کے پاس خچریں تھیں۔ اُنہوں نے اُنہیں زمین پر پڑے ہوئے دیکھا اور اُنہیں اپنی خچروں پر سوار کر کے کسی محفوظ مقام پر لے گئے۔

ایک اور دفعہ کا ذکر ہے کہ جب میں، اور سوشیل، مسٹر سٹوکس اور سادھو سُندر سنگھ کے ساتھ اِن پہاڑوں پر رہا کرتے تھے تو مسٹر سٹوکس ایک طرح سے مرہی گئے تھے۔ اُنہوں نے ایک پہاڑی لڑکے کو بپتسمہ دیا۔ وہ لڑکا

بڑی مدت سے اُن کے پاس رہتا تھا اور وہ مسیحی ہونا چاہتا تھا جب پہاڑی آدمیوں نے یہ سُنا تو وہ غصے سے دیوانے ہو گئے۔ وہ اس تاک میں رہے کہ جب مسٹر سٹوکس سڑک پر آئیں تو اُن پر حملہ کر کے اُنہیں ٹھکانے لگا دیا جائے۔ ہمیں ان پہاڑی لوگوں کے ارادے کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔

میں اور سوشیل باریری میں بیٹھے ہوئے آرام سے پڑھ رہے تھے کہ اچانک ہم نے خوفناک شور کی آواز سُنی۔ ہم بڑی جلدی باہر نکل آئے۔ سوشیل کا بیٹا شند ھیر ایک نوجوان ہندوستانی مسیحی وینا ناتھ کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ وہ دونوں پہاڑی لوگوں کو پیچھے ہٹا رہے تھے۔ ہم بھی اُس طرف چل دیئے لیکن ہم دیر سے پہنچے۔ مسٹر سٹوکس کے سر پر ایک خوفناک چوٹ آئی تھی۔ اُن کا زخم بڑا بھیانک معلوم ہوتا تھا۔ وہ زمین پر مُردہ سے پڑے تھے۔ اُن کا جسم بالکل سفید دکھائی دیتا تھا۔ پہاڑی لوگ اُنہیں مُردہ سمجھ کر بھاگ گئے تھے۔

مسٹر سٹوکس ایک دن اور ایک رات بے ہوش پڑے رہے ہم اُن کے پاس بیٹھے تھے اور اُن کی کنپٹیاں برف کے پانی سے دھو رہے تھے، وہ کراہ رہے تھے، اُنہیں بڑا درد ہو رہا تھا لیکن وہ اپنے درد پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اُنہیں دیکھ کر بڑا دُکھ ہوتا تھا۔ وہ ہندی میں ایک جُملہ بار بار دُہرا رہے تھے۔ وہ ہم سے التجا کر رہے تھے کہ اُن پہاڑی لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے جنہوں نے اُنہیں قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔

جب وہ تندرست ہو گئے اور چلنے پھرنے کے قابل ہوئے تو انہوں نے اصرار کیا کہ مجھے شملہ میں ڈپٹی کمشنر صاحب کے پاس لے چلو تاکہ میں اُن آدمیوں کے لئے معافی کی درخواست کروں جنہوں نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ آخرکار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور تمام آدمیوں کو بری کر دیا گیا۔

ایسے چونکا دینے والے واقعات کے دوران بھی ہم میں مسیحی رفاقت موجود رہتی تھی۔ ہم خداوند مسیح کی خدمت کرنے میں ایک دوسرے کے شریک تھے۔ ہم کئی ماہ تک اسی حالت میں رہا کرتے تھے۔ ایک موقعہ ایسا بھی آیا کہ پہاڑوں میں ہیضہ کی وبا پھوٹ پڑی اور ہمیں بیماروں کی تیمارداری کرنی پڑی۔ خوشی اور غم میں خداوند مسیح ہمارے ساتھ تھا۔

یہ تنہائی کی جگہ اور پہاڑی ماحول سادھو سندر سنگھ کو بے حد پسند تھا۔ وہ تنہائی کے دلدادہ تھے اور خدا کے ساتھ رفاقت میں خوش رہا کرتے تھے۔ تقریباً تین ہزار فٹ بار تپری سے نیچے کوٹ گڑھ کے مقام پر ایک چھوٹا سا گرجا ہے۔ ایک عمر رسیدہ سفید ریش جرمن مشنری پادری آئی۔ بیوٹل اپنی عمر رسیدہ بیوی کے ساتھ گرمیوں اور سردیوں کے دنوں میں وہاں رہا کرتے تھے۔ اُنہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ پہاڑوں پر ہی گزارا تھا۔

مسز ان سے وڈ سٹوکس اپنے ساتھ چھوٹے چھوٹے بچے لے آئے تھے جنہیں وہ اپنا "خاندان" کہا کرتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی

روگ میں مُبتلا تھا۔ اُن میں سے ایک اندھا دُوسرا لُولا اور تیسرے کے ماں باپ کوڑھی تھے، لیکن ابھی اُس پر کوڑھ کا حملہ نہیں ہُوا تھا۔ یہ بچّے لاوارث تھے اور اُنہیں دُکھ بھرے ماحول سے نکالا گیا تھا، لیکن ان سے زیادہ خُوش و خُرّم بچّے شاید ہی دُنیا میں کسی جگہ ہوں گے۔ یہ بچّے ایک دُوسرے سے بے حد محبّت کرتے تھے۔ اُن کی ہر ایک چیز پر مُشترک تھی۔ وُہ دِن بھی کیسے سہانے تھے۔

مَیں نے اس سے پیشتر بتایا ہے کہ سادھو سُندر سنگھ جی بڑے تنہائی پسند تھے۔ وُہ کئی دفعہ کئی کئی ہفتے غائب رہا کرتے تھے لیکن پھر اچانک کہیں سے آن کر ہمارے ساتھ خدمت میں مشغُول ہو جایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں وُہ کئی سال غائب رہے اور کسی کو شبہ نہ تھا کہ وُہ کہاں ہیں۔ وُہ ساری ساری رات پہاڑ پر اکیلے دُعائیں لگے رہتے تھے۔ کوٹ گڑھ کے قریب جنگل میں ایک غار تھی۔ وُہ دِن کے وقت اس غار میں چلے جایا کرتے تھے اور یہاں خُدا سے دُعا و دھیان میں مشغُول رہتے تھے اور اس طرح سے اُن کی خُدا سے رفاقت رہتی تھی۔

مَیں نے اُن جیسی خُوبصُورت شخصیّت کہیں نہیں دیکھی۔ وُہ اپنے مالک خُداوند مسیح سے والہانہ محبّت کرتے تھے۔ خُداوند مسیح کی محبّت ہی اُن کی ہر ایک چیز کا مرکز تھا۔ اُن کی سب سے بڑی تمنّا یہ تھی کہ وُہ ہندوستان تبّت روڈ کے اختتام تک جائیں اور پھر تبّت میں داخل ہوں جہاں داخل ہونا ممنُوع تھا اور وہاں خُداوند مسیح کے نام کو کوئی نہیں جانتا۔ تبّت میں پہنچنے

کے لئے اُنہیں ایک خود وارد رستہ میں سے ہو کر جانا پڑا۔ وہ لوگ جنہوں نے اس سفر کا آخری حصّہ اُن کے ساتھ طے کیا تھا۔ اُنہوں نے مجھے بتایا کہ یہ سفر بے حد خوفناک ہے۔ سادھو سُندر سنگھ جی نے ۱۹۰۸ء میں یہ سفر طے کیا تھا اور وہ بڑی دیر تک کوٹ گڑھ سے غیر حاضر رہے تھے۔ ۱۹۱۹ء میں وُہ پھر تبت کی طرف روانہ ہُوئے۔ یہ گرمیوں کے آخری مہینوں کی بات ہے۔ اِن کی بیماری کے متعلق کسی کو کچھ معلوم نہیں ہو سکا لیکن اس سفر کے دوران اُن کی زندگی بڑے ہی خطرے میں تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ گرمیوں کے موسم میں ایک دن ہمارے دل جوش سے بھرے ہُوئے تھے۔ ہم باریری میں تھے۔ مُلک کے دُور دراز حصوں سے یہ خبر آئی کہ ایک یورپین سیاح کا نام سون ہیڈن[1] تھا۔ کچھ دنوں کے بعد وُہ مشہور سیاح اپنے تبتی رہنماؤں کے ساتھ ہمارے ہاں پہنچا۔ ہم باریری سے کوٹ گڑھ میں شام کی عبادت کے لئے گئے تھے۔ ہم نے مشن کے گرجے میں ایک داڑھی والے اجنبی کو دیکھا۔ وُہ سون ہیڈن تھے۔ اُنہوں نے اس اتوار کی شام کو ایک بڑا ہی اچھا کام کیا۔ اُنہوں نے شکرانے کے طور پر اپنی سنہری کرانومیٹر یعنی وُہ گھڑی جو ہمیشہ گرین وچ کا وقت بتاتی ہے۔ مسٹر بیوٹن کو پیش کی کہ وُہ اسے جس طرح چاہیں مشن کے کام میں صرف کریں۔ اُنہوں نے متواتر دو سال تک تبت کے پہاڑوں کی سیاحت کی تھی اور اب خُدا اُنہیں اپنے لُطف و کرم سے صحیح و سالم یہاں لایا تھا۔ یہ گھڑی اس عرصہ میں صحیح وقت دیتی رہی۔

---

[1] SEVEN HEDIN.

بارہ‌ٹی میں ایک طالب علم بنام امرناتھ بیمار تھا۔ وہ دینا ناتھ کا بھائی تھا۔ میں اُس کی تیمارداری کیا کرتا تھا۔ وہ اس سیاح کو دیکھنے کے لئے بڑا ہی بے چین تھا۔ میں نے سون ہیڈن سے التجا کی کہ وہ نارکنڈا کی طرف جاتے ہوئے اس ہندوستانی مسیحی لڑکے کو بھی دیکھتے چلیں تاکہ اُس لڑکے کی آرزو پُوری ہو جائے۔ اُنہوں نے بڑی خُوشی سے میری التجا کو قبول کیا اور وہ بڑی دیر تک اُس لڑکے کے پاس بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ وہ اُسے اپنی سیر و سیاحت کی عجیب و غریب باتیں بتا رہے تھے اور اُس لڑکے کا چہرہ خُوشی سے دمک رہا تھا۔ وہ جوان طالب علم شفایاب نہ ہو سکا اور سون ہیڈن نے جو اُس پر مہربانی فرمائی تھی، وہ اُسے ایک بے حد قیمتی تحفہ سمجھتا تھا۔ وہ اپنی مُختصر سی زندگی میں اُس سیاح کی باتوں کو یاد رکھتا رہا۔ سون ہیڈن نے روانہ ہونے سے پیشتر ہمیں بتایا کہ دو سال کے عرصہ میں اُنہوں نے صرف دو دفعہ یورپین زبان میں یورپین لوگوں سے گفتگو کی ہے۔ سب سے پہلا گروپ جن کے ساتھ اُنہوں نے بات چیت کی وہ موریوین مشنری تھے۔ جو درّے کے قریب رہتے تھے۔ وہ ان پہاڑوں میں بالکل کھو چکے تھے۔

جب تک سادھو سُندر سنگھ جی ہمارے ساتھ رہے۔ وہ تبت کے اُن باشندوں سے ملا کرتے تھے جو پہاڑوں کے راستے تبت کی طرف سے یہاں آیا کرتے تھے۔ یہ تاجر تبت سے اپنے ساتھ پشمینہ کی چیزیں لایا کرتے تھے اور اُن کے عوض ہاتھ سے بنے ہوئے کمبل اپنے وطن لے جایا کرتے تھے۔ یہ کمبل ستلج کی وادی میں رام پور کے میلہ پر سال میں صرف ایک مرتبہ

بکنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ وہ تبت کے اِن باشندوں سے اُن کی زبان سیکھا کرتے تھے کیونکہ وہ خداوند مسیح کی خاطر ایک دفعہ پھر تبت میں جا کر منادی کرنا چاہتے تھے، خواہ اُنہیں اس فعل سے موت کی سزا ہی کیوں نہ دی جاتی۔ اُنہوں نے مجھے بتایا تھا کہ تبت کی طرف اپنے پہلے سفر میں ایک تبتی عورت نے اُن کی جوانی پر رحم کر کے اُن کی جان بچائی تھی۔

سادھو جی اپنے تمام کاموں میں تنہائی پسند تھے۔ وہ ہر قسم کے دُکھ اُٹھا کر بھی خداوند مسیح کی پیروی کرنا چاہتے تھے۔ وہ مصیبت برداشت کرنے میں بڑی خوشی حاصل کیا کرتے تھے۔ جب کبھی مَیں خاموشی میں اُن کے ساتھ ہوتا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ گویا الہام ہو رہا ہے اور مَیں خداوند مسیح کی حضوری محسوس کیا کرتا تھا۔ خداوند مسیح مجھ پر رُوح کے اندیکھے ذرائع سے ظاہر ہُوا کرتا تھا۔ اس کے بعد اُنہوں نے دُنیا کے دُوسرے ممالک کے دَورے کئے۔ وہ جاپان۔ امریکہ اور یورپ تشریف لے گئے۔ اِن ممالک میں ہزاروں لوگ اُن کی باتیں سُننے کے مُشتاق تھے۔ اُن کی باتیں بڑی پاکیزہ اور پیاری ہُوا کرتی تھیں لیکن وہ ہمیشہ سادہ اور حلیم رہتے تھے۔ لوگوں نے اُن کی بے حد تعریف کی لیکن اُن پر اس کا کچھ اثر نہ ہُوا۔ وہ عموماً بھیڑ سے دُور تنہائی میں چلے جاتے اور اپنے خداوند کے ساتھ خلوتی ملاقاتیں کیا کرتے تھے۔

اب مَیں چاہتا تھا کہ اپنی زندگی کے واقعات بیان کروں۔ چار سال ہُوئے میرے دِل میں بڑی خواہش تھی کہ مَیں سادھو سُندر سنگھ جی سے مُلاقات کروں۔ وہ خاص طور پر مجھے ملنے کے لئے انڈین کرسچن چرچ، مال روڈ

شملہ بازار میں تشریف لائے ۔ اُس وقت وُہ بیمار اَور کمزور نظر آتے تھے۔
مَیں نے محسُوس کیا کہ وُہ بڑے تھکے ہُوئے اَور لاغر ہیں لیکن ہماری گفتگو
کے دوران جب کبھی خُداوند مسیح کا نام آتا تھا تو اُن کا چہرہ خُوشی سے چمک
اُٹھتا اَور اُن کے چہرے سے تھکاوٹ کے آثار بالکل دُور ہو جاتے ۔ میری
اَور اُن کی یہ آخری مُلاقات تھی ۔ اس کے بعد مَیں ہندوستان چھوڑ کر اپنے
وطن آگیا ۔ اُس وقت سے لے کر اب تک مُجھے اُن کے متعلق کسی مُعتبر
ذریعہ سے کوئی خبر نہیں ملی اگرچہ اس ضمن میں مَیں نے بہُت کوشش کی
ہے کہ اُن کے متعلق مجھے کچھُ معلُوم ہو سکے ۔ یہ خبر بڑی مشہُور ہے کہ اُن
کی بیماری بڑھ گئی ہے اَور اُن کی قوّت بینائی کم ہو گئی ہے ۔ تاہم اس کے
باوجُود اُنہوں نے ارادہ کر رکھا تھا کہ وُہ تبت میں ضرُور جائیں گے اَور وہاں
کے لوگوں میں "خُداوند مسیح کی بے قیاس دولت" کی خوشخبری کی مُنادی کریں
گے ۔ ابھی تک وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ آیا یہ خبر صحیح ہے ۔ ابھی تک یہ بھی
معلُوم نہیں ہے کہ آیا وُہ بقیدِ حیات ہیں ۔

تقریباً تین برس سے ہمیں اُن سے کوئی پیغام نہیں ملا ۔ وُہ لوگ جو
ہندوستان میں اُن کے دوست تھے اَور اُن کے ساتھ زندگی کے دن
گُزارا کرتے تھے ، جانتے تھے کہ اُن کی صحت کیسی تھی ؟ وُہ نحیف و نزار
تھے اَور اسی حالت میں وُہ تبت کی طرف روانہ ہُوئے تھے ۔ اُن کے رفیقوں
اَور دوستوں کا خیال ہے کہ وُہ عالمِ جاوداں کو سدھار چُکے ہیں ۔ ہم وثوق
سے نہیں کہہ سکتے کہ آیا وُہ جسم کی قید سے آزاد ہو چُکے ہیں ۔ اُن کی یہی

تمنّا تھی کہ وُہ اپنے منجی اور خُداوند کے پاس پہنچ جائیں۔ تاہم وُہ اپنی زندگی میں خُداوند مسیح کے نقشِ قدم پر چلتے رہے تھے۔ اُن کی زندگی اس امر کی شاہد تھی کہ کس طرح خُداوند یسُوع مسیح رُوح القدس کی قدرت سے اسی قسم کے فضل کے معجزات کر سکتا ہے جس طرح وُہ قدیم زمانہ میں کیا کرتا تھا۔ ہمارے اپنے زمانے میں سادھو سندر سنگھ کی گواہی تمام مسیحی دُنیا کے لئے ایمان افزا ہے۔

بارھواں باب

تقلید المسیح

مسٹر سٹوکس نے بشپ آف لاہور اور دیگر دوستوں کے ساتھ صلاح و مشورہ کر کے جو اُس کی تحریک سے ہمدردی رکھتے تھے۔ ایک حلقہ "تقلید المسیح" جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس حلقہ کے ہر ایک شریک پر لازم تھا کہ اپنے منجی خداوند یسوع مسیح کی زمینی زندگی کی حرف بحرف تقلید کرنے کا عہد کرے۔ خداوند یسوع مسیح کی یہ تعلیم کہ "دینا بھولنا تھا" اس حلقہ کا ایک خاصہ تھا۔ خداوند یسوع مسیح کی خاطر ہر ایک چیز کو ترک کرنا اس حلقہ میں شامل ہونے کی پہلی شرط تھی۔ نیز اس حلقے کا شریک کسی چیز کو اپنا نہیں کہہ سکتا تھا ....

غربا کی خدمت اور نگہداشت کرنا جنہیں خداوند مسیح پیار کرتا ہے اس حلقے کی خاص ذمہ داری تھی۔ اس حلقے کے شرکا کو سینٹ فرانسس کے حلقہ میں شامل ہونے والوں کی طرح "ننھے بھائی" بننا پڑتا تھا۔ جب اس "اخوت" کا سلسلہ شروع ہوا تو سیموئیل سٹوکس اور برادر ویسٹرن اس کے پورے ممبر تھے۔ موخر الذکر کیمبرج

مشن کے ایک ممبر تھے جو پچھلے چند سالوں سے سٹوکس کی طرح غربت کی زندگی بسر کرنے کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے تھے۔ سادھو سُندر سنگھ اور ولیم برانچ دونوں اِس "اخوّت" کے ساتھ مل کر کام کرتے رہتے تھے۔ وُہ غربت کی زندگی بسر کرنے میں برابر کے شریک تھے لیکن وُہ اس کے ممبر نہیں بنے تھے۔

دلّی میں میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ مَیں بھی اِس حلقے میں شامل ہو جاؤں۔ لیکن جب مَیں اپنی اس تمنّا کو پُورا نہ کر سکا تو مجھے بے حد مایُوسی ہوئی۔ مجھے بخار نہیں چھوڑتا تھا۔ اور اِس بخار نے مجھے بڑا ہی لاغر بنا دیا تھا۔ اِس لئے اس وقت اس قسم کا قدم اُٹھانے کا خیال بھی میرے لئے نا ممکن تھا۔ لیکن مَیں دل و جان سے اِن بہادر نوجوانوں کی قدر کرتا تھا جو خُداوند مسیح کی خاطر ایسی زندگی بسر کر رہے تھے۔ بشپ لیفرائے صاحب نے اِن نوجوانوں کی تہہِ دل سے حوصلہ افزائی کی تھی۔ وُہ اِس تحریک میں بڑی دلچسپی کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔ اور اُن کے نزدیک یہ تحریک اُن کے بشپی دور میں پنجاب کی کلیسیا کی ایک زبردست تحریک تھی۔ اِس سلسلہ میں لاہور کیتھیڈرل میں ایک سنجیدہ سی عبادت ہُوئی اور بشپ صاحب نے محرّکین اور اس اُخوّت کے شرکا کو برکت دی۔ اور اُنہیں خدمت کے لئے خُدا کے سپرد کیا۔

مسٹر سٹوکس پہاڑی لوگوں کے درمیان ہی رہنا چاہتے تھے۔ وُہ اِن سے اپنے سارے دِل اور اپنی ساری جان سے محبّت رکھتے تھے لیکن

ہر سال اُن کو یہ معلوم ہوتا گیا کہ پہاڑی لوگ اُن کی مسیحی خدمت کے اصل مقصد کو نہیں سمجھ سکے۔ اُن کے نزدیک مسٹر سٹوکس اپنی ہی رُوحانی ترقی کے لیے ایسا کر رہے تھے، اور یہ غلط فہمی ایسی تشویشناک صُورت اختیار کر چکی تھی کہ یہ مسیحی خدمت بالکل فضول اور بے معنی نظر آتی تھی، اور اِس سے غلط تاثر ہی لیا جا رہا تھا۔

پہاڑی لوگ بڑے خلوص سے مسٹر سٹوکس سے کہا کرتے تھے کہ "آپ کو تو بڑی آسانی سے اپنی روزی میسر ہو جاتی ہے کیونکہ آپ کے ہاں زچورو ہے نہ جاتا۔ لیکن ہم غریب لوگ جو اِس دُنیا میں گناہوں کی زندگی بسر کر رہے ہیں کس طرح مذہب کے متعلق سوچ سکتے ہیں کیونکہ ہمیں اپنی روزی بھی کمانا پڑتی ہے۔ آپ تو بڑی جلدی مکتی یا نروان حاصل کرنے کے لیے کئی مرتبہ آواگون کے چکر سے گزرنا پڑے گا۔"

مسٹر سٹوکس پر یہ بات واضح ہو گئی، کہ یہ لوگ اُسے بے گھر اور مجرد سمجھنے میں اُسے ایک عام ہندوستانی سادھو یا فقیر سے مشابہت دیتے ہیں۔ جو گاؤں گاؤں اور شہر شہر بھیک مانگتا پھرتا ہے اور اپنے طور پر نیک زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور اکثر اوقات دُنیاوی فرائض سے پہلوتہی کرتا ہے۔ لیکن وُہ لوگ اِس چیز کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ کہ جو کچھ سٹوکس کر رہا ہے وُہ محض خُداوند یسوع مسیح کی محبت کی خاطر کر رہا ہے۔ وُہ خُداوند مسیح کی خدمت کرنا چاہتا تھا، اور اُس کی خدمت بے لوث تھی۔

مسٹر سٹوکس کے سامنے ایک باعمل مسیحی ہونے کی حیثیت سے یہ ایک بنیادی مسئلہ تھا۔ کیا وہ خداوند مسیح میں ایک عملی زندگی تعمیر کر رہا ہے یا اُس کی بنیاد غلط فہمی پر ہے؟ "نیکی" کی غرض سے کسی کام کو کرنا انہیں پسند نہ تھا۔ وہ خیال کی حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اُن کے افعال اور اعمال اُس کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ وہ رات دن اِسی معیاری مسئلے کا حل تلاش کرنے میں لگے رہتے تھے۔ وہ خدا سے دُعا کیا کرتے تھے کہ وہ انہیں اِس سوال کا جواب عطا فرمائے۔ پہلے دِن سے لیکر اُس دن تک جب اِس مسئلہ نے حقیقی طور پر اُنہیں اپنی گرفت میں لے لیا تھا، اُن کے دل میں اس کا ایک ہی جواب تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اگر اُن کا صحیح مقصد یہی ہے کہ وہ ان پہاڑی لوگوں کے درمیان زندگی بسر کریں تو انہیں شادی شدہ زندگی کی تمام ذمہ داریاں اور فرائض اپنے کندھوں پر اُٹھا کر ان پہاڑی لوگوں کی طرح گھریلو زندگی بسر کرنا ہوگی۔ وہ ان پہاڑی لوگوں کے درمیان ہی رہیں گے اور اُن ہی میں شادی کریں گے تاکہ وہ ہر لحاظ سے اُن کی طرح ثابت ہوں۔

بالآخر مسٹر سٹوکس نے مجھے اس نکتہ پر اپنے دلائل سے قائل کر لیا۔ شروع شروع میں مجھے اِس بات سے بڑا ہی دُکھ ہُوا۔ کہ خداوند مسیح کی تقلید کی یہ تحریک جس کے لئے اتنی دُعائیں اور تیاریاں کی گئی ہیں ختم ہو جائے گی۔ اِس معاملہ میں تقدس مآب بشپ صاحب اُن سے متفق نہ تھے، اور انہوں نے اُن کی بڑی مخالفت کی تھی۔ لیکن

سوشیل نُرز تھیں! مسٹر سٹوکس سے متفق تھے اور اُنہوں نے اُن کی حمایت کی۔

آخر کار مسٹر سٹوکس نے ایک ہندوستانی مسیحی خاتون سے شادی کر لی۔ جو خاندانی وجاہت کے لحاظ سے راجپوتنی تھی اور اسی جگہ پہاڑی علاقے میں پیدا ہوئی تھی۔ بڑی مزے کی بات یہ ہوئی کہ ایک چینی مسیحی جو چائے کے باغات کے سلسلے میں کوٹ گڑھ آیا ہوا تھا اُس نے بھی اسی خاندان میں شادی کی تھی۔ یہ خاتون اُس کی پوتی تھی۔ اِس طرح سے مسٹر سٹوکس کے بچوں کی رگوں میں مختلف نسلوں کا خون تھا۔

مسٹر سٹوکس نے مجھے بتایا تھا کہ جب اُنہوں نے یہ فیصلہ کیا تو اُن کا دل ایک بات کی وجہ سے بہت مغموم تھا۔ ہندوستانیوں کے ساتھ یورپ کے باشندے بہت بُرا سلوک کیا کرتے تھے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو مسیحی کہتے تھے۔ اِس نسلی امتیازی سلوک کی وجہ سے میرے ضمیر کو بڑا ہی دُکھ ہُوا۔ گورے اور کالے کی یہاں تک تمیز تھی کہ قبرستان میں بھی ہندوستانی اور یورپین اکٹھے ایک دوسرے کے پہلو میں دفن نہیں کئے جا سکتے تھے۔ پنجاب میں یہ چیز بڑی عام تھی۔ اور مسیحی کلیسیا میں بھی نسلی امتیاز موجود تھا۔ اِس لئے مسٹر سٹوکس نے ایک سخت قدم اُٹھا کر بڑی فراخدلانہ بغاوت کے ذریعہ اپنی صدائے احتجاج اِس طرح سے بلند کی کہ اُنہوں نے ایک ہندوستانی مسیحی خاندان میں اپنی شادی کی اور اس طرح شادی کے مقدس رشتہ میں وہ ایک رفیقۂ حیات سے مُنسلک ہوئے جو زندگی کے ہر دُکھ اور سُکھ میں

اُن کی شریک تھی۔ انہوں نے اس چیز کو محسوس کیا کہ انہیں دیدہ و دانستہ یہ شادی کرنی چاہیئے تاکہ وہ ہندوستانی مسیحی کلیسیا کو صاف صاف بتا سکیں کہ خُداوند مسیح یسُوع میں "نہ یونانی رہا نہ یہودی۔ نہ ختنہ نہ نامختونی۔ نہ وحشی نہ سکوتی۔ نہ غلام نہ آزاد۔ صرف مسیح سب کچھ اور سب میں ہے"۔ ہندوستانی مسیحی کلیسیا کے لئے اس قسم کی مثال کی ندرت تھی۔

وُہ نقطۂ نظر جو مسٹر سٹوکس کے سامنے تھا اِس لحاظ سے ایک بڑی اعلیٰ تمنا تھی۔ اور اگرچہ میں نے ابھی تک یہ نہیں سوچا تھا کہ مسیحی شادی کی اصلی غرض و غایت کیا ہے۔ مَیں نے یہ محسُوس کیا کہ اگر صاحب موصُوف انفرادی طور پر اس قسم کا تجربہ کرنا چاہتے ہیں تو مجھے اُن کے لئے خُدا سے برکت کے لئے دُعا مانگنی چاہیئے۔ مجھے ایک چیز کا یقین تھا کہ ہمارے زمانے میں نسلی امتیاز انسانیت کا سب سے بڑا دُشمن ہے اور خُداوند مسیح کی صلیب کو اس کا سامنا کرنا پڑے گا۔

مسٹر سٹوکس کی شادی خانہ آبادی کی رسم ادا ہوئی تو "تقلیدُ المسیح" کی تحریک اُس کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد پھر یہ تحریک زندہ نہ ہو سکی۔ جب اس تحریک کا یہ حشر ہوا تو لاہور کے بشپ صاحب کو بڑا ہی صدمہ ہُوا۔ اِسی طرح دوسروں نے بھی اس صدمہ کو محسوس کیا۔ لیکن جب ہم وسیع النظری سے اس بات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے حقیر سے حقیر انسانی کاموں میں بھی اُس کی قُدرت کا ہاتھ ہے۔ ہمارے کاموں کا ایسا انجام ہوتا ہے جس کی ہمیں توقع بھی نہیں ہوتی۔ "اُخوتِ تقلیدُ المسیح" کے اچانک ٹوٹے

جانے سے سادھو سندر سنگھ جی اخوت کی سخت زنجیروں سے آزاد ہو کر
خداوند مسیح کی عالمگیر کلیسیا کی خدمت میں مشغول ہو گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ
وہ اخوتِ تقلیدُ المسیح میں رہ کر سادھو سندر سنگھ جی اُس مقام تک نہ پہنچتے
جس پر وہ مذکورہ اخوت سے علیحدہ ہو کر پہنچے۔ وہ مسیحی دُنیا میں بیحد مشہور
ہوئے۔ مشرق و مغرب میں لاکھوں سادہ ایمان لوگ اُنہیں اِس وجہ سے
چاہنے لگے کیونکہ اُن کا ایمان خداوند مسیح پر تھا۔ جب تک اخوت کے منتظمِ
اعلیٰ اُنہیں یہ راستہ اختیار کرنے کی اجازت نہ دیتے وہ یہ کام ہرگز نہیں کر
سکتے تھے غالباً وہ اپنی تنہائی پسندی کی وجہ سے کسی تحریک میں شامل ہونے
کے لئے موزوں نہ تھے۔ وہ تنہائی میں خداوند مسیح کے قدموں میں رہنا پسند
کرتے تھے اور وہ خداوند کی ہدایت اور رہنمائی میں ہی اپنا کام کیا کرتے تھے۔
اِس اخوت کے تیسرے رکن برادر ویسٹرن تھے۔ وہ بھی ایک خاص خدمت
سرانجام دینے کے لیے آزاد ہو گئے تھے۔ حضرت اُن کی ذات ہی اِس مقام کے
لیے موزوں تھی۔ خدا نے اُنہیں کسی اور مقام پر کلیسیائی خدمت کے لیے استعمال
کیا ہے۔ وہ خدا کا مقصد پورا کر رہے ہیں۔ اور وہ جنوبی ہند میں تناولی کے
بشپ ہیں۔ جو ایک بہت بڑی ہندوستانی مسیحی جماعت کے خادم الدین ہیں۔
یہ مسیحی کلیسیا بہت زیادہ غریب ہے۔ لوگ اُن کا بہت زیادہ احترام کرتے
ہیں اور اُنہیں دل سے پیار کرتے ہیں، کیونکہ اُنہوں نے خداوند مسیح کی خدمت
کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے اور اُن کی زندگی مخصوص شدہ زندگی ہے۔
میں نے ہیموائیل سٹوکس، سادھو سندر سنگھ اور دیگر لوگوں کی زندگیوں کا

ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا ہے ۔ اسی ضمن میں مَیں نے اپنی زندگی کی کہانی بھی بیان کر دی ہے ۔ کہ مَیں نے کس طرح ہندوستان میں بڑے شاندار اور عجیب و غریب طریقوں سے اُس کی حضوری کو محسوس کیا ہے ۔ میرا دل خوشی سے پھولا نہیں سماتا کہ مَیں نے آخرکار خدمت کرنے کا صحیح راستہ تلاش کر لیا ہے ۔

اُخوتِ تقلیدِ المسیح کی ہر تفصیل، اصول اور اس تحریک کے سب سے بڑے محرکین کے خیالات کا مَیں نے بڑے ذوق و شوق سے مُطالعہ کیا ہے ۔ اگر میری علالت میرے راستے میں حائل نہ ہوتی تو مَیں مسٹر سٹوکس کی قیادت میں ضرور اس تحریک میں شامل ہوتا ۔

یہ بات بڑی عجیب ہے کہ مسٹر سٹوکس کا یہ خیال تھا کہ خطرہ ہے کہ ہندوستان میں برہمچاریہ (مجرّدانہ) زندگی گرہستھ زندگی (شادی شدہ) سے بلند سمجھی جانے لگے گی ۔ مَیں نے اس سے پیشتر اِن کے نقطۂ نگاہ کو نہیں سمجھا تھا ۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ اِس قسم کی زندگی خُداوند مسیح کے اپنے معیار کے خلاف ہے ۔ خُداوند مسیح نے شادی کو بڑی عزت بخشی ہے اور اُسے سیکرامنٹ قرار دیا ہے ۔ اور فرمایا کہ خُدا نے آدم اور حوّا کو پیدا کیا ۔ خُداوند مسیح نے خاندانی زندگی کو ایسا مقدّس قرار دیا ہے کہ چھوٹے بچّوں کو زمین پر آسمانی بادشاہت کا وارث قرار دیا ہے ۔ اِس لئے برہمچاریہ زندگی کو مرد اور عورت کی شادی شدہ زندگی سے بلند زندگی خیال کرنا خُداوند مسیح اور اُس کے کلام سے دُور رہ کر اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں مارنا ہے ۔

اب میرے لئے بھی ضروری تھا کہ مَیں بھی اپنے لئے خُداوند مسیح کی تعلیم

کی روشنی میں اِس سوال کے متعلق فیصلہ کروں کیونکہ میرے متعلق بھی غلط
فہمی پیدا ہونے کا خطرہ تھا۔ کیونکہ مَیں بھی شادی شدہ نہیں تھا۔ لیکن مشرق
کی سرزمین میں اپنی مسافت کے دوران مجھے اِس قسم کی زندگی بسر کرنا پڑتی
تھی اور میرے متعلق اِس قسم کی غلط فہمی پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں
ہوتا تھا۔ مسٹر سیموایل سٹوکس کی بات دوسری ہے۔

مَیں نے بیس سال ہندوستان میں گزارے ہیں۔ مَیں نے اِس زمانہ میں
مختلف قسم کے مسیحی تجربات حاصل کیے ہیں۔ مَیں مسٹر سٹوکس، سادھو سُندر سنگھ
اور سوشیل رُدھرا کے ساتھ شملہ کی پہاڑیوں میں رہتا رہا ہوں۔ ایام گذشتہ
کے متعلق سوچتا ہوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے کی نسبت آج
مجھے یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ رُوحانی بادشاہت میں ایک اصول پایا
جاتا ہے جس کا خداوند مسیح نے گندم کے دانے کی نادر تشبیہہ کے ذریعہ
اظہار کیا ہے کہ دانہ زمین میں گر کر مرجاتا ہے اور بہت پھل لاتا ہے۔ یہ
دانہ زمین میں گر کر مرنے سے پیشتر اکیلا ہوتا ہے لیکن جب وہ مرجاتا
ہے تو بہت سا پھل لاتا ہے۔

اِس لیے "اخوتِ تقلیدُ المسیح" کا وہ بیج جو مسٹر سٹوکس اور اُن کے
رفقائے کار نے ہندوستان کی بارآور زمین میں بویا تھا۔ اُسے قدر کی
نگاہوں سے دیکھنا ممکن ہے۔ اگرچہ مسٹر سٹوکس کی شادی کے ساتھ ہی
اخوت کی یہ تحریک اپنی قدرتی موت مرگئی۔ لیکن یہ خیال ہندوستانی مسیحی
کلیسیا میں بڑی خوبصورت شکل میں ازسرنو نشو ونما پانے لگا۔ ترہی پیتر،

المورڑا اَور دوسرے مقامات پر مسیحی آشرم کھولے گئے۔ پُونا میں کرسٹا سیوا سنگھ اَور اسی قسم کی دیگر ایمان کی تحریکات ظاہر کرتی ہیں کہ خُداوند مسیح ابھی تک لوگوں کو بُلا رہا ہے کہ وُہ غُربا، بے یارو مددگار اور کھوئے ہوئے لوگوں کو کلام کی خوشخبری سنائیں۔ وُہ بلا بہت کئی طریقوں سے ہم تک پہنچ سکتی ہَے اور ہمیں اُس کی آمد کا منتظر رہنا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے کہ وُہ اُس وقت تک آئے جب رات طوفانی اور تاریک ہو اَور اُس کی روشنی ایسی ہو جیسے بجلی کوندتی ہَے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وُہ دوپہر کے وقت آئے جب گرمی اپنے جوبن پر ہو اور مسافر دن بھر کے کام سے تھک کر چُور ہو چکا ہو۔ یا وُہ صبح کے وقت آئے۔ جب چاروں طرف خاموشی ہوتی ہے۔ یا وُہ غروبِ آفتاب کے وقت آ جائے۔ ہماری کمریں کسی رہنی چاہئیں اور ہمارے دل اُن لوگوں کی طرح اُمید سے روشن رہنے چاہئیں جو خُداوند کی آمد کے منتظر ہیں۔

تیرھواں باب

البرٹ شوائزر

میں جس زمانہ میں خداوند مسیح کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کر رہا تھا
اور اُس کی مرضی کو بجالانے کی عملی مشکلات میرے سامنے تھیں، اُس
وقت ایک عظیم الشان مسیحی البرٹ شوائزر تھا۔ مجھے اُنکی روحانی ملاقات کا شرف
حاصل ہوا۔ میری اُن سے اُن کی تحریروں کے ذریعہ سے شناسائی ہوئی تھی۔
یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب میں دہلی میں تھا اور میرے سامنے بے شمار
ذہنی مشکلات تھیں۔ وہ سمندر پار رہتے تھے لیکن اُن کے ساتھ مراسم
کی وجہ سے میری تمام مشکلات اِس طرح کافور ہو گئیں جس طرح تازہ ہوا کی
رَو ذہن کے تمام گرد و غبار کو صاف کر کے اُسے از سرِ نو جلا بخشتی ہے۔
پہلے پہل تو اُن کی تحریروں سے ہی میں نے استفادہ حاصل کیا لیکن اِس سے
میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب ہم دونوں میں ذاتی دوستی کا رشتہ استوار ہوا۔
مسٹر شوائزر نے ایک کتاب موسومہ بہ "دی کوئسٹ آف دی
ہسٹوریکل جیزز" تصنیف فرمائی ہے۔ اِس کتاب کے مطالعہ کے بعد
میری اُن سے شناسائی کا آغاز ہوا۔ بعض اوقات کسی کتاب کی ایک جلد
ہی زندگی کے زاویۂ نگاہ کو تبدیل کر دیتی ہے۔ میری زندگی پر اِس عظیم الشان

کتاب کے مطالعہ سے کچھ اسی قسم کا اثر ہُوا۔ اِس کتاب کے آخری باب نے مجھے بیحد متاثر کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مصنف براہ راست میری رُوح سے ہمکلام ہے۔ مشرق کی سرزمین میں آنے کے بعد میں اپنا زیادہ تر وقت انجیل مقدس اور صحیفوں کے مطالعہ میں صرف کیا کرتا تھا۔ میں ہر بات میں اِن تواریخی صحیفوں کا مشرق کی مقدس کتابوں کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ جُوں جُوں میں اپنے مطالعہ میں ترقی کرتا گیا، تُوں تُوں ہمیشہ یہ دلیل میرے ذہن میں رہنے لگی، کہ اگر کرشن اور مہاتما بدھ کی کہانیاں فرضی افسانوں سے پُر ہیں تو انجیل مقدس میں مسیح یسُوع کی کہانی کا بھی شاید یہی حشر ہُوا ہوگا۔

ہم کس طرح حقیقت کو افسانے سے اور افسانے کو حقیقت سے ممیّز کر سکتے ہیں؟ مسیحیوں کو کس طرح سے یقین ہو سکتا ہے کہ خداوند مسیح کی کہانی افسانوی رنگ کی نہیں ہے اور نہ ہی یہ افسانہ ہے؟

زندگی کے اِن لمحات میں میرے دِل پر افسردگی اور میرے جسم میں نقاہت ہوتی تھی کیونکہ میرے خُون میں ملیریا کے جراثیم تھے اور یہی روگ میری زندگی کو کھائے جا رہا تھا۔ میرے لئے ایسی حالت میں اِن مشکلات کے متعلق تنقیدی نگاہ سے غور کرنا بڑا ہی محال تھا۔ یہ مشکلات میرے سامنے گویا بلائیں تھیں۔ کیمبرج میں اسی قسم کی دلائل میرے سامنے کسی اور شکل میں آیا کرتی تھیں۔ لیکن اب میں کیمبرج کے علوم سے دُور تھا۔ اور اب مجھے نئے مسائل کو حل کرنے کے لئے اسی علم کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ جو ہندوستان میں

میسر آسکتا تھا۔ اگرچہ دہلی اور لاہور میں لائبریریاں تو تھیں لیکن کتابیں حاصل کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ میرے سامنے اِن گنت مشکلات تھیں جن کا مجھے حل درکار تھا۔ اور جب میرے سامنے دُوسرے کام بھی ہوتے تھے تو میں اِن مشکلات کی وجہ سے گھبرا جاتا تھا۔ یہ سوال کہ کیا انجیلِ مقدس بھی ایک فرضی افسانہ یا روایت ہے میری کئی مشکلات میں سے ایک تھی۔ لیکن مجھے فوراً معلوم ہو جاتا تھا۔ کہ جب کوئی سوال حل نہیں ہو سکتا تو اِس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ وہ حقیقت جسے رُوحانی طور پر سمجھ چکا تھا اب اِس کے متعلق میرے دِل میں شُبہات پیدا ہو رہے تھے۔ اِنسانی زندگی ایک ایسی پیچیدہ چیز ہے کہ جب میں ایک طرف ذہنی بے یقینی میں مبتلا تھا تو دوسری طرف اخلاقی مسائل زیادہ مشکل ہو رہے تھے۔

مُقدّس یوحنّا رسُول کی انجیل میں مرقوم ہے۔

"تھوڑی دیر میں تُم مجھے نہ دیکھو گے اور پھر تھوڑی دیر میں مجھے دیکھ لوگے۔"

میری ساری زندگی میں یہ بات ہمیشہ سچ ثابت ہوئی ہے۔ بعض اوقات میں نے اُس کی حضوری کو اپنے اتنا قریب سمجھا کہ مجھے کسی گواہ کی ضرورت ہی نہ رہی، اور میں اپنی تمام مشکلات اور شُبہات پر ہنستا رہا ہُوں۔ مَیں بھی خُداوند مسیح کے شاگردوں کی طرح کہہ سکتا ہُوں کہ:۔

"دیکھ اب تُو صاف صاف کہتا ہے اور کوئی تمثیل نہیں کہتا اب ہم جان گئے کہ تُو سب کچھ جانتا ہے اور اِس کا محتاج نہیں کہ کوئی تجھ سے پُوچھے۔ اِس سبب سے ہم ایمان لاتے ہیں کہ تُو خُدا سے نکلا ہے"

لیکن بعض اوقات میرے چاروں طرف تاریکی چھا گئی۔ بادلوں نے اِس

صاف رویا کو دھندلا بنا دیا ہے اور میں نے اِس ضرورت کو بیحد محسوس کیا ہے۔ کہ میں اُس ایمان اور اُمید پر قائم رہوں جو رُوح کے لنگر ہیں۔

جب میں دہلی میں مقیم تھا تو شکوک کے اُن لمحات میں سوشیل رُدھرا براہِ راست میری کوئی امداد نہیں کر سکتے تھے۔ تاہم اُن کی ہمدردیاں اور محبت ہمیشہ میرے شاملِ حال رہیں۔ اُنہیں اپنے ایمان کے متعلق خاص قسم کی مشکلات درپیش تھیں۔ لیکن اُنہوں نے اِن مشکلات پر ہمیشہ فتح پائی۔ اگرچہ وہ خداوند مسیح کو دل کی گہرائیوں سے پیار کرتے تھے۔ مگر اُن کی علمی اور ذہنی فطرت ایسی تھی کہ وہ میری طرح تذبذب کی حالت میں رہا کرتے تھے۔ لیکن اس کے برعکس سادھو سندر سنگھ جی کا ایمان بچے کی طرح معصوم تھا۔ اُن کی جرأت ہر وقت درخشندہ رہتی تھی۔ جب کبھی میری اُن سے ملاقات ہوتی تو مجھے ایک گونہ خوشی نصیب ہوئی۔" وہ ایک کامل مسیحی سردار تھے" وہ اُن آدمیوں کی طرح تھے جن کا دل پاک ہوتا ہے اور وہ خدا کو دیکھتے ہیں۔

مَیں رُوحانی تذبذب میں مُبتلا اور بے یقینی کے سیلاب میں گھرا ہُوا تھا۔ اِن حالات میں مسٹر شوائٹزر کی کتاب میرے لئے تحفۂ ربانی ثابت ہوئی۔ جس نے میرے بوجھ کو ہلکا کر دیا۔ اُنہوں نے ایک عالم کی حیثیت سے نئے عہد نامہ کی مُشکلات کی تشریح فرمائی جنہیں میں بڑی اچھی طرح سے جانتا تھا۔ اُنہوں نے اُن تواریخی سوالات کا جواب بھی دیا جن کا اس کے ساتھ تعلق تھا۔ اُنہوں نے اُن تمام بڑے بڑے سوالات کا گہرا مطالعہ کیا جن کا خداوند مسیح کی زندگی کے ساتھ تعلق ہے۔ اُنہوں نے اس کتاب میں صاف طور پر بیان کیا کہ کس طرح

خداوند مسیح نے مخالفت کی اور ہر زمانے کے مقبول عام عقائد کو چیلنج کیا۔ اُنہوں نے خداوند مسیح کے لئے روحانی تابعداری کا مطالبہ کیا۔

مَیں اُن کی کتاب کے آخری باب سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ اُنہوں نے خداوند مسیح کے متعلق جو دلائل اور تشریحات پیش کی ہیں، وہ کسی فلسفی کے منطق نہیں ہیں بلکہ ایک ولی اللہ کی عقیدت اور محبت کا اظہار ہے۔ مَیں اُن کی کتاب میں سے ایک مختصر سا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔

اگر ہم انجیل مقدس میں سے خداوند مسیح کی زندگی کے صرف مافوق الفطرت حصّے کو ہی پیش کریں اور باقی ماندہ واقعات کو چھوڑ دیں تو کوئی تذکرہ بھی تاریخی حقائق کے مطابق نہیں ہوگا۔ خداوند یسُوع مسیح کو زنجیر و رسن کر کے اُنیسویں صدی کے سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ اِس صدی کے عُلماء نے اِسی قسم کی کوشش کی ہے، لیکن وہ تمام زمانوں کے لئے تھا۔ وہ سوفسطائی یعنی فقیہہ نہیں تھا جو مذہبی اور اخلاقی احکام کا اطلاق خاص خاص صورتوں میں کرتا، اور اُس کی مختلف تاویلات پر ہی غور کرتا اور اُن میں مستثنیات کرتا۔ وہ محض معلّم یا اُستاد ہی نہ تھا۔ بلکہ وہ ایک زبردست حاکم تھا۔ جو رُوح کی تابعداری کا مطالبہ کرتا تھا۔ جہاں کہیں اُس کی محیر العقول شخصیت کا ظہور ہوتا ہے۔ وہاں فضل و سچائی کے معجزات نظر آتے ہیں۔ یہ معجزات اُس کی آمد کا نشان ہیں۔ وہ لوگ معجزات کے دَور میں رہتے تھے، اور تمام معجزات سے بڑا معجزہ خداوند مسیح کی پیدائش تھا۔

مسٹر شوائسزر اپنی اس کتاب میں مندرجہ ذیل استفسار کرتے ہیں :-
کیا ہم آج ایمانداری اور خلوص سے خداوند مسیح کو اپنی زندگی کا رہنما قبول کرتے ہیں ؟
کیا ہم پہلے زمانہ کے شاگردوں کی طرح سب کچھ چھوڑ کر اُس کے پیچھے ہو لینے کے لئے تیار ہیں ؟
اگر خداوند مسیح کے رسول اپنے آقا کے دوبارہ آمد ثانی کے منتظر ہونے میں غلطی پر تھے تو کیا تاریخی طور پر وہ ایسا سمجھنے میں حق بجانب ثابت نہیں ہوتے
وہ کونسی عجیب و غریب منفرد جیسی روحانی اپیل تھی جس نے ہر زمانہ میں انسانوں کو اپنی طرف کھینچے رکھا ہے ؟
اگر وہ سچا نہیں تھا تو دنیا میں اُس کے ابدی اثر کا معمہ کس طرح سے حل ہو سکتا ہے ؟
مسٹر شوائسزر نے تاریخی یسوع یعنی تاریخ انسانی کی سب سے افضل شخصیت" کے متعلق جو تلاش کی ہے، اس کے متعلق اس مشہور کتاب کے اختتام میں یہ مندرج ہے :-
"مسیح ہمارے پاس ایک نامعلوم شخص کی طرح آتا ہے جس کا کوئی نام نہیں ہے جس طرح وہ پرانے زمانہ میں جھیل کے کنارے سے اُن آدمیوں کو ملا تھا جو اُسے نہیں جانتے تھے اسی طرح وہ ہمارے پاس بھی آتا ہے ۔ وہ ہمیں بھی وہی الفاظ کہتا ہے :- "میرے پیچھے ہو لے" وہ ہمیں وہ کام کرنے کو کہتا ہے جسے وہ ہمارے زمانے میں پورا کرنا چاہتا ہے وہ حکم دیتا

ہے اور وہ لوگ جو اُس کا حکم مانتے ہیں، خواہ وہ دانشمند ہوں یا سادہ مزاج۔ وہ مشکلات، جد و جہد اور مصائب میں اپنے آپ کو اُن پر ظاہر کرتا ہے۔ وہ لوگ اس ناقابلِ بیان راز کو اپنے تجربہ سے معلوم کریں گے کہ وہ کون ہے"؟

مسٹر شوائٹزر کی بدولت میں زندہ مسیح کے قدموں میں پھر واپس آگیا جیسے میں اپنی زندگی کے بہترین ایام میں جانتا تھا اور پیار کرتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے میرے دل کے راز کو جان لیا ہے اور اُس نے وہی بات کہہ دی ہے جو میرے دل میں تھی۔

مسٹر شوائٹزر کی کتاب میں ایک اور بات بھی تھی جس کی مجھے بڑی اچھی طرح سے سمجھ آگئی ہے۔ مصنف خداوند یسوع کی سچی تصویر کی تلاش میں پہلی صدی کی کلیسیا تک پہنچتا ہے جس کی توقعات درخشندہ اور اُمیدیں شاندار تھیں۔ وہ کتاب مقدس کے ان حوالہ جات کو جن میں خداوند مسیح کی آمدِ ثانی کا ذکر ہے، نظرانداز نہیں کرتا بلکہ اُن پر زور دیتا ہے جس طرح ابتدائی شاگردوں نے، فوق الفطرت ہونے کے سیاق منظر کا تجربہ کیا تھا اُنہوں نے اُسے بحال کر دیا ہے۔

مذکورہ مصنف کی کتاب کے مطالعہ سے میں زندگی کے ابتدائی زمانہ کی طرف لوٹ آیا۔ مجھے اپنے ماں باپ، اپنے گھر، رسولی کلیسیا اور ما فوق الفطرت رویا کی یاد آئی۔ میں اس کے متعلق از سرِ نو سوچنے پر مجبور ہوا اور اپنی زندگی کے لئے اس کے معانی تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

مجھے یہ بات صاف نظر آتی تھی کہ اب میں اپنے ماں باپ کے لفظی معتقدات

کی طرف نہیں لَوٹ سکتا تھا، اگرچہ میرے والد صاحب اپنے ہر ایک خط میں کسی "پیشین گوئی" کے متعلق ضرور لکھا کرتے تھے جن کا اُنہیں مکاشفہ ہوتا تھا۔ وُہ ہر روز اُس کی آمد کے منتظر رہتے تھے۔ اب مَیں اپنے باپ کے بچّوں کے سے ایمان کے ساتھ یہ یقین نہیں کر سکتا تھا کہ اگر خُدا کی مرضی ہو تو قانُونِ قُدرت کے خلاف بھی واقعات ظہُور میں آ سکتے ہیں لیکن مَیں اپنے دِل سے فضل کی ایک مافوق الفطرت بادشاہی پر ایمان رکھتا تھا کیونکہ مُجھے اس کا تجربہ تھا۔ مُجھے خُدا کے ساتھ رُوح کی زندگی کی اُمید تھی کیونکہ وُہ نئی زندگی بخشنے والا ہے اَور وُہی ظاہر اَور باطن میں فوق ہے۔ اب مَیں اس کے متعلق کوئی سوال نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اب یہ میری ہستی کا بھی جزو بن چکا تھا!

میرے والدِ محترم کے جسم پر ظاہری شکل میں "خُداوند مسیح کے داغ" تھے۔ اُن کا چہرہ خُداوند مسیح جیسے کردار کا آئینہ تھا۔ اُن کا ایمان اپنے خُداوند اَور مُنجی یسُوع مسیح پر بچّوں کی طرح سادہ تھا اَور اُن کا ایمان اُن کے بلند کردار اَور اُن کی خوش اخلاقی سے ظاہر ہوتا تھا۔ خُداوند کی "آمدِ ثانی" کی تفصیلات کے متعلق اگرچہ اُن میں کُچھ خامیاں پائی جاتی تھیں لیکن اُنہوں نے ایمان، اُمید اَور محبّت جیسی دائمی نعمتیں حاصل کر لی تھیں۔ اب میرا یہ فرض تھا کہ مَیں وسیع پیمانے پر اُن کی بے انتہا خُوشی، درخشندہ اُمید اَور جذبۂ خدمت کو اپنی ہستی میں سمو لُوں کیونکہ اُن کی مسیحی زندگی میں یہ تمام چیزیں موجُود تھیں اس لئے اب مُجھے اپنے تجربات کا از سرِ نَو جائزہ لینا پڑا تاکہ مَیں اُس اساس کی آزمائش کر سکُوں جس پر مَیں نے اپنے ایمان کی عمارت کو تعمیر کیا ہے۔ اس گھر کی بُنیاد ریت پر نہیں بلکہ کسی

مضبوط چٹان پر ہونی چاہیئے۔

البرٹ شوائیزر نے ایک اور طرح بھی میری بڑی امداد فرمائی تھی۔ اُنہوں نے اپنی زندگی سے مثالیں پیش کی تھیں اور فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ بلا جھجک اپنے تجربات کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش کریں گے اور وہ نہ صرف قولاً بلکہ فعلاً تواریخی یسوعؔ کی تلاش کرتے رہیں گے۔ وہ یورپ کے ایک بے مثل عالم اور موسیقی کے ماہر اُستاد تھے۔ اُنہوں نے اِن چیزوں کو بالکل چھوڑ دیا تھا اور ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی تھی تاکہ وہ افریقہ کے اس گرم مُلک میں خدمت کی غرض سے جاسکیں، جہاں صدیوں سے انسانیت پر مظالم ڈھائے جارہے ہیں اور جہاں اُن کے بدنما داغ باقی ہیں۔ وہاں کے باشندے ظلم و ستم کی وجہ سے بڑی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ چنانچہ وہ افریقہ کے اُستوائی خطے میں دریائے اوگوو[1] کے کنارے لمبرنی[2] کے مقام پر پہنچے۔ اس علاقہ میں ملیریا بخار کی فراوانی ہے۔ اُنہوں نے خداوند مسیح کی خاطر بیماروں اور دُکھیوں کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی۔ ایک اچھے طبیب کی طرح اُنہوں نے انجیل مقدس کے احکام کی حرف بحرف تعمیل کی ہے۔ اُنہوں نے خداوند مسیح کی پیروی کرتے ہوئے اپنا سب کچھ اُس کی راہ میں دے دیا ہے۔

افریقہ کے اُس گرم خطہ میں جہاں چاروں طرف سنسان جنگل ہیں اُنہوں نے خداوند مسیح کی حضوری کا لطف اُٹھایا ہے۔ اُن کی زندگی کے ہر ایک شعبہ میں اُنہیں مافوق الفطرت رہنمائی میسر ہے اور ابھی تک وہ اپنا کام بطریق احسن سرانجام دے رہے ہیں۔ بے شک اُنہوں نے بڑے مصائب برداشت

۱؎ OGOWA ۲؎ LAMBERENE

کیئے ہیں تو بھی خداوند مسیح کی خاطر غریبوں کی خدمت میں اُنہیں اس سے بھی زیادہ خوشی حاصل ہوئی ہے۔

البرٹ شوائٹزر کے نزدیک خداوند مسیح کوئی ایسی شخصیت نہیں ہے جو کسی گذشتہ زمانہ میں ہو گذری ہے اور جس کی زندگی کے حالات صرف علماء ہی قدیم تذکروں میں تلاش کر کے مطالعہ کر سکتے ہیں، بلکہ وہ بنی نوع انسان کے دلوں میں رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بنی نوع انسان نے اب معلوم کر لیا ہے کہ خداوند مسیح کی تلاش کے لئے کس قسم کے صبر اور تحمل کی ضرورت ہے۔ خداوند مسیح کو ہر زمانہ میں نئے جذبۂ خدمت کے ساتھ تلاش کرنا چاہیئے۔ ہر ایک ملک میں اُس سے محبت کرنے والے ایسے نڈر لوگ موجود ہیں جنہوں نے اُسے تلاش کر لیا ہے اور وہ اُسے جانتے ہیں۔ خداوند مسیح تمام قسم کے رسم و رواج کو چیلنج دیتا ہے۔ اُس کی آمدِ ثانی کا وقت بہت نازک ہے، اُس کے ساتھ ہی دنیا کی عدالت بھی ہوگی۔ اُس وقت اُس کے نام سے شکست فتح میں تبدیل ہو جائیگی۔ مسیح رہنمائی کرتا ہے۔ وہ زندہ رہنے کے لئے مرتا ہے۔ اور جہان بچانے کی خاطر اُسے کھوتا ہے۔

جب میں یورپ میں تھا تو مجھے البرٹ شوائٹزر کے ساتھ رہنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ آج کل کے زمانہ میں جاپان کے کگاوا اور سادھو سُندر سنگھ کے علاوہ (اگر وہ زندہ ہیں) کوئی شخص بھی تقلیدِ یسوع میں زندگی نہیں گزار رہا۔ اُن کے جذبۂ قربانی نے دُنیا پر عیاں کر دیا ہے کہ خداوند مسیح اُن کے لئے کیا کچھ ہے۔ وہ اپنی تمام زندگی میں ایک ننھے بچے کی طرح سادہ رہے ہیں۔ اُن کا

اور اُن کے اُس زندہ خداوند یسُوع مسیح کے رنگ میں ڈھلتا رہا ہے جس کی وُہ عبادت کیا کرتے تھے۔

ایبرٹ شوائٹزر کی کتاب کے مطالعہ سے مجھ پر یہ بات واضح ہُوئی کہ میری گھریلو ابتدائی تعلیم و تربیت کا بھی کوئی خاص الٰہی مقصد تھا۔ اگرچہ میں بڑا ہی حقیر تھا تاہم خدا مجھے توفیق دے رہا تھا کہ میں بھی تاریخی یسُوع کی تلاش کروں۔ مجھے بھی خداوند مسیح کی خاطر دُعا کرنی چاہیئے اور رُوح کے مافوق الفطرت انعامات کی بحالی کے لئے خدمت میں منہمک رہنا چاہیئے کیونکہ اس قسم کے انعامات کا ظہُور ابتدائی کلیسیا میں ہُوا کرتا تھا۔ مجھے خداوند یسُوع مسیح کی تلاش کرنی چاہیئے تاکہ وُہ مجھے مِل جائے۔ مجھے انسانی دُکھوں میں اُسے تلاش کرنا ہے۔ مجھے اُس کی حمد و ثنا کرنی چاہیئے محض الفاظ ہی کافی نہیں ہیں بلکہ مجھے دُنیا کے ہر خطّہ کے لوگوں کی خدمت کرنا چاہیئے۔ مجھے خداوند کے ابتدائی شاگردوں کی طرح اُس کی حضوری کا احساس ہونا چاہیئے۔ اُس کے شاگردوں کے متعلق لکھا ہے کہ وُہ اُنہیں صبح کے وقت جھیل کے کنارے ملا تھا۔ مجھے بھی اُس کی آواز سُننی چاہیئے جو یہ کہتا ہے "میرے پیچھے ہو لو"

اُس زمانہ میں جب دُنیا میں ظلم و ستم کی حکمرانی تھی اور بیماریاں بنی نوع انسان کو مصائب میں گرفتار کیئے ہُوئے تھیں اور رنج و الم اور بے یقینی سے ہاں رُوح تھی، تو رسُولی کلیسیا رُوح کے انعامات سے سرفراز ہُوئی۔ ہمیں بھی ایک دفعہ پھر پہلی صدی کے مسیحیوں کی طرح ایمان میں مستحکم بننے کی ضرورت ہے۔

ابتدائی کلیسیا نے اپنے ذوق شوق اور ناتجربہ کاری کے باوجود خداوند مسیح کی آمد کے مسئلہ کو بڑا ہی آسان بنا لیا تھا۔ میرے اپنے عزیز و محترم والد بزرگوار کی طرح وہ کلیسیا بھی نیم تعلیم خواندہ تھی لیکن خداوند مسیح نے اس مرکزی اُمید میں کبھی شک پیدا نہیں ہونے دیا تھا کہ اس گناہ اور موت کی دُنیا میں خدا کا فضل معجزانہ طریقے سے دخل دیتا ہے۔ یہی خوشخبری یعنی انجیل تھی یہی سچی اور حقیقی خدا کی بادشاہت تھی جسے خداوند مسیح آشکارا کرنے کے لئے آیا تھا۔ وہ ابتدائی شاگرد رُوح القدس کے زور اور نزول کے شعور رکھتے تھے اور انہیں اس بات کا احساس تھا کہ وہ روحانی دُنیا میں چل پھر رہے تھے۔ انہوں نے بیماروں کو تندرست کیا اور اندھوں کی آنکھیں کھولیں۔ اس نوعیت کی مشکلات ہر زمانہ میں پائی جاتی ہیں۔ خداوند ہر وقت مدد کرنے کے لئے تیار رہا اور بادشاہت قریب تھی۔

مقدس یوحنا رسول کی انجیل کے اختتام پر ایک رقت انگیز مستند کہانی تلمیند ہے جس سے ہمیں مسیحی رفاقت کا اندازہ اور اُس زمانہ کی فضا کا حال و احوال معلوم ہوتا ہے۔ یہ تصویر اتنی واضح ہے کہ ہم اس نظارے کو آج بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔

خداوند مسیح کے شاگردوں میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ خداوند کا پیارا شاگرد کبھی نہیں مرے گا بلکہ وہ میرے آنے تک ٹھہرا رہے گا" اس لئے یہ ضرورت رجوع ہوئی۔ اس کہانی کو صحیح صحیح طور پر دوبارہ بیان کیا جائے تاکہ مسیح کے نوجوان شاگردوں کے دل اپنے فرض منصبی کی طرف رجوع ہوں

کیونکہ وہ صلیب کی بادشاہت کے وارث ہیں لیکن انجیل نویس نے لکھا ہے کہ "یسوع نے اُس سے یہ نہیں کہا تھا کہ یہ نہ مریگا بلکہ اگر مَیں چاہُوں کہ یہ میرے آنے تک ٹھہرا رہے تو تجھ کو کیا؟ تو میرے پیچھے ہو لے"۔

ہم افسس کے شہر میں یہ نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں کہ یُوحنا رسُول نے شاگردوں کو خُداوند مسیح کی کہانی بار بار سُنایا کرتا تھا۔ یہ زمانہ معجزات کا زمانہ تھا اور خُداوند مسیح کی زمینی زندگی کا آخری بیرونی گواہ ابھی معدُوم نہیں ہُوا تھا۔ اُس کی "آمد ثانی" میں جو دلکشی موجُود ہے ہم اُس کا نظارہ کر سکتے ہیں اور یہ سمجھ سکتے ہیں کہ بیرونی دُنیا کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے میں کیسی قُوّت حاصل ہوتی ہے۔ اُس ابدی بادشاہت میں رہنا جہاں خُداوند مرکزی طور پر موجُود ہے کیسا خُوشنما ہے۔

یہ خُدا کی مرضی تھی کہ اُس کی آمد کی توقعات جو پہلی صدی میں تھیں، اس زمانہ کے بعد تک لوگوں کے دِلوں میں اس طرح رہیں جس طرح بیج کے اُوپر کا سخت چھلکا تخم کی بالیدگی کی حفاظت کرتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان سادہ اور حلیم مردوں اور عورتوں نے جن کی کوئی خاص روایات نہ تھیں، خُداوند مسیح کی خاطر بہت سی تکلیفیں برداشت کیں۔ کسی ٹھوس اُمید کی ضرورت تھی اور اگر اُس کی آمد کی نشانیاں واضح نہ تھیں تو اُن لوگوں کو حقیر سمجھنے والے ہم کون ہیں؟ مقدس یُوحنا رسُول لکھتا ہے:-

"نہ دُنیا سے محبّت رکھو، نہ اُن چیزوں سے جو دُنیا میں ہیں۔ جو کوئی دُنیا سے محبّت رکھتا ہے اُس میں باپ کی محبّت نہیں، کیونکہ جو کچھ دُنیا میں ہے یعنی

جسم کی خواہش اور آنکھوں کی خواہش اور زندگی کی شیخی وہ باپ کی طرف سے نہیں بلکہ دُنیا کی طرف سے ہے۔ دُنیا اور اُس کی خواہش دونوں مٹتی جاتی ہیں لیکن جو خُدا کی مرضی پر چلتا ہے وہ ابد تک قائم رہے گا۔ اے لڑکو! یہ آخری وقت ہے۔

آخیر وقت میں افراتفری کا عالم ہوگا۔ موت و حیات کا فیصلہ، کمر کس کرنا اور چراغ جلتے رکھنا یہ سب کچھ صاف طور پر کلام مقدس کے مطابق ہے۔ یہی وہ شاہرگ ہے کہ اگر اسے جسم کے دوسرے حصوں سے کاٹ دیا جائے تو انسان مفلوج ہو جاتا ہے۔ محض ہوائی قلعے بنانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ مسیح مصلوب کے شاگردوں کو ہر وقت اُس کے پیچھے ہو لینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ وہ وقت آدھی رات کو آئے یا صبح سویرے آ جائے یا اُس وقت آئے جب جھیل کا پانی بالکل پُرسکون ہو یا اُس وقت آئے جب پو پھٹنے کے قریب ہو اور چاروں اطراف میں سناٹا چھایا ہُوا ہو تو وہ اچانک آ جائے گا۔ اُس وقت کسی کو اُس کے آنے کی توقع نہ ہوگی تاہم اُس کی آمد کی توقع تو ضرور ہے۔

لیکن جب اُس کی آمد کا وہ زندگی بخش متوقع لمحہ آئے گا تو دُنیا کی محبت، آنکھوں کی شہوت اور زندگی کا غرور ہم پر وہ غلبہ حاصل نہیں کرے گا جو رُوح کو مفلوج بنا دیتا ہے۔ خُداوند مسیح یسوع میں رفاقت زندگی سُست ارادے کو فعّال بنا دے گی اور مجھے ٹوٹے دِل کو از سرِ نو زندگی بخشے گی اور مسیح ہی سب کچھ ہوگا۔

جب میں کمزور تھا اور میرے دِل میں بے یقینی پائی جاتی تھی تو البرٹ

شوائٹزر کی کتاب میرے لئے ایک تحفۂ مسیحا ثابت ہوئی۔ صاحبِ تصوف کی زندگی نے مجھے محروموں کے ساتھ دکھ اٹھانے کی تعلیم دی۔ اس کتاب نے مجھے حقیر اور ناچیز لوگوں کی طرف مائل کر دیا۔ میں اپنی کتابوں کو الوداع کہہ کر دیہات کی طرف جانے لگا اور میں سادہ لوگوں سے انسانی زندگی بسر کرنا سیکھنے لگا۔ آخر کار میرے دل میں تازہ ایمان کی شمع جلنے لگی اور میرے جذبۂ عبودیت کا چراغ روشن ہو گیا۔ میں اس روشنی سے منور ہو گیا اور روح القدس کی آگ نے میری پرانی انسانیت کو جلا دیا۔ اب نئی بلاہٹ کا منتظر رہا اور آخر کار وہ بلاہٹ آ گئی۔

چودھواں باب

مسیح اور نیا زمانہ

جس زمانہ میں میں نے کیمبرج مشن برادر ہڈ کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا میری زندگی میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا۔ میں ایک بشپ کے ماتحت بشارت کی خدمت سرانجام دیا کرتا تھا لیکن اب میں نے اس کام کو چھوڑ دیا تھا۔ میں اپنے سفینے کو انجانے سمندر میں ڈال کر دنیا کے دور دراز علاقوں میں جانا چاہتا تھا اور ایسا قدم اٹھانے وقت میں نے عجلت سے کام نہیں لیا تھا۔ میرے دل میں طرح طرح کے خیالات اٹھا کرتے تھے۔ یونہی بے یقینی میں کئی سال گزر گئے اور میں کسی قطعی فیصلے پر نہ پہنچ سکا۔ میری صحت بھی اچھی نہ تھی، اس لئے مجھے آرام کی اشد ضرورت تھی لیکن اس کے باوجود میں نے جھیل کے کنارے ایک سہانی صبح کو اپنے مالک کی آواز سنی تھی جو بار بار مجھے کہہ رہا تھا "تو میرے پیچھے ہو لے"۔ بالآخر مجھے معلوم ہوا کہ یہ باطنی آواز ایک دن ضرور غالب آئے گی۔

اپنی زندگی کے حقائق بیان کرنے سے پیشتر میں اپنے مالک خداوند مسیح کی تصویر کا ایک اجمالی خاکہ پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ اس تجسس کے

CAMBRIDGE MISSION BROTHERHOOD.

زمانہ میں جب میرے دل میں ایک ہنگامہ برپا تھا تو خُداوند مسیح کی تصویر میرے سامنے صاف صاف آیا کرتی تھی۔ میرے تمام افعال میں تذبذب اور بے یقینی کارفرما تھی اور میرے دل میں ہچکچاہٹ پائی جاتی تھی۔ میرا ایمان متزلزل تھا۔ البرٹ شوائیزر کی کتاب کے مطالعہ سے مَیں خُداوند مسیح کی تصویر کی چند لکیریں کو کھینچنے کے قابل ہو گیا۔ لیکن خُداوند مسیح کی وُہ تصویر جسے مَیں کھینچنے کو ہوں سراسر میرے اپنے ذہن کی تخلیق ہے۔ مَیں نے اپنے دل کی آنکھوں سے خُداوند مسیح کی بے شمار رویائیں دیکھی ہیں اور یہ رویا اُن میں سے ایک ہے۔ آپ کو اس سے معلوم ہو جائے گا کہ میرے خیالات کا رُجحان کیا ہے اور وُہ کونسی پوشیدہ وجُوہات تھیں جنہوں نے مجھے میری زندگی میں اس قسم کا انقلابی قدم اُٹھانے پر مجبُور کیا۔

مَیں جس زمانہ میں دہلی میں رہائش پذیر تھا، اُس وقت ہندوستان کی حالت رُومی سلطنت کی مانند تھی جو آج سے تقریباً دو ہزار سال پہلے موجُود تھی۔ حکومت کی خارجی پالیسی میں امن و امان تھا اور انتظام سلطنت کی دھاک بندھی ہُوئی تھی۔ اس برصغیر میں اگرچہ امن وسکون نظر آتا تھا لیکن ایک مَوج تُندجولاں اچانک سمندر کی پہنائیوں سے اپنا سر اُٹھا رہی تھی۔ یہ کوہ آتش فشاں کا سیّال مادہ تھا جو دھرتی کے سینے میں اُبل رہا تھا اور اب اسے پھاڑ کر باہر آنا چاہتا تھا۔ عوام اسے "قومی تحریک" کہتے تھے۔ لیکن اس کا حلقہ اثر اس سے کہیں زیادہ تھا۔ انسانیت کا ایک ترجمان بڑا تھا اور اب وُہ اپنے آپ کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس اندرونی انقلاب

کی قوت کو بیان کرنے کے لئے پیدائش کی کتاب کی تخلیقی رُوح کا استعارہ
لیا جا سکتا ہے جہاں یہ مرقوم ہے :-
"زمین ویران اور سنسان تھی اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا۔ خدا کی رُوح
پانی کی سطح پر جنبش کرتی تھی اور خدا نے کہا کہ روشنی ہو جا اور روشنی ہو گئی"۔
رُومی عملداری میں گلیل اور مشرق کی سرزمین خداوند مسیح کی آمد پر اندرونی
طور پر اسی قسم کے انقلاب سے رُوشناس ہو رہی تھی۔ گلیل میں یہ انقلاب
مذہبی رنگ اختیار کر رہا تھا۔ ناصرت کے نوجوان بڑھئی یسُوع نے یہ معلوم کر
لیا تھا کہ ان انقلابی قوتوں کا جو سر اُٹھا رہی ہیں کیا رجحان ہے لہٰذا وہ
اپنے تمام جوان ارادوں اور ہمتوں کے ساتھ اس انقلاب میں کود پڑا۔ وہ
اس تحریک کو آسمان کی بادشاہت کے لئے استعمال میں لانا چاہتا تھا۔
وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ بیابان میں پکارنے والے کی آواز بھی سُنائی دے
رہی تھی جو خدا کا راستہ تیار کر رہا تھا۔ خدا کی آمد اُسی طرح ہوئی جس طرح
وہ قدیم زمانہ میں اپنے لوگوں کو چھڑانے کی غرض سے ظاہر ہوا کرتا تھا۔
گلیل کے گرد و نواح میں عوام کے دلوں میں اسی قسم کی اُمید تھی۔ دیہاتی
جب ایک دُوسرے کو ملتے تو اسی قسم کی باتیں کیا کرتے تھے۔ لوگ گھروں
میں آگ کے پاس بیٹھ کر بھی اسی قسم کی گفتگو کیا کرتے تھے۔ جب یہ ڈرامہ
شروع ہوا تو یسُوع اس زندگی کی سطح پر ظاہر ہوا۔ وہ لوگوں کو یہ خوشخبری
سُنانے کے لئے آیا تھا کہ مُنجی قریب ہے۔ اُس نے ماہی گیروں اور دیہاتیوں
کو اپنے شاگردوں میں چُن لیا۔ اُس کے شاگرد بھی اُس کی طرح محنت کش اور

طاقتور جوان تھا۔ وہ اُنہیں "آدم گیر" بنانے والا تھا۔

اب اس تحریک کا آغاز ہوتا ہے۔ بیمار شفا پاتے ہیں اور اندھوں کو بینائی دی جاتی ہے، غریبوں میں نجات کی خوشخبری سُنائی جاتی ہے۔ وہ اب وہی ہو رہا تھا جس کا گمبیل بڑے اشتیاق سے منتظر تھا۔ خُدا کی بادشاہت کی نئی زندگی ظاہر ہو رہی ہے۔ نوجوان شاگردوں کے جوش و خروش کو قابو میں رکھنا محال ہے۔ قدیم رسم و رواج اور پابندیاں ختم ہو رہی ہیں اور زندگی کی فراوانی ہے جس نے ایک نئی صورت اختیار کر لی ہے۔ خُدا کی بادشاہت کی نئی شراب ہر ایک کے پیمانے سے چھلک رہی ہے۔ نئے کپڑے نے پُرانی پوشاک کو تار تار کر دیا ہے۔ یسُوع ایک جوان کے لامحدُود اعتماد کے ساتھ ان تمام بلند خیالوں کا خیر مقدم کرتا ہے۔

لیکن جُونہی یہ ڈرامہ قدرے آگے بڑھتا ہے تو المیے کا آغاز ہوتا ہے۔ فقیہہ اور فریسی، رُوٹھے ہوئے بچّوں کی طرح، بازاروں میں بیٹھے ہوئے اُس کی ہر ایک اپیل کو رد کر دیتے ہیں۔ وہ پُرانی چیزوں کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ وہ زندگی کے اس کھیل میں جواب شروع ہونے کو تھا، شامل نہیں ہونا چاہتے۔ خُدا کی بادشاہت کی یہ نئی سچائی خواہ یُوحنا بپتسمہ والے کی زبان سے سُنائی جائے یا یسُوع کی زبان سے اُن لوگوں میں اتنی سکت نہیں ہے کہ وہ کوئی جواب دے سکیں۔ وہ قدیم نظام سے مضبوطی سے چمٹے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے نسلی عقیدے میں بڑے ہی تنگ نظر ہیں جہاں کہیں وہ جاتے ہیں، اُن کے ساتھ اُن کی یہ سخت طبیعت بھی جاتی ہے۔ وہ

نُور کا اثر قبول نہیں کرتے۔ وہ اندھے راہ دکھانے والے ہیں۔ وہ اندھیرے میں راستہ تلاش کرنے کے لئے ٹامک ٹوئیاں مارتے ہیں۔ انہیں خبط ہے کہ علم کی کنجیاں اُنہیں کے پاس ہیں لیکن یہ کنجیاں اُن سے چھین لی گئی ہیں۔ اس کے برعکس خُداوند مسیح اور اُس کے شاگرد بڑی دلیری سے بادشاہت کے پیغام سُنانے کے لئے اِدھر اُدھر جاتے ہیں۔ اُنہوں نے غلامی کی پُرانی زنجیروں کو اُتار پھینکا ہے۔ وہ اب آزاد ہیں۔ وہ نئے زمانے میں رہتے ہیں۔ یسُوع خُدا کی حکمت سے معمور ہوتا گیا۔ اُس پر خُدا کا فضل تھا۔ وہ اُن لوگوں کو اپنا شاگرد بناتا ہے جو خُدا کی بادشاہت کو ایک طفل کی طرح قبول کرتے ہیں۔ خُداوند یسُوع نے اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمایا ہے:۔

"یُوحنا بپتسمہ دینے والے کے دنوں سے اب تک آسمان کی بادشاہی پر زور ہوتا رہا ہے اور زور آور اُسے چھین لیتے ہیں۔" جوانی، جرانی کو پُکار رہی ہے۔ زندگی اور موت کی کشمکش شروع ہونے کو ہے جس میں یا تو سب کچھ جاتا رہے گا یا کچھ حاصل ہو جائے گا۔

اِن حالات میں یسُوع ایمان کی ایک بہت بڑی مہم پر روانہ ہوتا ہے۔ وہ خُوشی سے معمور ہے۔ شادی کی ضیافت شروع ہونے والی ہے۔ جب دُولہا برات کے ساتھ آگے آتا ہے تو باجے کی آواز سُنائی دیتی ہے۔ اب کون پیچھے رہ سکتا ہے۔ اس بڑی خوشی کی خبر ساری دُنیا کو سُنائی جا رہی ہے اور دُولہا کے براتی روزہ نہیں رکھ سکتے کیونکہ یہ خوشی کا موقع ہے اور دُولہا اُن کے ساتھ ہے۔

ایک وقت آنے کو تھا جب اُنہیں روزہ رکھنا ہوگا لیکن ابھی وُہ وقت
نہیں آیا تھا۔ وُہ دُکھ جیسے خُداوند مسیح برداشت کرنے کو تھے، خُدا کی بادشاہت
کا ایک اہم جُزو تھا۔ ایسی حالت میں رنج ہو یا راحت، روزہ ہو یا ضیافت،
دُکھ ہو یا سُکھ خُدا کا نام مُبارک مانا جانا ضروری ہے اور خُدا کی مرضی جس
طرح آسمان پر پُوری ہوتی ہے، زمین پر بھی پُوری ہونی چاہیئے، کیونکہ
وُہی سب پر حکمران ہے۔

اس نقطہ پر سب سے اہم بات سامنے آتی ہے، یہی اس ڈرامے
کی ٹیپ کی بات ہے کیونکہ "باپ" کا لفظ جو خُداوند یسُوع کی زبان مُبارک
سے نکلا، ایک مکاشفہ یا نیا عہد تھا۔ وُہ اسی لفظ پر پھُونکتا ہے اور
جس طرح کوئی ماہر سازندہ وائلن کے تاروں کو اس انداز سے چھُوتا ہے کہ اُن
میں سے نغمے پھُوٹتے ہیں، اُسی طرح وُہ اس لفظ کا راگ لاپتا ہے۔
خُداوند یسُوع مسیح اس نغمے کو اس انداز سے چھیڑتا ہے کہ کوئی دُوسرا شخص
ایسا نہیں کرسکتا کیونکہ اُس میں انسان کا معصوم روح موجود ہے۔ وُہ خُدا کی
کائنات کا مشاہدہ کرتا ہے اور اُسے کسی قسم کا ڈر محسوس نہیں ہوتا۔ اُس کی
ذات قابلِ اعتماد ہے۔ وُہ سادہ اور دل کا فراخ ہے۔ وُہ تاریکی سے
نہیں ڈرتا۔ اُسے جبلّی طور پر معلُوم ہے کہ دُنیا اچھی ہے کیونکہ یہ خُدا باپ کی
مخلُوقات ہے۔ وُہ بے حد خُوش ہے اور اُسے اپنے باپ کے گھر کا بے حد
احترام ہے۔ اُس کے باپ کا گھر بڑا خُوبصورت ہے۔ وُہ اپنے باپ کے کام
سرانجام دینے میں رہتا ہے۔ اُس کے دل میں اُمید اور محبّت ہے۔ وُہ خُدا

کی کاریگری کی تعریف کرتا ہے۔

جس طرح وُہ باپ کو جانتا ہے اَور کوئی اُسے نہیں جان سکتا جس طرح وُہ باپ کو ظاہر کرتا ہے اَور کوئی ظاہر نہیں کر سکتا، کیونکہ وُہ اَور باپ دونوں ایک ہیں۔ یہی باپ کا راز ہے۔ وُہ باپ کا بیٹا ہے لیکن کسی تنگ نظریہ مابعد الطبیعاتی معنی میں نہیں کیونکہ اس کا کوئی اخلاقی مطلب نہیں ہوتا بلکہ وُہ رُوحانی طور پر ایک ہیں۔ وُہ مرضی، ارادہ، مقصد اَور کاموں کے لحاظ سے ایک ہیں۔

خُدا کے کردار کے وسیلے ہی زندگی میں ایک گہری تبدیلی پَیدا ہوتی ہے جسے مسیح تمام انسانی معیاروں اَور پیمانوں کے مقابلہ میں پیش کرتا ہے یہ ایک ایسی تبدیلی ہے جو آفاقی، گہری اَور سادہ ہے کہ یہ مسیحی ایمان کو ایک نیا دین بنا دیتی ہے۔ مسیحی ایمان گزشتہ باتوں کا خلاصہ نہیں ہے بلکہ یہ اپنی نوعیت میں ایک طوفانی بات ہے۔ خارجی نتائج کے لحاظ سے یہ انسانی تاریخ میں ایک نیا آغاز ہے۔

خُداوند مسیح نے ہم کو یہ سکھایا ہے کہ خُدا کا کردار ایک بچے کی طرح معصُوم اَور سادہ ہے۔ لہٰذا وُہ جو دِل کے پاک ہیں اُسے دیکھتے ہیں۔ اپنا کردار خُدا کی طرح بنا لینا ہی خُدا کی بادشاہی میں داخل ہونا ہے حقیقت میں "آسمان" کا یہی مفہُوم ہے۔ خُداوند مسیح نے فرمایا ہے :-

"جب تک تُم توبہ کرو اَور بچّوں کی مانند نہ بنو تو آسمان کی بادشاہی میں ہرگز داخل نہ ہو گے۔" اُس نے پھر یہ بات دُہرائی تاکہ یہ لوگ یہ راز اچھی طرح سے

سمجھ جائیں۔ اُس نے فرمایا" جو کوئی اپنے آپ کو اس بچے کی مانند چھوٹا بنائے گا وُہی آسمان کی بادشاہی میں بڑا ہوگا"۔ اُس نے پھر اپنی زبان خوش الحان سے فرمایا۔ "جو کوئی آسمان کی بادشاہی کو چھوٹے بچے کی طرح قبول نہیں کرے گا وُہ اُس میں ہرگز داخل نہیں ہوگا"۔

ہر انسان جانتا ہے کہ ننھے معصوم بچوں میں رسمی امتیازات نہیں ہوتے۔ بچے نہایت ہی سادہ ہوتے ہیں۔ خُدا کی سچائی بھی ایسی ہی ہے۔ آج زمانے نے مادی لحاظ سے بہت ترقی کر لی ہے کیونکہ ہم نے سائنس کی سچائیوں کو دریافت کر لیا ہے۔ اس طرح سے خُدا کی رُوحانی کائنات میں بھی ایک عالمگیر سچائی جاری وساری ہے۔ اس سچائی کو خُداوند مسیح نے انسانی زندگی میں ظاہر کیا ہے۔

پس حقیقت کے متعلق جو تصوّر مسیح کا تھا اُس کے مطابق خُدا اور آسمان کی بادشاہت لاینفک خیالات ہیں۔ بعض اوقات ان دونوں اصطلاحات کو ہم ایک دُوسرے کے مترادف استعمال کر سکتے ہیں۔ چونکہ آسمان کی بادشاہت میں جو سب سے زیادہ سادہ اور بچوں کی مانند ہیں۔ وُہی بڑے ہیں لہٰذا خُدا کے قریب بھی یہی بات ہے۔ خُدا بھی حلیم ہے۔ وُہ برداشت کرتا ہے۔ وُہ آدمیوں کے لئے انتظار کرتا ہے۔ اُس کی مرضی ہے کہ ہم بھی اُس کی آزادی سے آزاد ہو جائیں۔ وُہ اپنے باغی سے باغی بیٹوں کو راہِ راست پر لانے کے لئے

طاقت استعمال کرنے سے گریز کرتا ہے۔ وُہ صرف محبت کے وسیلے سب کو مسخر کرتا ہے۔

خُدا مُسرف بیٹے کے ساتھ کتنا حلیم ہے۔ مُسرف بیٹے کی کہانی میں لکھا ہے کہ ابھی وُہ دُور ہی تھا کہ باپ اُسے ملنے کے لئے اُس کی طرف دوڑا اور اُس نے یہ بھی نہیں سُنا کہ آیا اُس کا بیٹا توبہ کر چکا ہے کیونکہ وُہ ماضی کو بھُول گیا تھا۔ خُداوند یسُوع مسیح نے سکھایا ہے کہ اسی طرح جب کوئی گنہگار توبہ کرتا ہے تو آسمان پر بہُت خُوشی ہوتی ہے۔

خُدا کی بخشش اور رحمت کا اندازہ لگانا محال ہے۔ وُہ سات کے ستّر گُنا سے بھی زیادہ مرتبہ مُعاف کرتا ہے۔ خُداوند یسُوع نے فرمایا ہے:۔

"اپنے دُشمنوں سے محبت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لئے دُعا کرو تاکہ تُم اپنے باپ کے جو آسمان پر ہے بیٹے ٹھہرو کیونکہ وُہ اپنے سُورج کو بدوں اور نیکوں دونوں پر چمکاتا ہے اور راستبازوں اور ناراستوں دونوں پر مینہ برساتا ہے کیونکہ اگر تُم اپنے محبت رکھنے والوں ہی سے محبت رکھو تو تمہارے لئے کیا اجر ہے؟ کیا محصُول لینے والے بھی ایسا نہیں کرتے؟ اور اگر تُم فقط اپنے بھائیوں ہی کو سلام کرو تو کیا زیادہ کرتے ہو؟ کیا غیر قوموں کے لوگ بھی ایسا نہیں کرتے؟ پس چاہیئے کہ تُم کامل ہو جیسا تُمہارا آسمانی باپ کامل ہے۔"

خُداوند مسیح سے پیشتر خُدا کے متعلق ایسی باتیں کہنے کی کسی کو جرأت نہ ہُوئی۔ خُداوند مسیح نے قُدرتی انداز میں ایسی باتیں کہہ دیں، تاہم اس کائنات

میں خُدا کا کردار ازل سے اسی طرح کا ہے۔ ہمارا آسمانی باپ ہماری فکر کرتا ہے، یہاں تک کہ اُس نے ہمارے سَر کے بال بھی گنے ہُوئے ہیں۔ وُہ رُوح جو انسان کو یہ کہتی تھی کہ وُہ اپنے ماضی کو چھوڑ کر آگے بڑھے، نیکی تھی بدی نہ تھی۔ یگلیل میں جو تحریک شروع ہُوئی وہ رُوح کو خُوش کرتی اَور غلامی کو دُور کرتی تھی۔ نیکی کی قُوت تھی۔ وُہ خُدا کی طرف سے تھی، وُہ شیطان کی طرف سے نہ تھی۔ اس قسم کی نیکی کو بدی کہنا ایسا کُفر تھا جسے مُعاف نہیں کیا جا سکتا۔ اس ناقابلِ معافی کُفر نے انسان کی رُوحانی آنکھوں کو اندھا کر دیا تھا اَور روشنی کو تاریکی بنا دیا تھا۔ وُہ خلق کرنے والی رُوح یعنی رُوح القُدس جو پانی کی سطح پر جنبش کرتی تھی، خُداوند یسُوع مسیح ہے جو زندگی بخشتا ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ ہم مُستقبل پر ایمان رکھیں۔ ہمیں اُس سے کسی قسم کا ڈر یا خوف نہیں ہونا چاہیئے۔

پس خُدا تجدید کرتا ہے، از سرِنو پیدا کرتا ہے اَور بحال کرتا ہے۔ وُہ انتظار کرتا ہے کہ آدمی کا دِل بچے کی مانند ہو کر اُس کی طرح ہو جائے جیسا کہ ہم کہتے ہیں "ابا! یعنی اَے باپ"۔ رُوح بھی ہماری رُوح کے ساتھ مل کر گواہی دیتا ہے کہ ہم خُدا کے فرزند ہیں۔

اَور اگر ہم اس خوشخبری کا ثبوت چاہیں جو خُدا کی طرف سے صادر ہوتی ہے تو خُداوند مسیح ایک فلسفی کی طرح مجرد اصطلاحات میں دلائل پیش نہیں کرتا بلکہ وُہ اس کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اَور اپنی زندگی میں ہی اسے سچا ثابت کرتا ہے۔ وُہ اپنی زمینی زندگی کی لیبارٹری کا تجربہ پیش کرتا ہے۔ وُہ

اِس تجربہ کے لئے اپنا سب کچھ دے دیتا ہے ۔ وُہ سب سے آخری قُربانی بھی دینے کے لئے تیار ہے ۔ انسان کے دِل کو قائل کرنے کا محض ایک ہی طریقہ ہے کہ وُہ اپنے ایمان کے مطابق آخر تک زندگی بسر کرے چنانچہ خُداوند یسُوع یہی کام کرتا ہے ۔

اِس شاندار اعتماد میں کوئی آسان رجائیت نہیں ہے ۔ خُداوند مسیح کو ہر وقت معلوم تھا کہ اُس کو کیا قیمت ادا کرنا پڑے گی ۔ وُہ ہُو بہُو انسان ہے ۔ وُہ اپنے خوف کو نہیں چھپاتا اور جب آخرکار وُہ درد اور دُکھ میں مُبتلا ہوتا ہے تو وُہ چلا اُٹھتا ہے :-

"اَے میرے باپ ! اگر ہو سکے تو یہ پیالہ مُجھ سے ٹل جائے تو بھی نہ جیسا مَیں چاہتا ہُوں بلکہ جیسا تُو چاہتا ہے ویسا ہی ہو۔"

لیکن جب دُکھ کی گھڑی گُذر گئی اور اُس کی قُوّت پھر بحال ہو گئی تو اُس نے بڑے جلال سے پطرس سے کہا :-

"اپنی تلوار کو میان میں کر لے کیونکہ جو تلوار کھینچتے ہیں ، وُہ سب تلوار سے ہلاک کئے جائیں گے ۔ کیا مَیں وُہ پیالہ نہ پیوُں جو میرے باپ نے میرے لئے مقرّر کیا ہے ۔" اور اُس نے وُہ پیالہ پی لیا ۔

چاروں انجیلوں میں خُداوند مسیح کے آخری ہفتہ کے دُکھوں کی کہانی میں بیت عنیاہ کے عطردان کا ذکر ہے ۔ اُس خوفناک لمحہ میں خُداوند مسیح پر جو کچھ بیتی ، اِس سے ہم اُس کی رُوح کی ایک جھلک دیکھ سکتے ہیں ۔ جب اُس عورت نے وُہ عطردانی توڑی تو اُسے یاد آگیا کہ اُسے مرنا ہے اور اُس کا جسم بھی اِس

عطردانی کی طرح توڑ دیا جائے گا کیونکہ وہ خوشبو جو اُس میں ہے اُسے اُنڈیلا جاتا ہے۔ خُداوند یسُوع نے اپنی زبان مُبارک سے فرمایا:۔
"اُس نے جو یہ عطر میرے بدن پر ڈالا یہ میرے دفن کی تیاری کے واسطے کیا۔"

خُداوند یسُوع کے شاگرد خفا ہو کر کہنے لگے کہ اُسے کس لیے ضائع کیا گیا؟ "ضائع" کا لفظ سُن کر خُداوند مسیح کو بے حد رنج ہُوا کیونکہ اُسے اپنی موت کا خیال آیا۔ اُس کی قُربانی فضُول نہ تھی۔ عورت نے بھی آخرکار شاگردوں کی بات کو سمجھ لیا۔ اُس نے ایک عورت کے وجدان کے ساتھ اس امر کا احساس کیا اور اس کی تشریح دُرست تھی۔ خُدا کا دِل بھی اسراف کے معاملہ میں بڑا ہی غنی ہے۔ اور خُداوند مسیح اُس عورت کی طرح اپنی فطرت میں اپنی زندگی کو تصرّف میں لانے کے لئے بڑا غنی ہے۔ اُس میں ایک انسان کی جسمانی جرأت بھی موجُود ہے۔

اس الٰہی تصوّر میں خُداوند یسُوع اس دُنیا میں بڑی احتیاط سے اپنی پاکیزہ محبّت کا اظہار کر رہا تھا۔ وہ حقیقت میں ایک شاعر اور فنکار ہے جو اپنی تخلیق میں انسانی زندگی کے بھدّے مواد کو ایسے سانچے میں ڈھال دیتا ہے کہ وُہ الٰہی اثرات کو قبُول کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ وُہ اس پر پھُونکتا ہے اور اپنے لمس سے اُسے کوئی صُورت عطا کرتا ہے۔ پھر وُہ اسے زندگی بخشتا ہے۔ وُہ ایک شاعر کی طرح خوبصورت الفاظ میں حسین افکار پیش کرتا ہے۔ وُہ ایک ماہر مغنّی کی طرح نغمے تخلیق کرتا ہے

ہم اس کے تخلیقی عمل کو تو نہیں دیکھ سکتے ہیں لیکن ہم نتیجے کو معلوم کر سکتے ہیں۔

بدی کا مقابلہ کرنے میں الہٰی نیکی بڑی سخت اور خوفناک ہوتی ہے۔
خداوند یسوع کی محبت کوئی جذباتی شے نہیں ہے۔ اس میں دُکھ ہی دُکھ پائے جاتے ہیں۔ مسٹر شوائٹزر وسطی افریقہ میں بڑے بڑے اپریشن کیا کرتے تھے۔ اُن کے نشتر سے مریض کے جسم پر زخم تو ہو جاتے تھے لیکن یہ زخم شفا کے زخم ہوتے تھے کیونکہ وہ عملِ جراحی سے فاسد مواد کو انسانی جسم سے خارج کر دیتے تھے۔ یہی حال خُدا کی محبت کا ہے جس جگہ اُس کی محبت کا زخم گہرا ہوتا ہے اُسی جگہ شفا زیادہ ہوتی ہے۔ وہ ایک دوست کی وفا کے زخم ہیں۔

عبرانیوں کے خط کے مصنف نے خُدا کی محبت کے اس پہلو کو بڑی اچھی طرح معلوم کیا ہے۔ چنانچہ اس خط میں مرقوم ہے :۔

"اے میرے بیٹے! خُداوند کی تنبیہ کو ناچیز نہ جان اور جب وہ تُجھے ملامت کرے تو بے دِل نہ ہو کیونکہ جس سے خُداوند محبت کرتا ہے اُسے تنبیہ بھی کرتا ہے اور جس کو بیٹا بنا لیتا ہے اُس کے کوڑے بھی لگاتا ہے"۔ تُم جو کچھ دُکھ سہتے ہو وہ تمہاری تربیت کے لئے ہے۔ خُدا فرزند جان کر تمہارے ساتھ سلوک کرتا ہے۔ وہ کونسا بیٹا ہے جسے باپ تنبیہ نہیں کرتا؟"

خُداوند مسیح ایسے پودوں کا ذکر کرتا ہے جسے اُس کے آسمانی باپ نے نہیں لگایا۔ اس لئے وہ اُنہیں اکھاڑ دینا چاہتا ہے۔ بدی کا وجود تو اس دُنیا میں ہے لیکن اس کی کوئی آسان تشریح نہیں کی جا سکتی۔ بدی کو کس طرح

دُور کیا جاتا ہے۔ ہم اسے ایک استعارے سے بیان کر سکتے ہیں کہ عورت جب بچہ جنتی ہے تو درد سے کراہتی ہے لیکن اس کے بعد وُہ خُوش ہوتی ہے یا اچھے دانوں کو کھتے میں جمع کیا جاتا ہے اور بھُوسے کو جلا دیا جاتا ہے یا پھل لانے کے لئے دانہ زمین میں مرتا ہے۔

خُداوند یسُوعؔ اپنی خُوشی اور غم کے لمحات میں ایک شاعر کے سے جذبات رکھتا ہے۔ اس پر یہ کیفیت اچانک طاری ہو جاتی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وُہ انسان تھا لیکن اُس میں تخلیق کرنے والی رُوح تھی اور یہ رُوح اُس وقت کام کرتی تھی جب وُہ جلال میں ہوتا تھا۔ وُہ اپنے زندہ جاوید کام نڈر ہو کر کیا کرتا تھا۔ جب اُس کی صُورت اچانک تبدیل ہو جاتی ہے اور وُہ نُورانی ہو جاتا ہے تو ہم بڑے خوف سے اُسے دیکھتے ہیں۔ وُہ دیکھتا، خلق کرتا اور کام کرتا ہے۔

خُداوند مسیح نے اپنے شاگردوں کو مُنادی کے لئے بھیجا تھا اور جب واپس آئے تو وُہ اُن کی فتح کی خُوشی میں شریک ہُوا۔ خُداوند نے فرمایا:-

"مَیں شیطان کو بجلی کی طرح آسمان سے گِرا ہُوا دیکھ رہا تھا۔"

اس کے بعد ہم یہ الفاظ پڑھتے ہیں۔ "اُسی گھڑی وُہ رُوح القُدس سے خُوشی میں بھر گیا اور کہنے لگا۔

"اَے باپ، آسمان اور زمین کے خُداوند! مَیں تیری حمد کرتا ہُوں کہ تُو نے یہ باتیں داناؤں اور عقلمندوں سے چھپائیں اور بچّوں پر ظاہر کیں۔ ہاں! اَے باپ! کیونکہ ایسا ہی تُجھے پسند آیا۔"

بالاخانے میں خُداوند مسیح نے اپنے شاگردوں کے ساتھ آخری فسح کھائی۔ اس وقت اُس کے جذبات میں ہیجان سا تھا۔ اس کے بعد ایک اَور موقع پر اُس نے اپنا ردِ عمل اِن الفاظ میں ظاہر کیا:-

"میری جان نہایت غمگین ہے، یہاں تک کہ مرنے کی نوبت پہنچ گئی ہے۔ تُم یہاں ٹھہرو اَور میرے ساتھ جاگتے رہو۔" جب خُداوند یسُوع پر ایسی کیفیات طاری ہوتی ہیں تو وُہ اُنہیں چھپاتا نہیں ہے۔ اُس میں معصوم بچّے کی رُوح ہے۔ وُہ ہمیں اپنے احساسات سے آگاہ کرتا ہے لیکن اُسے ہر کیفیت پر پُورا اختیار حاصل ہے۔ وُہ اِن کیفیات سے ایک ماہر نغمہ نواز کی طرح خوبصُورت نغمے نکالتا ہے۔ بعض اوقات سادہ دُھنوں کے امتزاج سے لافانی نغمے پیدا ہوتے ہیں۔ وُہ صلیب پر بھی کوئی مفرح یا افیُون ملی ہُوئی نیند آور دوا استعمال نہیں کرتا۔ وُہ احساس کے تمام منازل سے گزرتا ہے اَور زندگی بسر کرتا ہے چنانچہ وُہ فرماتا ہے:-

"مَیں اس لئے آیا کہ وُہ زندگی پائیں اَور کثرت سے پائیں۔"

خُداوند مسیح کی فطرت میں غم بھی تھا اَور خُوشی بھی۔ اس حالت میں رُوح توازن قائم رکھنا چاہتی تھی۔ اُس کی زبان سے ایسے محاورات اَور الفاظ نکلے ہیں جو ناابد زبان زدِ خلائق رہیں گے، کیونکہ اُن کا تعلق اُن باتوں سے ہے جو نہایت ہی سادہ ہیں لیکن دِل کی گہرائیوں سے نکلتی ہیں اَور اَبدی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نسل کے لوگ اپنی زبان میں ترجمہ کی وجہ سے اُس کی باتوں کو بڑا پسند کرتے ہیں۔ یہ محاورات اَور الفاظ اُن رازوں سے پردہ اُٹھاتے ہیں جن سے

صرف دِل ہی آگاہ ہوتا ہے۔

دیوجندرا ناتھ ٹیگور شانتی نکیتن میں رہا کرتے تھے۔ وُہ رابندرا ناتھ ٹیگور کے بڑے بھائی تھے۔ موخرالذکر خُداوند یسُوع مسیح کی اِن باتوں میں مُجھے بتایا کرتے تھے کہ وُہ بڑے عالم فاضل تھے۔ فلسفہ پر بھی اُنہیں عبُور حاصل تھا۔ اپنی جوانی کے دِنوں میں وُہ ایک اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے اور بڑے ہی دانا تھے۔ مَیں نے اس سے پیشتر ذِکر کیا ہے کہ اُن کے دوست و آشنا اُنہیں "بڑا بھائی" کے الفاظ سے موسُوم کیا کرتے تھے، کیونکہ وُہ ہر ایک شخص سے بڑے بھائی کی طرح مروّت سے پیش آیا کرتے تھے۔ وُہ ہندو تھے۔ اُن میں بُردباری اور رواداری کی رُوح تھی۔ اُن کا دِل بچّوں کی طرح صاف اور معصُوم تھا۔ وُہ بڑے ذہین فلاسفر اور علم کا خزانہ تھے۔ زمانۂ پیری میں وُہ پہروں خاموشی سے اپنے برآمدے میں بیٹھے رہتے اور پرندے اور گلہریاں اُن کے پاس بڑے آرام سے کھیلتی رہتی تھیں۔ وُہ خاموشی سے گیان دھیان میں محو رہا کرتے تھے اور اُن کی زندگی بڑی معصُوم اور حلیمہ تھی۔ وُہ چند عظیم صداقتوں کے درمیان زندگی بسر کر رہے تھے۔ اُنہوں نے یہ چیزیں بڑے تجربات کے بعد حاصل کی تھیں۔ وُہ اپنی رُوح میں خُدا تک پرواز کرنے کے قابل ہو گئے تھے۔

وُہ جیّد عالم تھے ۔ وُہ بے حد سادہ اور حلیم تھے۔ وُہ ہمیشہ سچ بولا کرتے تھے۔ ہر شام سادہ کھانا کھانے کے بعد وُہ میرے ساتھ باتیں کرنا پسند کرتے تھے۔ اس وقت وُہ مُجھے اپنے اُن خیالات سے

مُستفید کیا کرتے تھے جو اُن کے دِل میں گیان ودھیان کے وقت آیا کرتے تھے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں وُہ پہاڑی وعظ کا مطالعہ کرتے اُور اُس کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ وُہ پہاڑی وعظ کے متعلق یہ کہا کرتے تھے کہ :۔

"پہاڑی وعظ میرے لئے کھانا اُور پینا ہے۔ یہ باتیں اتنی آسان ہیں کہ اُنہیں ایک بچّہ بھی سمجھ سکتا ہے لیکن ان کے معنی بڑے ہی وسیع ہیں۔ اُپنشد اُور پہاڑی وعظ ایسی چیزیں ہیں جو دُنیا میں کلاسیکل ہیں۔ خُداوند مسیح نے کس دلیری سے فرمایا ہے :۔

"میری باتیں ہرگز نہ ٹلیں گی"۔ اُور یہ برحق ثابت ہُوا ہے۔

مَیں ہر روز پہاڑی وعظ پر سوچا کرتا ہُوں اُور رات کی تاریکیوں میں جب کبھی آنکھ کُھلتی ہے تو مُجھے یہ باتیں یاد آتی ہیں۔ ان باتوں کی تفسیر کرنے کی ضرُورت نہیں ہے۔ مَیں اُن سے کبھی اُکتاتا نہیں اُور مَیں نے کبھی یہ سوچنے کی ضرُورت ہی محسُوس نہیں کی کہ ان کی آخری اہمیّت کیا ہے۔ پہاڑی وعظ کی باتوں میں وُہ سچائی موجُود ہے جس سے انسان موت کے سامنے بھی زندہ رہتا ہے۔"

خُداوند مسیح کی اس مُبارک بادی کو وُہ ہمیشہ یاد رکھا کرتے تھے :۔
"مُبارک ہیں وُہ جو پاک دِل ہیں کیونکہ وُہ خُدا کو دیکھیں گے"۔ اُنہیں اس سے ایسی تسلّی ہوتی تھی جس کا بیان نہیں کیا جا سکتا۔ وُہ اکثر اس کے متعلق سوچا کرتے تھے۔ خُداوند مسیح کی ایک اُور بات کو بھی وُہ ہمیشہ یاد رکھا کرتے

تھے یعنی "خدا کی بادشاہی تمہارے درمیان ہے"۔ جب وُہ اس آیت کو دُہراتے تو اُن کی آواز میں قدرے خوف ہوتا تھا۔ اس سے یہ الفاظ زیادہ پُراسرار بن جاتے تھے۔ وُہ خاص طور پر اس آیت کے اصلی معنی بیان کیا کرتے تھے۔ وُہ کہا کرتے تھے کہ "خُدا کی بادشاہی" سے مُراد "دِل کی بادشاہی" ہے یعنی انسان کے اندر ہی آسمان ہے۔ سہ

میں اپنے دِل کے اندر اک جہاں موجُود پاتا ہُوں
اسی کی سلطنت اچھی اسی پر اختیار اچھا

وُہ طبعاً رُوحانی تھے اور اُن کا مزاج شاعرانہ تھا۔ اس لئے کبھی کبھی ان آیات کی ایسی تفسیر یا تشریح پیش کرتے جو میرے لئے بالکل نئی ہوتی یا میں اس سے واقف نہ ہوتا۔ ان کا اندازِ تفسیر اور طرزِ بیان مجھ سے مختلف ہوا کرتا تھا۔ وُہ مجھے ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ خُداوند مسیح جیسے قادر الکلام اُستاد کی باتوں کی گہرائی معلوم نہیں کی جا سکتی۔ وُہ خالص پانی کا چشمہ ہے اور وُہ بنی نوع انسان کی رُوحانی پیاس کو دُور کر سکتا ہے۔ ہر زمانے کے لوگ اس رُوحانی چشمے سے اپنی پیاس بجھاتے رہے ہیں۔ آئندہ زمانے کے لوگ بھی یہی کرتے رہیں گے کیونکہ انسانی فطرت کو اس کی ضرورت ہے۔

خُداوند مسیح نے اپنی جوانی کے عالم میں صلیبی دُکھ برداشت کیا۔ وُہ جوان تھا، اُس کی زبان سے جو کلمے صادر ہُوئے اُن میں جوانی کی گرمی ہے اور یہی صلیب کا المیہ ہے کہ ایک ایسا شخص صلیب دیا گیا جو حساس اور جوان تھا

اَور اس کے ساتھ ہی وُہ انسان بھی تھا۔ خُداوند مسیح کے دُکھوں میں پہاڑی وعظ کی تمام باتیں پُوری ہوگئیں۔ ”نظر کرو اَور دیکھو! کیا کوئی غم میرے غم کی مانند ہے جو مجھ پر نہیں آیا؟“

اَور چُونکہ اُس کی تمام توتیں جوان تھیں اس لئے اس کی خوشی اَور غم کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ اُس نے وجدان میں آکر اپنے حواسِ خمسہ کے دروازوں کو بند نہیں کیا تھا، وُہ ”کھاتا، پیتا“ آیا۔ اُس نے زندگی کی تمام خُوبیوں سے لُطف اُٹھایا۔ اُس کا ذہن رسا تھا۔ اُس کا دِل بات کی تہ تک پہنچ جاتا تھا۔ اُس نے اپنے خیالات کو کبھی محدُود نہیں ہونے دیا۔ اُس کا ذہن چیزوں کی تہ کو اس طرح پالیتا تھا جیسے تیر عین نشانے پر بیٹھتا ہے۔ کلامِ مقدس میں مرقُوم ہے کہ :۔ ”سچائی تمہیں آزاد کرے گی“۔ ذہنی آزادی کا یہ لافانی ہیارٹر ہے کیا بنی نوعِ انسان کی تاریخ میں کسی دُوسرے شخص نے خُداوند مسیح جیسی تکالیف برداشت کیں؟ اُس نے بڑی دلیری سے مُشکلات کا مقابلہ کیا اَور اُن پر فتح حاصل کی۔ دُنیا میں دُوسرے عالمگیر مذاہب کے بانیوں نے اپنے اپنے حلقہ میں بڑی شاندار زندگیاں بسر کی ہیں۔ اُنہوں نے بڑی طویل عُمر پائی اَور عمر رسیدہ ہوکر اس دُنیا سے رختِ سفر باندھا۔ وُہ سچائی کا پیغام اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔ خُداوند مسیح یسُوع میں ایسی خُوبی ہے جو سب سے اعلیٰ ہے۔ وُہ تمام زمانوں کے لیئے کلاسیکل اَور کامل صُورت میں جوانی کے مذہب کی نمائندگی کرتا ہے۔

خُداوند مسیح کے زمانے سے لے کر آج تک ہر زمانہ کے لوگوں نے

اُس کے پیغام کو اپنی ہی سطح پر لاکر اُس کے اقوال محال کو حقیر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن خداوند مسیح ہمیشہ انسان کے اس پہلو کے لیئے اپیل کرتا ہے جسے وُہ ناممکن سمجھتا ہے۔ وُہ صرف اُس ایمان کے وسیلے ہی ممکن ہو سکتا ہے جو پہاڑوں کو ہلا دیتا ہے۔

"پھر مَیں نے ایک نئے آسمان اَور نئی زمین کو دیکھا کیونکہ پہلا آسمان اَور پہلی زمین جاتی رہی تھی اَور سمندر بھی نہ رہا"۔ اس قسم کے الفاظ کی موسیقی نے کُل اقوامِ عالم میں بیداری پیدا کر دی ہے اَور آسمان میں نغمے گُونج رہے ہیں۔ رُوس کی کلیسیا میں ایسٹر کے تہوار کا یہ سلام ہے "مسیح جی اُٹھا ہے"۔ اس کے بعد فتح کا یہ گیت گایا جاتا ہے۔ "آؤ ہم اپنے جسمانی حواس کو پاک کریں تاکہ ہم مسیح کو دیکھ سکیں جو جلال کے ساتھ مُردوں میں سے جی اُٹھا ہے اَور ہم صاف صاف اُس کی آواز سُن سکیں کہ "خُوش ہو" کیونکہ مسیح جی اُٹھا ہے۔ وُہ ہماری اَبدی خُوشی ہے۔ آمین'

جب مَیں مشرقی ممالک میں تھا تو خداوند مسیح مُجھے یہاں مغرب کی نسبت زیادہ انقلابی مذہبی مُفکر کی حیثیت سے نظر آیا۔ مہاتما بُدھ ایک عظیم سنجیدہ شخصیت ہے اَور عُمر کے ساتھ ساتھ اُس کی دانائی اَور حکمت بھی جوان ہوتی گئی لیکن شعلہ بیانی جوانی کا شاہی اختیار ہے۔ یہی زندہ الہامی قوتِ مُتحرکہ ہے جو بنی نوعِ انسان میں زندگی کی رَو دوڑانے کے لیئے ضروری ہے۔

اس لیئے اس نوجوان کے خلاف لوگ اُٹھ کھڑے ہُوئے اَور یہ نوجوان آسمان کی بادشاہت کی باتیں کرتا رہا۔ خداوند مسیح نے ریاکار فریسیوں

کے متعلق ایسا فیصلہ دیا کہ وُہ اس سیلاب کا مقابلہ نہ کر سکے۔ یہ فیصلہ اتنا خوفناک تھا کہ اُس کی رُوح لرز اُٹھی۔ آخرکار اُس کا اپنا دِل افسُردہ ہو گیا اور جب اُس کا غُصّہ فرو ہُوا تو اُس نے غمگین لہجے میں کہا:۔

اَے یروشلم! اَے یروشلم! تُو جو نبیوں کو قتل کرتی اور جو تیرے پاس بھیجے گئے اُن کو سنگسار کرتی ہے، کتنی بار مَیں نے چاہا کہ جس طرح مُرغی اپنے بچّوں کو پَروں تلے جمع کر لیتی ہے اُسی طرح مَیں بھی تیرے لڑکوں کو جمع کر لُوں، مگر تُم نے نہ چاہا۔ دیکھو! تمہارا گھر تمہارے لئے ویران چھوڑا جاتا ہے"۔

اگر خُداوند مسیح کی اِن باتوں کے آغاز میں غُصّے کے جذبات ہیں تو آخر میں رحم کا جذبہ کارفرما ہے۔ ہمیں ایسی چیز دی جاتی ہے جس کی رُوحانی طور پر بڑی قیمت ہے۔ جس طرح گرد و غُبار کا طُوفان اُٹھتا ہے اور بجلی کڑکتی ہے اور پھر مُوسلا دھار بارش مطلع صاف کر دیتی ہے اسی طرح خُداوند مسیح کی ان باتوں کا حال ہے۔ دِل کے انتہائی تاریک گوشوں کو منوّر کرنے کے لیے ہمیں اُس کی روشنی کی ضرُورت ہے۔ لازم ہے کہ انسان کی رُوحانی فطرت کو خوف، اُمّید، خُوشی اور رنج سے پاک و صاف کیا جائے۔

خُداوند مسیح کے کردار میں دلیری کا عنصر موجُود ہے۔ یہ عنصر انتہاء گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے اور انتہائی بلندیوں پر بھی پرواز کرتا ہے۔ انجیل مقدس میں یہ ایک خاص چیز ہے جو پُرانے اور بوسیدہ نظام کے خلاف ایک بغاوت ہے۔ بغاوت کی یہ فاتحانہ اور تند رَو مدّ و جزر کی لہر کی طرح جو پاک و

صاف کرنے کی قوت رکھتی ہے، آسمانی بادشاہت کی مے کا یہ آتشیں سیال مادہ پرانی مشکوں کو پھاڑ کر باہر نکل آئے گا۔ اب اس سیال کو روکا نہیں جا سکتا جب یہ مے پرانی مشکوں میں بھری جاتی ہے تو وہ ایک دھماکے کے ساتھ پھٹ جاتی ہے۔ خداوند مسیح کی ایک بے ڈھنگی اور غلط سلط تصویر کھینچی گئی ہے کہ وہ بے حد پرہیزگار، محتاط، مذہب پرست اور قدامت پسند اخلاق کا حامی تھا۔ ہم اس تصویر کو رد کرتے ہیں کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ تصویر تاریخی واقعات کے مطابق نہیں ہے۔ اگر خداوند مسیح کمزور ہوتا اور بلند کردار نہ ہوتا تو وہ بدی کو جڑ سے اکھاڑنے کے قابل نہ ٹھہرتا۔ اس قسم کی محتاط شخصیت ہر زمانہ میں جوانوں کے دلوں میں ایک نیا شوق، ایک نیا ولولہ پیدا کرنے کے قابل نہ ہوتی۔

رسم و رواج کے سخت خول نے ابھی تک اس نئی زندگی کے بیج کو باہر نہیں نکلنے دیا تاہم یہ بیج روشنی میں آنے کے لئے جد و جہد کر رہا ہے۔ ماضی کی مردہ زنجیروں نے انسان کی روح کو ہمیشہ جکڑنے کی کوشش کی ہے خداوند مسیح ہمارے زمانے میں پورے اختیار کے ساتھ آتا ہے کیونکہ وہ ہمیں آزاد کرنے کے لئے آیا ہے۔

پندرھواں باب

جنوبی افریقہ

اس صدی کے اوائل میں مسٹر گوکھلے ہندوستان کے ایک مایۂ ناز اور قابل اعتماد لیڈر تھے۔ نومبر ۱۹۱۳ء میں اُنہوں نے بذریعہ تار مجھے اطلاع دی۔ کہ جنوبی افریقہ میں ہندوستانی مزدوروں پر بڑی سختیاں کی جا رہی ہیں اس لئے مجھے فوراً وہاں پہنچ کر ہندوستانیوں کی امداد کرنی چاہیئے۔ افریقہ میں مہاتما گاندھی مزدوروں کے رہنما تھے۔ ۱۸۶۰ء سے ہندوستانی مزدور نٹال میں کام کرنے کے لئے بھرتی کئے جا رہے تھے۔ اُن سے خاص شرائط کے ماتحت کام لیا جاتا تھا اور اُن سے ایک اقرار نامہ لکھوایا جاتا تھا۔ جوں جوں سال گزرتے گئے مزدوری کا یہ طریقہ بہت خراب ہوتا گیا اور اب اِن خرابیوں کی اصلاح ناممکن نظر آتی تھی۔ ہندوستان میں نٹال کے لئے مزدور بھرتی کرنے میں فریب دہی کا بڑا احتمال تھا کیونکہ پیشہ ور بھرتی کرنے والے تعینات کئے گئے تھے اِن پیشہ ور بھرتی کرنے والوں کو فی رنگروٹ بہت زیادہ رقم دی جاتی تھی۔ عورت کو بھرتی کرنے میں مرد کی نسبت زیادہ پیسے دیئے جاتے تھے۔ مزدوری کی اِن شرائط کے تحت ہزارہا ہندوستانی مرد و زن مزدور نٹال پہنچے حتیٰ کہ اُن کی تعداد یورپینوں سے زیادہ ہو گئی۔

حکومت ہند کے پاس نٹال کی حکومت کا معاہدہ موجود تھا۔ اس کی رُو
سے اگر ہندوستانی مزدور پانچ سال تک مزدوری کی تمام شرائط کے مطابق اپنا کام
کرتے تو اس کے بعد وہ آزادی کے مستحق تھے اور وہ نٹال میں آباد ہو سکتے تھے
لیکن کوشش کی جا رہی تھی کہ وہ ہندوستانی مزدور جو پانچ سال کے بعد آزاد ہوں
اُن پر تین پونڈ فی کس کے حساب سے ٹیکس لگا یا جائے۔ یہ ٹیکس اسی صورت
میں معاف ہو سکتا تھا اگر کوئی مزدور کھیتوں میں کام کرنے کے لیے دوبارہ
رضامند ہو جائے اور وہ مزدوری کی پرانی شرائط کو قبول کرے۔ اگر وہ
مزدور یہ ٹیکس ادا کرنے سے انکار کرے اور وہ دوبارہ مزدوری کرنے پر
رضامند نہ ہو تو اُسے نٹال سے نکال دیا جائے۔

اس طرح نٹال کی حکومت کو یہ اُمید تھی کہ یا تو ہندوستانی کھیتوں میں
مزدوری کریں گے یا اُنہیں نٹال سے نکال دیا جائے گا۔ یہ ٹیکس بہت زیادہ
تھا کیونکہ ہر ایک مرد اور عورت کے علاوہ پندرہ برس سے زیادہ عمر کے
بچوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا تھا۔ مؤرخ ڈبلیو۔ڈبلیو۔ہنٹر[1] نے اس سسٹم کے
متعلق لکھا ہے کہ اس کی "بنیاد غلامی" پر ہے۔ جب میں نے خود بڑی احتیاط
سے اس "سسٹم" کا مطالعہ کیا تو مجھے اس کے متعلق سر ڈبلیو۔ڈبلیو۔ہنٹر کی
رائے صحیح معلوم ہوئی۔ کوئی ہندوستانی، نہ تو کسی دوسرے مالک کے پاس کام
کر سکتا تھا اور نہ اپنے پہلے مالک کے پاس سے کام چھوڑ سکتا تھا۔ نہ اگر
کوئی ہندوستانی ایسا کرتا تو اُس پر ملزم کی حیثیت سے مقدمہ چلایا جاتا تھا۔
اگرچہ حکومت کی طرف سے نگران موجود تھے لیکن پھر بھی ظلم ہوتے تھے

[1] W.W. HUNTER.

اور اصلاحِ احوال کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی تھی کیونکہ ہندوستانی مزدور اتنے خوفزدہ تھے کہ وہ اپنے نگران کار اور مالکوں کے خلاف گواہی دینے سے ڈرتے تھے۔ اس سسٹم کا سب سے ظالمانہ پہلو یہ تھا کہ ہر سو آدمیوں کے ساتھ چالیس عورتیں بھرتی کی جاتی تھیں۔ چونکہ بہت ہی کم شادی شدہ جوڑے کام کرنے کے لئے نٹال میں آتے تھے اس لئے مردوں اور عورتوں کی تعداد میں اس مہلک فرق نے خوفناک حد تک بداخلاقی کی گنجائش پیدا کر دی تھی۔ میں نے خود ان ساری باتوں کا مطالعہ کیا۔ ۱۸۳۴ء میں غلامی کی منسوخی کے بعد خاص شرائط پر مزدوری کرنے کا طریقہ رائج ہوا۔ یہ طریقہ ماریشس، برٹش گی آنا، ٹرینیڈاڈ، جمیکا، گرینا ڈا اور دیگر گنا پیدا کرنے والی نوآبادیوں میں اس غرض سے شروع کیا گیا کہ یہ طریقہ غلاموں سے کام لینے کے قدیم طریقے کی جگہ لے لے اور اس نئے طریقے نے بعض اوقات مبالغہ آمیز حد تک غلامی کے طریقے کی برائیاں پیدا کر دیں۔ اگر مالک اچھا ہوتا تو ہندوستانیوں سے اچھا سلوک کیا جاتا تھا لیکن اگر مالک برا ہوتا اور وہ سختی سے مزدوروں سے کام لینے پر تلا رہتا تو یہ سسٹم برائی کا ایک خوفناک سسٹم بن جاتا تھا۔ اس صورت میں اکثر خودکشی کی وارداتیں (ہونے میں) آیا کرتی تھیں اور اخلاقی کا حال اس سے بھی برا تھا۔ اس سے دکھوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ بدنامی آخرکار ایک خوفناک المیے میں ختم ہوتی تھی یعنی عورت کو قتل کر دیا جاتا تھا اور مرد خودکشی کر لیتا تھا۔ ایسی واردات کو "گلا کاٹنے" کی واردات کہا جاتا تھا کیونکہ مرد گنا کاٹنے والے تیز ٹکوے کے ساتھ عورت کو قتل کرنے

گھاٹ اُتار دیتا تھا۔ گورنمنٹ کی رپورٹوں میں یہ چیز دیکھی گئی تھی کہ برطانوی نوآبادیوں میں جہاں کمیں شرائط پر مزدوری کرانے کا طریقہ رائج ہوا ہے وہاں قتل اور خودکشی کی وارداتوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

نٹال میں جو ہندوستانیوں پر تین پونڈ فی کس کی شرح سے ٹیکس عائد کیا گیا تھا اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی کھیتوں میں کام کرنے پر رضامند ہو جائیں۔ یہ ٹیکس کسی انسانی نقطۂ نگاہ سے جائز نہیں تھا اگرچہ یورپین لوگ اس ٹیکس کو ہٹانے کے بے حد مخالف تھے تاہم جنرل بوتھا اور جنرل سمٹس جو اس وقت برسرِ اقتدار تھے، اس ٹیکس کو منسوخ کرنے پر رضامند نہ ہوئے کیونکہ اُن کے سامنے چند ایک مجبوریاں تھیں۔ جب مسٹر گوکھلے اس غرض سے جنوبی افریقہ میں ان سے ملے تو انہوں نے وعدہ بھی کر لیا کہ وہ اس ٹیکس کو منسوخ کرانے میں کارروائی کریں گے، لیکن اس کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ وہ اپنا وعدہ پورا کرنے سے معذور ہیں۔

جب اس ٹیکس کو منسوخ کرانے کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں تو مسٹر گاندھی اور اُن کے ساتھیوں نے ستیہ گرہ شروع کر دی۔ انہوں نے شمالی نٹال کی کوئلہ کی کانوں میں کام کرنے والے غریب اور شکستہ حال مزدوروں کی ایک "فوج" جمع کی۔ وہ ٹرانسوال میں اپنے مطالبات اور شکایات کا اظہار کرنے کے لئے اکٹھے ہوئے۔ دو ہزار سے زائد مردوں، عورتوں اور بچوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا اور وہ ڈریکنسبرگ[1] کی پہاڑیوں کو عبور کر کے ٹرانسوال کی طرف روانہ ہوئے۔ کئی ہزار اور مزدور بھی اپنے لیڈر کے احکام کے

---

[1] DRAKENSBERG

منتظر تھے۔ اُنہوں نے کانوں میں کام کرنا چھوڑ دیا اور ٹرانسوال میں داخل ہو کر اُنہوں نے دیدہ دانستہ قید ہونے کی دعوت قبول کی تھی۔ کام چھوڑنا اور یوں شہر میں داخل ہونا خلافِ قانون اور قابلِ سزا جرم تھا۔ مجسٹریٹ اس جرم کی سزا قید بامشقت دے سکتا تھا۔ شرائط پر کام کرنے والا ہر ایک مزدور اور آزاد ہندوستانی اس سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ اُنہوں نے اس طرح پیدل جلوس کی صورت میں پیدل چل کر تکلیفوں کا سامنا کیا لیکن کسی مزدور کا حوصلہ پست نہ ہوا۔

آخر کار مہاتما گاندھی اور اُن کے بہت سے ساتھیوں کو قید کی سختیاں جھیلنی پڑیں۔ ہر ایک لیڈر یا تو جیل میں گیا یا گرفتار ہوا۔ جب ہندوستانی مزدوروں نے کام کرنے سے انکار کر دیا تو نٹال میں تشدد ہوا اور گولی بھی چلائی گئی۔ ان واقعات کی خبر ہندوستان میں پہنچی اور لوگوں میں نفرت اور غصے کی آگ بھڑک اُٹھی۔ ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ہارڈنگ نے ایک مشہور تقریر کی جس میں اُنہوں نے ہندوستانی نقطۂ نگاہ کی حمایت کی۔ یہی موقع تھا جب مسٹر گوکھلے نے مجھے نٹال میں جانے کے لیے تار دیا۔ مسٹر گاندھی اور دیگر ہندوستانی لیڈر جیل میں تھے۔ میری والدہ محترمہ ولایت میں بیمار پڑی تھیں اور میں نے اُنہیں خط لکھا تھا کہ میں جلد ہی ہندوستان سے اُن کے پاس آ جاؤں گا۔ میری والدہ محترمہ کو بیماری سے شفا پانے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ اُنہوں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی قربانی اس وقت کی جب اُنہوں نے مجھے اجازت دے دی کہ میں نٹال جا کر

اُن کی ہندوستانی بہنوں کی امداد کروں۔ جب مَیں جنوبی افریقہ میں پہنچا تو اس کے تھوڑی دیر بعد وُہ اَبدی نیند سو گئیں اَور مَیں اُنہیں ملنے سے محرُوم رہا۔

وِلی پیرسن[1] جو مانچسٹر کے مشہُور و معرُوف ڈاکٹر سیموایل مرحُوم پاسبان[2] کے صاحبزادے تھے، وُہ بھی میرے ساتھ نٹال میں گئے۔ اُن کی والدہ کویکر تھیں۔ وُہ دہلی میں میرے بڑے گہرے دوست تھے۔ مَیں نٹال میں جانے کے لئے بالکل تیار بیٹھا تھا۔ مجھے آدھی رات کے وقت ریل کے ذریعہ روانہ ہونا تھا تاکہ مَیں جہاز پر سوار ہو سکوں۔ ایسی حالت میں وُہ میرے پاس آئے اَور کہنے لگے "جانے سے پیشتر مَیں تمہیں ایک تحفہ دینا چاہتا ہُوں"۔ مَیں نے بڑے اشتیاق سے پُوچھا کہ وُہ کیا تحفہ ہے تو اُنہوں نے کہا۔ "مَیں خُود ہُوں"۔ یہ کہہ کر وُہ کھِل کھِلا کر ہنسنے لگے اَور مَیں حیران رہ گیا۔ وِلی پیرسن واقعی ایک خُوبصُورت تحفہ تھے۔ وُہ بڑے شگفتہ مزاج تھے۔ اُن سے بہتر کوئی دُوسرا شخص، دوست اَور وفادار ساتھی نہ ہو سکتا تھا۔ جب وُہ میرے ساتھ نٹال میں پہنچے اَور جُونہی ہندوستانیوں نے اُنہیں دیکھا وُہ اُن کے گرویدہ ہو گئے۔ اِن تمام بحری سفروں میں اُنہوں نے میری بے حد امداد فرمائی تھی جس کے لئے مَیں اُن کا ممنُون احسان ہُوں۔ ۱۹۲۲ء میں وُہ اٹلی میں ریل گاڑی سے گر پڑے اَور جان بحق تسلیم ہُوئے۔ اُن کی موت میرے لئے ایک صدمۂ عظیم تھی۔ اُن کی مرگِ ناگہانی کے صدمے کو برداشت کرنا میرے لئے محال تھا۔

---

[1] WILLIE PEARSON [2] QUAKER.

کولمبو سے ڈربن تک سفر کے دوران ہمیں طوفان کا سامنا کرنا پڑا اور ہم پانچ دن دیر سے منزلِ مقصود تک پہنچے۔ آخرکار جب ہمارا جہاز بندرگاہ پر پہنچا تو مہاتما گاندھی ہمارا خیر مقدم کرنے کے لئے وہاں موجود تھے۔ جنرل سمٹس نے اُنہیں غیر مشروط طور پر رہا کر دیا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ کوئی سمجھوتہ ہو جائے گا۔ دُنیا کی رائے عامہ ناجائز اور ناواجب ٹیکس کے خلاف بیدار و بلند ہو رہی تھی۔

ہمیں فوراً معلوم ہو گیا کہ اس خرابی کی اصل وجہ رنگ و نسل کا امتیاز ہے۔ جنوبی افریقہ میں وُہ یورپین لوگ جو گنّے کے کھیتوں کے مالک نہ تھے ہندوستانیوں کو "کالی نسل" ہونے کی وجہ سے مُلک سے بالکل نکال دینا چاہتے تھے۔ وُہ افسوس کرتے تھے کہ ہندوستانیوں کو کیوں اس مُلک میں آنے کی اجازت دی گئی تھی۔ ہندوستانی جب تک جنوبی افریقہ میں رہے یوروپین اقوام کا ہمیشہ یہی ارادہ رہا کہ وُہ ہندوستانیوں کو "کالی نسل" ہونے کی وجہ سے حقیر سمجھیں اور دُوسری "کالی نسلوں" کی طرح اُنہیں بھی سماجی اور سیاسی حقُوق سے محرُوم رکھیں۔

میرے دہلی کے قیام کے دوران اور شملہ میں مسٹر سٹوکس کی معیّت میں مسیحی کلیسیا کے اندر "رنگ" اور "نسل" کا سوال میرے لئے سوہانِ رُوح رہا۔ ایک مسیحی ہونے کی حیثیت سے مُجھے یہ دیکھنا ناممکن نظر آتا تھا کہ انسانی زندگی میں نسل اور رنگ کا امتیاز پایا جائے۔ یہ اس کا لازمی نتیجہ ایک جدید ذات پات کے معاشرے کا وجُود میں آنا تھا۔ اس نوعیّت کا معاشرہ کبھی بھی خُداوند مسیح

کی مرضی کے مطابق نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اُس نے خُدا کی ابُوّت اور انسان کی اُخوّت کی تعلیم دی ہے۔ اگر مسیحی دُنیا "نسلی" کلیسیاؤں میں بٹ کر رہ گئی اور گورے اور کالے کی تمیز برقرار رہی اور رنگ اور نسل کی بنا پر لوگوں کو عشائے ربانی سے محروم رکھا گیا تو انسان کی اُخوّت کا یہ بنیادی اصول جس کی خاطر خداوند مسیح نے صلیب پر جان دی تھی۔ بے اثر ثابت ہوگا۔ ہم "خدا کے بیٹے کو اپنی طرف سے دوبارہ مصلوب کر کے علانیہ ذلیل کرتے ہیں۔"

نئے عہدنامہ میں مجھے صاف صاف معلوم ہوا کہ اس معاملہ میں انطاکیہ کے مقام پر مقدس پولس رسول نے مقدس پطرس رسول کی برملا مخالفت کی کیونکہ اس وقت یہودی لوگ اپنے آپ کو دوسری قوموں سے افضل سمجھتے تھے اور خطرہ تھا کہ کہیں مسیحی کلیسیا دو حصوں میں نہ بٹ جائے۔ مقدس پولس رسول کے خطوط میں اسی مسئلہ پر سب سے زیادہ بحث کی گئی ہے۔ اور مسئلہ کی نسبت اس مسئلے کے متعلق نئے عہد نامہ اور خداوند کی تعلیم بالکل صاف اور واضح ہے۔ مقدس پولس رسول نے فرمایا کہ:-

"وہاں نہ یونانی رہا نہ یہودی۔ نہ ختنہ نہ نامختونی، نہ وحشی نہ سکوتی، نہ غلام نہ آزاد۔ صرف مسیح سب کچھ اور سب میں ہے۔"

لیکن جب میں شمال میں پہنچا تو میں نے مسیحی کلیسیا میں اسی قسم کا نسلی امتیاز دیکھا جس کے متعلق مقدس پولس رسول نے اپنی ناپسندیدگی اور نفرت کا اظہار کیا تھا۔ اسی نسلی امتیاز کی وجہ سے کئی نئی کلیسیائیں معرض وجود میں

آرہی تھیں اور یوں نہ صرف انتظامی طور پر بلکہ بلا واسطہ قوانین کے ذریعہ
بھی گورے اور کالے کی تمیز برقرار رکھی جارہی تھی۔ مختلف نسلیں سماجی طور
پر ایک دوسرے سے علیحدہ تھیں اور رائے عامہ اسی سانچے میں ڈھل رہی
تھی۔ جن حالات میں زمانہ ماضی سے یہ ورثہ ہمیں ملتا آرہا تھا۔ بوئر ری پبلک
کے زمانے کا یہ قابلِ وصول قرض تھا۔ اس "ری پبلک" کا سب سے بڑا
قانون یہ تھا کہ "گورے اور کالے میں نہ تو کلیسا میں مساوات ہوگی اور
نہ ہی ریاست میں"۔ نٹال کے برطانوی آبادکار جبلی طور پر اس قسم کا
رویہ اختیار کر رہے تھے جس کا لازمی طور پر یہی نتیجہ نکل رہا تھا۔
جب ہم جہاز سے ڈربن میں اُترے تو ہمیں پہلے ہی روز نسلی عصبیت
واضح طور پر نظر آنے لگی۔ کچھ دیر کے بعد ہمیں اس کی بدترین
صورت سے واسطہ پڑا۔ نسلی عصبیت اپنی بُرائی ہے جو زہر ہے
روحانی مرض کی طرح ایک [illegible]
اس [illegible] کو شکار ہو چکا تھا اور اس کی روک تھام کے لئے کوئی
کوشش نہیں کی جارہی تھی۔ [illegible] مسیحی کلیسیا کی کئی شاخیں بھی اس مرض میں
مبتلا ہوچکی تھیں۔

اسلام میں اس قسم کی کوئی بات نہیں ہے۔ اُن میں نسلی امتیاز
کہیں نظر نہیں آتا۔ لیکن شرم کا مقام ہے کہ مسیحی ممالک میں نسلی امتیاز موجود
ہے کیونکہ ہم جس چیز کا دعویٰ کرتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے۔ مجھے ایک
مسیحی گرجا میں وعظ کرنے کے لئے بلایا گیا۔ وہاں [illegible] اپنے ساتھ [illegible]

کو بھی گرجے کے دروازے تک لے آئے کیونکہ وہ بھی وعظ سُننا چاہتے تھے لیکن اس کے بعد مجھے یہ سُن کر بے حد ندامت ہوئی کہ گرجا کے وارڈن نے اُنہیں گرجا میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی کیونکہ وہ کالی نسل سے تعلق رکھتے تھے اور ایشیائی تھے۔ اس قسم کے انکار سے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ خداوند مسیح کو خود اپنے ہی گرجا میں جہاں اُس کے نام کی تمجید ہو رہی تھی داخل ہونے کی اجازت نہ ملی۔ جو لوگ ان حقائق سے اچھی طرح واقف ہیں اُنہوں نے ہمیں بتایا کہ جنوبی افریقہ میں اس قسم کے واقعات عام طور پر ہوتے رہتے ہیں۔

ایک دفعہ مجھے کیپ ٹاؤن میں جانے کا اتفاق ہوا۔ نٹال کی طرح یہاں نسلی عصبیت نام نہیں ہے۔ مہاتما گاندھی نے اپنے بیٹے مُنی لال گاندھی کو میری خدمت کے لئے ساتھ کر دیا تھا۔ مُنی لال نے بڑی اچھی طرح میری خدمت کی۔ یہ لڑکا مجھے اپنے بیٹے کی طرح عزیز تھا۔ ایک دن اُس نے بڑے اشتیاق سے مجھے کہا کہ کیا وہ گرجا میں میرا وعظ سُننے کے لئے آسکتا ہے؟ پس مَیں اُسے ایک قصباتی گرجے میں لے گیا۔ اس کلیسیا کے پادری صاحب ہندوستانیوں کے بڑے دوست تھے۔ یہ کلیسیا بڑی مدت سے ہندوستان میں غیر ملکی مشن کی مالی امداد کر رہی تھی۔ عبادت سے پہلے ہم نے پادری صاحب اور اُن کی اہلیہ محترمہ کے ساتھ چائے پی۔ یہاں تک تو خیریت رہی لیکن جب مَیں نے کہا کہ منی لال بھی میرا وعظ سُننے کے لئے گرجا میں جائے گا تو پادری صاحب کا چہرہ اُتر گیا کیونکہ وہ خود تو خوشی سے اس بات کی اجازت دے دیتے لیکن

ممکن تھا کہ اُن کی کلیسیا کے شرکاء اعتراض کرتے۔ ان کے نزدیک ایک ہندستانی لڑکے کا اُن کے پہلو بہ پہلو بیٹھ کر خُداوند مسیح کا پیغام سُننا ناممکن تھا۔ آخر کار سمجھوتہ یہ ہُوا کہ منی لال پادری صاحب کی اہلیہ محترمہ کے ساتھ پچھلی سیٹ پہ گرجے کے دروازے کے قریب بیٹھ کر خُدا کا کلام سُن سکتا ہے۔ اس قسم کے واقعات یکے بعد دیگرے رُونما ہوتے رہے۔ مَیں ایک اَور واقعہ کا تذکرہ کرنا چاہتا ہُوں۔ یہ واقعہ اگرچہ معمُولی ہے مگر اس نے میرے دِل پہ بڑے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔

مَیں ایک اتوار کی صبح سینٹ جارج کیتھیڈرل کیپ ٹاؤن میں عشاءِ ربّانی کی عبادت کروا رہا تھا۔ اس جگہ نسلی عصبیت نہیں تھی۔ مَیں نے خیال کیا کہ تمام شرکاء پاک عشاء لے چُکے ہیں۔ مَیں عبادت کے دُوسرے حصّے کو شروع کرنے ہی کو تھا کہ مَیں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو مُجھے ایک بُوڑھی حبشی عورت پاک میز کی طرف آتی ہُوئی نظر آئی۔ وُہ اس بات کے انتظار میں تھی کہ تمام یورپین لوگ عشاء لے کر واپس اپنی اپنی جگہوں پر آ جائیں تو وُہ عشاء میں شریک ہو۔ وُہ بڑے ادب سے دو زانو ہُوئی اَور مَیں پاک عشاء دینے کے لئے اُس کی طرف بڑھا۔ مُجھے ایسا معلُوم ہوتا تھا کہ یہ خاتُون افریقہ کی رُوح کی نمائندگی کر رہی ہے۔ وُہ غم سے جُھکی ہُوئی تھی کیونکہ یورپ نے اس پہ ناقابل برداشت مظالم ڈھائے تھے اَور جس تحمل سے افریقہ نے ان مظالم کو برداشت کیا ہے وُہی اُن کی مخلصی کا سب سے بڑا عہد ہے۔

ایک اتوار ڈینٹ نے مُجھے کیتھڈرل میں وعظ کرنے کے لئے کہا۔ میرے دِل

ٹ DEAN.

میں اس ظالمانہ واقعہ کی وجہ سے آگ سی لگی ہُوئی تھی۔ مَیں نے کلام مقدس میں سے ایلیاہ اور بعل کے پجاریوں (نبیوں) کا ورد انتخاب کیا۔ افریقہ میں دو بُتوں کی پُوجا کی جارہی ہے اور وہ بُت "سونا" اور "نسلی عصبیت" تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ اس دن مُتذکرہ موضوع پر وعظ کروں۔ مَیں نے اپنے وعظ میں اپنے سب دلی جذبات کا اظہار کر دیا۔

لیکن، اس کے بعد مُجھ پر مایوسی چھا گئی۔ مُجھے ایسا محسُوس ہُوا کہ مَیں ایک سرد مہر اور بے حس جماعت کے دِلوں میں اثر پیدا کرنے سے قاصر رہا ہُوں لیکن مسٹر جے۔ ایکس[۱] میریمین نے مُجھے ایک پُر محبت خط لکھا۔ یہ صاحب ابھی ابھی لیجسلیٹو اسمبلی کی ملازمت سے ریٹائر ہُوئے تھے۔ اُنہوں نے بڑے مُشفقانہ انداز میں تحریر فرمایا:۔

"مَیں آپ کا بڑا ہی شُکر گزار ہُوں، لیکن مَیں آپ کو بتانا چاہتا ہُوں کہ ہم اسرائیلیوں میں چند لوگ ایسے موجُود ہیں جنہوں نے بعل کے سامنے گُھٹنے نہیں ٹیکے۔ اُن میں سے ایک سینٹ ہے۔ مَیں چاہتا ہُوں کہ آپ اُس سے مُلاقات کریں۔ مَیں اُس کی لکھی ہُوئی نظموں کی کتاب آپ کو بھیج رہا ہُوں"۔

یہ کتاب آرتھر شرلے کریس[۲] کی تصنیف تھی۔ وُہ مشونا لینڈ[۳] کے رہنے والے اور آکسفورڈ کے نوجوان شاعر تھے۔ خُدا نے اُنہیں موسیقی کی نعمت ودیعت کی ہُوئی تھی۔ وُہ افریقہ کے باشندوں کے درمیان ایک سادہ سی زندگی بسر کرتے اور اُن کی طرح تمام صعُوبتیں برداشت کرتے رہے۔ اُن کی کتاب کی وجہ سے اُن سے میری دوستی ہو گئی۔ جُوں جُوں سال گُزرتے گئے ہماری

۱۔ J. X. MERRIMAN ۲۔ ARTHUR SHIRLEY CRIPPS.
۳۔ MASHONALAND.

دبتی زیادہ گہری ہوتی چلی گئی۔

افریقہ میں ایک قبیلہ ہے جو بنتو کہلاتا ہے۔ اس قبیلہ کے لوگوں کے پُرحسرت چہرے صدیوں کے غم اور دُکھ کے آئینہ دار تھے۔ تھوڑے ہی عرصے میں میرے دِل میں اُن کے لئے محبت اور ہمدردی پیدا ہو گئی۔ آلوسکریز نے مجھے اس بات کی تلقین کی تھی کہ میں افریقہ کے رازہائے درُون پردہ سے واقفیت حاصل کروں۔ میں جنوبی افریقہ کی ایک معزز خاتون مس مولینو سے یہ معاملات زیادہ تفصیل سے سیکھنا چاہتا تھا۔ آلوسکریز اور یہ معزز خاتون اُن اشخاص میں سے تھے جنہوں نے ظلم کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکے تھے۔ اس خاتون کے سفید بالوں اور تھکے تھکے چہرے سے صاف عیاں تھا کہ اُس نے مظلوموں کی دادرسی کی خاطر عمر بھر جدوجہد کی ہے۔

وُہ ایک مرتبہ ہندوستانیوں کے ایک جلسہ سے خطاب کر رہی تھیں۔ اُنہوں نے فرمایا کہ "اگر آپ مصائب برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں تو اسی صُورت میں آپ افریقہ کے قابلِ قدر سپوت کہلا سکتے ہیں اور افریقہ کو مادرِ وطن کہنے کے حقدار ہو سکتے ہیں۔ مصائب برداشت کرنا تو ہمارا اُمتیاز ادا حق ہے۔ محبت ہی ہی الٰہی شاہراہ ہے اور افریقہ کا بار اُٹھانے کی تیاری کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ افریقہ سے محبت کریں۔ وُہ ہندوستانی حاضرین جلسہ سے کہہ رہی تھیں کہ وُہ بوئر ہے۔ جب وُہ ایک لڑکی تھی تو وُہ ایک دُور دراز سنسان فارم میں خاموش پہاڑوں پر رہا کرتی تھی جہاں شور کرتی ہُوئی پہاڑی ندیاں بہتی تھیں۔ وُہ ستاروں سے روشن وادی میں اپنے لوگوں میں اِدھر اُدھر

پھر اُبھرتی تھی۔ مجھے تین چیزیں بالکل واضح نظر آتی ہیں۔ اِن تینوں چیزوں کا افریقہ کی سرزمین کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔

اوّل:۔ موسیقی کی قوّت۔ ولندیزی اور انگریزی کی آوازیں خواہ کتنی ہی تُند کیوں نہ ہوں اس پرسکون آسمان اور شبنمی پہاڑوں کے دیس میں کومل بن جاتی ہیں۔ اگر کوئی انسان محبّت کا راگ الاپے تو افریقہ کے رہنے والوں کی رُوح میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ دُنیا کی کوئی دُوسری قُوّت یہ اثر پیدا نہیں کر سکتی۔ اس وقت دِل کی تمام تلخیاں دُور ہو جاتی ہیں۔

دوم۔ مصائب برداشت کرنے کی قوّت:۔ جس طرح افریقہ میں اہلِ افریقہ دُکھ درد برداشت کرتے ہیں اُس طرح دُکھ درد کو دُنیا کے کسی دُوسرے خطّے میں برداشت نہیں کیا گیا۔ دُکھ نے اِن کے دِلوں کو سخت بنانے کی بجائے نرم بنا دیا ہے۔ آخر کار صبر سے درد اور دُکھ کی آواز سُنی جائے گی۔

سوم:۔ عورت کی اخلاقی قوّت:۔ یہ چیز مُستقبل میں ظاہر ہو گی۔ یہاں عورت ہمیشہ باربردار رہی ہے اور چونکہ افریقی عورت کی طرح کسی دُوسری عورت نے بوجھ نہیں اُٹھایا ہے اس لئے وُہ دُکھ اور مُصیبت کی آگ میں پاک اور صاف ہو کر کُندن کی طرح دمکتی ہُوئی نکلے گی۔

جب مس مولیشوا مجلس سے خطاب فرما رہی تھیں تو اُن کے چہرے پر دُکھ اور مُصیبت کے نشان نظر آ رہے تھے چنانچہ مَیں نے ایک نئے انداز سے محسُوس کیا کہ خُداوند مسیح کی تعلیم تمام زمانوں اور تمام قوموں اور نسلوں کے لئے ہے۔ دُنیا میں محبّت سب سے قیمتی چیز ہے۔ محبّت راستبازی کی

نفرت سے زیادہ اہمیت ہے۔ صرف مخلص دینے والی محبت سے ہی ان مظالم کا ازالہ ہو سکتا ہے جو افریقہ پر ڈھائے گئے ہیں۔

اس کے بعد نٹال میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس سے میرا دل پگھل گیا۔ یہ واقعہ مس مولیٹو کے اس خیال کی وضاحت کر سکے گا کہ افریقہ میں مصائب کو برداشت کرنا ہمارا "خداداد حق" ہے۔ ڈربن[1] میں ہندوستانیوں نے میرے اعزاز میں ایک الوداعی پارٹی کا اہتمام کیا۔ اس میں بہت سے زولو[2] قبیلے کے لوگ بھی تھے۔ اس قسم کا واقعہ اس سے پیشتر بھی رونما ہو چکا تھا۔ میں نے اُن کے قد و قامت کو غور سے دیکھا اور جب میں تقریر کر رہا تھا تو وہ اُداس اور افسردہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ اُن کے چہرے پژمردگی کے آئینہ دار تھے۔ اس آخری مرتبہ میں ایک عمر رسیدہ مسلمان میاں خاں کی دکان پر پہنچا۔ میں اسی جگہ رہا کرتا تھا۔ میں ابھی اس مسلمان کے ساتھ بیٹھ کر چائے نوش کیا چاہتا تھا کہ دو زولو سردار دکان میں داخل ہوئے۔ ہم نے انہیں بھی اپنے ساتھ بیٹھ کر چائے پینے کی دعوت دی۔ ان سرداروں میں سے ایک نے میری طرف اشارہ کر کے میاں خاں سے کہا "ہم اس صاحب سے ایک سوال پوچھنا چاہتے ہیں؟"

مجھے ان کے سوال کا انگریزی ترجمہ بتایا گیا تو میں نے اُن سے کہا:۔

"آپ بڑے شوق اور آزادی سے اپنے دل کی بات بتائیے"۔ اس زولو سردار نے میری طرف مخاطب ہو کر کہا:۔

جب آپ ہندوستانیوں سے مخاطب ہوتے ہیں تو ہمیں آپ کی نگاہوں

---

[1] DURBAN [2] ZULUS

سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اُن کے لئے اپنی جان تک دینے کے لئے تیار ہیں۔ کیا آپ ہمارے لئے بھی اپنی جان دینے کے لئے تیار ہیں؟"

یہ سادہ سوال ایسے یاس انگیز اشتیاق سے کیا گیا تھا کہ وہ سیدھا میرے دل میں اُتر گیا۔ میں ـــ بڑے خلوص سے اس سوال کا جواب دینے کی خاطر تھوڑا سا ہچکچایا اور میں نے کہا:- "اگر موقع آیا تو میں تیار ہوں۔" جب میں نے کسی قدر توقف کیا تو میرے دل میں بجلی کی سی تیزی سے یہ خیال آیا کہ خداوند مسیح کی خدمت میں نسل اور قوم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اُس میں سب برابر ہیں۔ صرف الٰہی محبت کے وسیلے نوعِ انسانی کی تمام اقوام کے رشتے یکساں ہیں۔

مجھے اکثر اوقات ایک اور عظیم شخصیت سے ملنے کا موقع ملتا رہتا۔ یعنی بیگم گرامی مسز ڈریو تھیں۔ وہ ڈبلیو۔ ای گلیڈسٹون کی بیٹی تھیں اور کئی برس ہندوستانیوں کی جدوجہد میں اُن کے معاون تھیں۔ وہ ہر سال ... گورنر جنرل کی معرفت خاموشی سے بڑی امداد فرمایا کرتی تھیں۔ اُن کی پاک نگاہوں میں محبت کی چمک تھی اور وہ نسلی غرور کی گہرائیوں سے واقف تھیں۔ اُس وقت اُن کی میرے ساتھ زبردست ہمدردی۔ اور مسز ڈریو[1] کے ساتھ میری گہری ہمدردی عین برکت تھی۔

مہاتما گاندھی سے میری پہلی ملاقات جنوبی افریقہ میں ہوئی۔ عدم تشدد سے فتح حاصل کرنے کی قوت اُن کی مصائب برداشت کرنے والی زندگی کے ہر ایک پہلو میں بدرجۂ اُتم موجود تھی۔ جونہی ہم نے ایک دوسرے

---

[1] MRS. DREW.

کو دیکھا تو ہمارے دِلوں میں ایک دُوسرے کے لئے محبّت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ اُس وقت سے لے کر آج تک ہمارے دِل ایک دُوسرے سے محبّت کے رشتے سے مُنسلک ہیں۔ اُن کی رفاقت نے مجھ میں ایک نئی رُوح پھُونک دی اَور میری تمام قوتوں کو بیدار کر دیا۔ اُن کی بلند حوصلگی نے مجھ میں بھی جُرأت پیدا کر دی۔ اُن کے دِل میں ہر ہستی چیز کے لئے جو دُکھ اَور درد برداشت کر رہی تھی، بڑے ہی نازک جذبات تھے۔ اسی طرح وُہ حق کی تلاش میں بھی سرگرداں تھے۔ اسی حق یا سچائی کا نام خُدا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دِن مَیں اُن کے ساتھ ٹرانسوال میں پریٹوریا کے قریب ایک ندی کے کنارے بیٹھا تھا۔ اُس دِن بہُت گرمی تھی اور مَیں یہ دلیل پیش کر رہا تھا کہ چونکہ قُدرت نے یہ انتظام کر رکھا ہے کہ اعلیٰ زندگی ادنیٰ زندگی کو کھا کر گزارہ کرے اس لئے اگر انسان حیوانوں کو اپنی خوراک کے طور پر استعمال کریں تو یہ قانُونِ اخلاق کے خلاف نہ ہوگا۔

یہ سُن کر مہاتما گاندھی نے مجھ سے کہا "کیا آپ مسیحی ہو کر اس قسم کی دلیل پیش کر رہے ہیں؟ میرا خیال تھا کہ آپ کا یہ ایمان ہے کہ خُداوند جان لینے کے لئے نہیں بلکہ جانیں بچانے کے لئے مجسّم ہُوا۔ مسیح کی زندگی نے آپ کے لئے اَور دُوسروں کے لئے جان دے کر اپنی سچائی کو پا لیا۔ کیا زندگی لینا زندگی دینے سے زیادہ الٹی چیز نہیں ہے؟"

اُن کی باتوں میں مجھے اُن کی رُوح کار فرما نظر آئی۔ اُن کی رُوح قربان ہونے کے لئے ہر وقت تیار رہتی تھی۔ اُن کی خوشی اسی میں تھی۔

پہلے ہی دن سے مجھے جبلّی طور پر یہ محسوس ہُوا کہ دُنیا میں نہ صرف ایک عظیم المرتبت نئی شخصیّت پیدا ہُوئی ہے، جو مردوں اَور عورتوں کے دِل ناقابلِ یقین قُربانی دینے کی طرف مائل کر رہی ہے، بلکہ وہ ایک نئی مذہبی سچائی ہے جو نئی تو نہ تھی بلکہ وُہ ستاروں اَور قدیم الایّام پہاڑوں کی طرح قدیم تھی۔ اُن کا پیغام یہ تھا کہ "دُکھ اُٹھانا اَور مخلصی بخش محبّت ناقابلِ تسخیر قوّت ہے"۔ مِس مولٹینو نے اسی قسم کا دِل ہلا دینے والا پیغام دیا تھا۔ اُنہوں نے اپنی تقریر کے دوران یہ کہا تھا کہ "دُکھ اُٹھانا محبّت کی الٰہی شاہراہ ہے"۔

جنُوبی افریقہ کی جدوجہد کے دَوران مَیں نے اپنی آنکھوں سے اس بات کا مشاہدہ کیا تھا۔ وُہ مُٹھی بھر ہندوستانی جو نٹال میں سب قسم کے مصائب برداشت کر رہے تھے، ابتدائی زمانہ کی اُس کلیسیا کی مانند تھے جب خُداوند مسیح کے شاگردوں کی ہر ایک چیز مُشترک تھی۔ نٹال کے ہندوستانی بھی بڑی محبّت سے رہتے تھے۔ وُہ بڑے سادہ مزاج تھے لیکن یورپین لوگوں کا یہ حال تھا کہ اُن میں نسلی عصبیّت بڑی بھونڈی صُورت اختیار کر چُکی تھی۔

مَیں نٹال میں آیا تو مَیں نے پہلی شام فونکس آشرم[ل] میں گذاری۔ یہاں مہاتما گاندھی اَور اُن کے چیلوں نے اپنی طرز کی مذہبی زندگی کی داغ بیل ڈالی تھی۔ اس آشرم میں مجھے ابتدائی زمانہ کی مسیحی کلیسیا کے ساتھ مماثلت نظر آئی۔ مہاتما گاندھی چھوٹے چھوٹے بچّوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ وُہ ان بچّوں سے بے حد محبّت کرتے تھے۔ مسز گاندھی اَور اُن کے بیٹے ابھی

ل PHOENIX ASHRAM.

تک جیل سے رہا نہیں ہوئے تھے اور مہاتما جی اکیلے ہی تھے۔ ایک ننھی سی لڑکی جو ہندوستان کے کسی اچھوت خاندان سے تعلق رکھتی تھی اُن کی آغوش میں تھی اور ایک دائم المرض مسلم لڑکا بھی اُن کی آغوش میں بیٹھا ہُوا تھا۔ لڑکا چاہتا تھا کہ مہاتما گاندھی خاص اُسی کیطرف متوجہ ہوں۔ زرونوقبیلہ کی ایک مسیحی عورت بھی کھانا کھانے تک ہمارے پاس ٹھہری رہی۔ وہ پہاڑ پر زرونومشن کی طرف جا رہی تھی۔ اُس شام ہم نے بوئروں اور انگریزوں کے متعلق محبت اور پیار کی باتیں کیں۔ مجھے رسُولوں کے اعمال کی کتاب کے یہ الفاظ بار بار یاد آ رہے تھے "اور جو ایمان لائے تھے وہ سب ایک جگہ رہتے تھے اور سب چیزوں میں شریک تھے۔ اور اپنی جائداد اور اسباب بیچ بیچ کر ہر ایک کی ضرورت کے موافق سب کو بانٹ دیا کرتے تھے اور ہر روز ایک دل ہو کر ہیکل میں جمع ہُوا کرتے اور گھروں میں روٹی توڑ کر خوشی اور سادہ دلی سے کھانا کھایا کرتے تھے اور خُدا کی حمد کرتے اور سب لوگوں کو عزیز تھے۔ اور جو نجات پاتے تھے اُن کو خُداوند ہر روز اُن میں ملا دیتا تھا۔"

مذکورہ ایماندار اس بات سے خوش تھے کہ وہ اُس کے نام کی خاطر بےعزت ہونے کے لائق تو ٹھہرے۔

اگلی صبح میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ مزدور جنہیں خاص شرائط پر ملازم رکھا جاتا تھا اُن کا نٹال میں کیا حشر ہو رہا تھا اور یہ سب کچھ حکومت کی نگرانی کے باوجود ہو رہا تھا۔ میں مہاتما گاندھی کے ساتھ چہل قدمی کر رہا

تھا کہ ہم نے ایک آدمی کو گنّے کے کھیتوں کے قریب چھپے ہوئے دیکھا۔ وہ ہمارے قریب آیا اور اُس نے ادب سے مہاتما جی کے پاؤں کو چھوا۔ پھر اُس نے اپنی پیٹھ پر زخم دکھائے۔ یہ زخم ابھی اچھے نہیں ہوئے تھے جو کوڑے مارنے کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے۔ وہ آدمی مفرور تھا اور پناہ کا محتاج تھا۔ جب ہم نے اُس آدمی کو دیکھا تو اُس وقت میں کسی قدر مہاتما جی کے پیچھے تھا۔ اب میں اُس کے زخموں کا معائنہ کرنے کی غرض سے آگے بڑھا۔ جب اُس نے دیکھا کہ میں یورپین ہوں تو وہ کانپ گیا کہ کہیں میں اُسے مارنا نہ شروع کر دوں۔ لہٰذا مجھے اُس مظلوم کو یقین دلانا پڑا کہ میں اُس کا دشمن نہیں بلکہ دوست ہوں۔ وہ خوف جو میں نے اس آدمی کے چہرے پر اُس وقت دیکھا جب اُس نے مجھے اپنی طرف آتے دیکھا کئی دنوں تک میرا پیچھا کرتا رہا۔ میرے دل میں اُس مظلوم کے لئے رحم کے جذبات پیدا ہو گئے۔

میں شب و روز اسی قسم کے نظارے دیکھا کرتا تھا۔ آخر کار انگلستان سے وہ بُری تار آ گیا جس کا مجھے کھٹکا لگا رہتا تھا۔ میری والدہ محترمہ فوت ہو گئیں۔ جب مجھے یہ خبر ملی تو میں اکیلا تھا لیکن ہندوستانی ماؤں کی ایک چھوٹی سی جماعت مسز گاندھی کے ساتھ مجھے تسلّی دینے کے لئے آئی۔ اے وفا شعار اور مشفق ہندوستانی ماؤ! تم بڑی حق گو اور بہادر ہو۔ تم نے میرے غم کے لمحات میں جس محبت کا اظہار کیا ہے میں اُسے کبھی بھلا نہیں سکتا۔

لہ غیر منقسم ہندوستان کی ماؤں کی طرف اشارہ ہے۔

سولھواں باب

مسیح اَور تسلیں

والدہ محترمہ کی وفات حسرت آیات کے بعد جب جنوبی افریقہ میں مصائب اَور غموں کی فراوانی ہُوئی تو ایسا معلُوم ہوتا تھا کہ ستیہ گرہ کی تحریک کو ازسرِ نَو شرُوع کرنا پڑے گا۔ انسانی دِلوں میں مسیح کی بادشاہت کے خیالات ہر روز میرے سامنے آیا کرتے تھے اَور خُداوند مسیح کے متعلّق میرا تصور پہلے کی نسبت زیادہ واضح ہو گیا۔ مَیں نے اپنے والدِ محترم کو لکھا کہ جُونہی جنُوبی افریقہ میں ہماری کشمکش ختم ہو گی مَیں انگلستان آ جاؤں گا۔ میرے اِس کام میں اُن کا دِل اَور رُوح میرے شاملِ حال تھے اَور رُوح میں جتنے ہم اب ایک دُوسرے کے قریب تھے اُتنے اس سے پیشتر سالوں میں کبھی نہیں ہُوئے تھے۔

جنوبی افریقہ میں دو چیزوں میں تناسب باطنی نظر آتا ہے۔ جب مَیں نے دیکھا کہ مہاتما گاندھی اَور اُن کے چیدہ چیدہ جنتی طور پر سچے مسیحیوں کی طرح صبرسے مصائب کو برداشت کرتے ہیں اَور بدی پر نیکی کے ذریعہ سے غالب آتے ہیں تو مَیں نے پہلے سے زیادہ مہاتما بُدھ کی رحم کی تعلیم کو جس کا اُنھوں نے ہندوستان میں پرچار کیا تھا مسیح میں عالم گیر محبت کے قانُون کے ساتھ ذکر کرنا شرُوع کیا۔ مَیں نے ایک ایسی ہم آہنگی دیکھی جو انسانی زندگی اَور انسانی تاریخ میں بہُت ہی

گر ہی چلی گئی تھی۔ مجھے متواتر یعقوب رسول کے خط کی یہ آیت یاد آتی رہی۔

"ہر اچھی بخشش اور ہر کامل انعام اُوپر سے ہے اور نوروں کے باپ کی طرف سے ملتا ہے جس میں نہ کوئی تبدیلی ہو سکتی ہے اور نہ گردش کے سبب سے اُس پر سایہ پڑتا ہے۔" (یعقوب ۱: ۱۷)

دوسری بات یہ تھی کہ میں جو مہاتما گاندھی اور اُن کے چیلوں کو سچے مسیحی سمجھتا تھا اور اس کے ساتھ ہی میں نے مسیحی کلیسیا میں ایسی باتیں دیکھیں جو اس کے بالکل برعکس تھیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے بے حد دکھ ہوا۔ خداوند مسیح کا اخلاقی معیار قول نہیں بلکہ عمل ہے اور اگر کلیسیا کی باتوں کو اسی معیار پر پرکھا جائے تو اس امر کا سوال ہی نہیں رہے گا کہ مسیح کس طرف ہے کیونکہ خداوند مسیح نے پُرزور الفاظ میں ایسے مذہب کی (خواہ وہ کتنا ہی قدیم اور مقدس کیوں نہ ہو) مذمت کی ہے، جو عمل کی بجائے محض باتوں پر انحصار کرتا ہے۔ وہ اسے ریاکاری کہتا ہے۔ یہی "فریسیوں کا خمیر" تھا۔

میں مہاتما گاندھی کے ساتھ پریٹوریا[1] میں جنرل سمٹس[2] سے ملاقات کرنے کا منتظر تھا۔ میں رات کے وقت جنوبی افریقہ کے وسیع و عریض آسمان کی وسعتوں پر، تاروں بھری پُراسرار اور پُرشکوہ فضا سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ موسم گرما کا نصف حصہ گزر چکا تھا اور ہم کھلے صحن میں سویا کرتے تھے۔ اکثر میں پَو پھٹنے سے پیشتر یعنی "صبح" جب کہ ابھی خاموشی ہوتی تھی، بیدار ہوتا اور کئی گھنٹوں تک خاموش بیٹھا رہتا۔ اُس وقت میں انسانی زندگی کے معنی اور اس سیارے پر اُس کی مختصر تاریخ پر غور کیا کرتا تھا۔ یہ زندگی اگرچہ

۱؎ PRETORIA ۲؎ GENERAL SMUTS.

ناچیز لیکن بے انتہا عظیم ہے۔ اس بے جان ویرانی سے شعور کا لمحہ اُبھرتا اور پھر اسی بے جان میں گم ہو جاتا تھا۔ تاہم یہ چیز بڑی اہم معلوم ہوتی تھی کہ زندگی کا ہر ایک لمحہ خدا کی خدمت میں صرف کیا جائے اور خدا وند مسیح میری رہنمائی اور نگہبانی فرمائے۔

جب میں عملی طور پر اس کشمکش کے انتہائی مشکل ایام میں مہاتما گاندھی کی اعانت کرنے میں مصروف تھا تو میں نیم شعوری طور پر اُن کی شخصیت کے روحانی معنوں کے متعلق سوچا کرتا تھا۔ اُن کی شخصیت سر تا پا "ہندو" تھی لیکن پھر بھی وہ اعلیٰ درجے کے "مسیحی" تھے۔ میں نے خطوط کا ایک سلسلہ لکھا اور میرے دوست مسٹر راماننداچیٹرجی نے اُنہیں ماڈرن ریویو کلکتہ میں شائع کیا۔ مہاتما گاندھی کی شخصیت خارجی مذہبی اختلافات کے علاوہ عقلی اتحاد کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اگر بنی نوع انسان کو روحانی طور سے واحد ہونا لازمی ہے تو مذکورہ اختلافی چیزوں کو مدّ نظر رکھنا ہوگا۔ اس کا مطلب براہِ راست تواریخی تعلق سے نہیں ہے بلکہ باطنی اور روحانی رشتہ ہے جو اپنے مخرج کے لحاظ سے اُس واحد عالم گیر باپ سے جا ملتا ہے جو اپنے تمام فرزندوں سے یکساں محبت کرتا ہے اور ہر ممکن طریقے سے اُن کی تلاش کرتا ہے تاکہ محبت کے ذریعہ سے اُنہیں اپنے اور ایک دوسرے کے ساتھ ملا دے۔

مجھے خدا کا اس قسم کا تصور اففاناسیس کے عقیدہ کے مقابلہ میں بدرجہا مسیح کے قریب معلوم ہوا۔ اففاناسیس کے عقیدہ میں لعنت بھی کی گئی

ے MODERN REVIEW CALCUTTA.

ہے اَور بُت پرستی کی ظلمتوں میں تعلیم دی جاتی ہے کہ ہندوستان اَور چین کے کروڑوں باشندے "بُت پرستی کی ظلمتوں میں ہلاک ہو رہے ہیں"۔ اس قسم کا محاورہ ابھی تک ہمارے گیتوں اَور وعظوں میں استعمال کیا جارہا ہے اَور اکثر اوقات اس خیال کا مفہوم یہ ہے کہ وُہ جو "نجات یافتہ" نہیں ہیں موت کے بعد دوزخ کے عذاب میں مُبتلا ہوں گے۔ مَیں مدّت سے اس قسم کے عقائد کو رد کر چکا ہُوں کیونکہ یہ عقائد خُداوند مسیح کی شان کے شایاں نہیں ہیں۔ مہاتما گاندھی اَور مَیں ایسے گھُل مِل گئے تھے کہ مَیں بڑی آزادی سے اُن کے ساتھ اس قسم کی باتیں کر لیا کرتا تھا اَور اُن سے اپنی اخلاقی کمزوری کے متعلّق صلاح و مشورہ بھی لیا کرتا تھا کہ مَیں پادری ہونے کی حیثیت سے گرجا میں اتھاناسیس عقیدہ پڑھنے پر مجبُور ہُوں۔ جب مَیں نے اُنہیں تمام حالات سے آگاہ کیا تو اُنہوں نے نہ تو مجھے مَوردِ الزام ٹھہرایا اَور نہ مُجھے یہ کہا کہ مَیں اس کے متعلّق کوئی فوری کارروائی کرُوں بلکہ یہ رائے دی کہ یقیناً وقت آئے گا جب مسیح کا خادم ہونے کی حیثیت سے میری مسیحی خدمت کا دائرہ زیادہ وسیع ہو جائے گا۔ مَیں نے اپنی واپسی پر لندن میں مسٹر گوکھلے سے بھی اس بات کا ذکر کیا۔ اُنہوں نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا۔ اس کے بعد مَیں بیان کرُوں گا کہ کس طرح شانتی نکیتن میں ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی بدولت مجھے آخرکار آزادی اَور سکُون حاصل ہُوا۔

اِن پُرانے واقعات زمانے کے دوران جب میرے دِل میں خیالات کا ہیجان بپا ہُوا تو مَیں نے انجیل میں از سرِ نو مسیح کی سادہ اَور غیر مبہم تعلیم

کا صاف دِلی سے مطالعہ کرنا شروع کیا۔ جب مجھے جنوبی افریقہ کے مسائل کا سامنا ہُوا تو میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب انجیل مقدس کی تعلیم سے مجھے نئی روشنی حاصل ہُوئی۔ میرے سامنے نسلی اَور مذہبی مغائرت کے سوالات تھے اَور گویا نسلی اَور مذہبی تعصبات مسیح کی توہین کرتے ہے تھے اَور اس امر کی ضرورت تھی کہ وہ بڑی شدّت سے اُن کی ملامت کرے۔ اب مجھے یہ بات سمجھ آئی کہ خُداوند مسیح نے کیوں جان بُوجھ کر پرہیزگار فریسی کو سمجھانے کی غرض سے مقہور سامری کی تمثیل بیان کی تھی۔۔۔ مجھے اس بات کی بھی سمجھ آگئی کہ جب اُس نے یہ کہا تھا کہ غیر اقوام اَور گنہگار اُن سے پہلے آسمان کی بادشاہت میں داخل ہوں گے تو فریسیوں کو کس قدر صدمہ ہُوا تھا۔

مَیں نے شروع میں نسلی امتیازات کی مخالفت کی تھی لیکن اُس کی نسبت اب اِن خیالات نے مجھے اس کے خلاف زیادہ مستحکم بنا دیا تھا۔ مجھ پر یہ بات واضح ہوگئی کہ مجھے اپنے ہم وطنوں اَور مسیحیوں کے خلاف جہاد کرنا چاہیئے کیونکہ مسیحی ہونے کی حیثیت سے خُداوند مسیح کی خاطر گواہی دینا میرا اوّلین فرض ہے۔ مسیحی ہونے کی حیثیت سے ہر چیز کا انحصار اسی ایک بات پر ہے اس کے برعکس اس کا دارومدار عالی نسبی، اعلیٰ تربیت، قابلیت یا کلیسا اَور سیکرامنٹ نہیں ہے۔ مجھے وُہی کام کرنا ہے جسے میری ضمیر کہے کہ یہ درست ہے اَور مجھے انسان سے ہرگز نہیں ڈرنا چاہیئے۔ خُدا کی مرضی کی بجا آوری ہی سب سے بڑا امتحان

ہے، یہاں تک کہ جب خُداوند مسیح کی اپنی ماں اور بھائیوں نے اُس سے بات کرنا چاہی تو اُس نے کہا:-

"کون ہے میری ماں اور کون ہیں میرے بھائی؟ اور اپنے شاگردوں کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔ دیکھو میری ماں اور میرے بھائی یہ ہیں کیونکہ جو کوئی میرے آسمانی باپ کی مرضی پر چلے وُہی میرا بھائی اور میری بہن اور ماں ہے۔" (متی ۱۲: ۴۸)

اس قِسم کا نسلی اور مذہبی تعصب ـــــ جنُوبی افریقہ میں میرے چاروں طرف موجُود تھا جو خُداوند مسیح کے پہلے شاگردوں میں پایا جاتا تھا لیکن خُداوند کے شاگردوں نے جبتی طور پر محسُوس کیا کہ مسیح میں رُوحِ الٰہی نے تنگ نظری کی دیواروں کو مسمار کر دیا ہے چنانچہ اُنہوں نے قدم بہ قدم اپنے مالک کی پیروی کی اور اپنی زندگیوں سے تمام تعصبات کو ایک ایک کر کے دُور کر دیا۔ خُدا کی مرضی کو پُورا کرنے کا یہی تو مطلب تھا۔ شاگردوں نے بڑے قریب سے خُداوند مسیح کو دیکھا تھا اور وُہ جانتے تھے کہ خُداوند مسیح کے دِل میں سامریوں کے لئے اور رُومی صُوبیدار اور سُورفنیکی عورت کے لئے کتنی محبت تھی۔ یہ لوگ خُدا کی رحمت اور اُس کے فضل سے دُور تھے۔ آخر شاگردوں نے یہ سیکھا کہ خُدا کا طریقہ اُن کے اپنے نسلی تعصب کے طریقوں سے بالکل مُختلف ہے کیونکہ اُن کی سوچ بیوقُوفی پر مبنی ہے اور چُونکہ یہ لوگ خاص قِسم کی مراعات سے محرُوم تھے اور دُوسرے لوگ اُنہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے اس لئے خُدا اُن لوگوں سے زیادہ محبت کرتا تھا۔

پس جب شاگردوں نے معلوم کر لیا کہ خُدا یہ چاہتا ہے کہ وُہ اُن لوگوں کو اپنا بھائی بلکہ بھائیوں سے بھی زیادہ سمجھیں جن کا معاشرتی طور پر مقاطعہ کیا گیا ہے، اور اُنہیں غیر قوم کہا جاتا ہے، تو شاگردوں نے خُدا کی تمجید کی اور دلیری حاصل کی۔ چنانچہ جہاں کہیں خُدا کا رُوح اُنہیں لے جاتا تھا وُہ وہاں جاتے تھے۔ وُہ خُود اپنے آپ کے لئے یہ خطرہ مول لینے کے لئے تیار تھے کہ ایسا کام کرنے کی وجہ سے لوگ اُن کا بھی معاشرتی مقاطعہ کریں گے۔

اس قسم کا سفر جو شاگردوں نے اختیار کیا، بڑا پُر خطر تھا۔ وُہ قدیم یہودی کلیسیا کی اُن حدود سے بہت دُور نکل گئے تھے جن کی رُو سے "یہودی" اور "غیر قوم" میں امتیاز پایا جاتا ہے۔ اُن کی پُرانی نسل اور مذہبی جمعیت ختم ہو گئی تھی لیکن جُوں جُوں وُہ آگے بڑھتے گئے اُنہوں نے دیکھا کہ ذاتِ الٰہی کا اخلاق نرالا ہے اور خُداوند مسیح کی تعلیم اُس سے بھی زیادہ خوبصورت ہے جو اُنہوں نے سمجھی ہے۔ اُنہیں معلوم ہُوا کہ "خُدا محبّت ہے" کی حقیقت کا کیا مطلب ہے؟ یہ آیت اس قسم کی نہیں ہے کہ اسے لکھ کر دیوار پر لٹکا دیا جائے بلکہ یہ ایک شاندار اور بے چین سی چیز ہے جس نے تمام انسانی معیاروں کو تہ و بالا کر دیا اور جو اکثر اوقات ایسے فیصلے کرتی ہے جو عجیب اور مُشکل ہوتے ہیں۔

ایک دو مرتبہ شاگردوں کو ناکامی کا بھی سامنا ہُوا اور وُہ آگے بڑھنے سے ڈرتے تھے۔ پطرس رسُول کا جذباتی پہلو، جس میں اخلاقی کمزوری کا عنصر

پایا جاتا تھا اُسے ساعتِ سفر کے وقت بے نقاب کر دیا اور اُس نے غیر قوم والوں کے ساتھ کھانے سے کنارہ کیا۔ اس پر مقدس پولُس رسُول نے رُوبرو ہو کر اُس کی مخالفت کی کیونکہ "وُہ ملامت کے لائق تھا" لیکن بحیثیت مجمُوعی یہ شاگرد بڑے دلیر تھے۔ اُن کے قدم آگے کو ہی بڑھے اور وُہ پیچھے نہیں ہٹے کیونکہ خُداوند مسیح اُن کے ساتھ تھا۔ وُہ اُن کے لئے رُوحانی ترقی کی نئی شاہراہیں کھول رہا تھا اور وُہ پُرانی نسلی عصبیت کی زنجیروں کو توڑ رہے تھے۔ وُہ وسیع تر انسانیت کے دائرے سے ہمکنار تھے۔ اس قسم کی باتیں اُن کے آبا و اجداد کی کلیسیا کے خواب و خیال میں بھی نہ تھیں۔

یہ احوال مسیحیوں کی اوّلین عظیم پیش قدمی کا اجمالی خاکہ ہے۔ شاید بنی نوعِ انسان کی تاریخ میں یہ ایک شاندار ترقی ہے۔ آج کی دُنیا جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں، مایوس کُن مصائب کے خلاف شاگردوں کی مسیح پر ایمان کے ساتھ حُریت اور رُوحانی آزادی کی خاطر کشمکش کی وجہ سے براہِ راست ظہُور میں آئی۔

جب مُجھے جنُوبی افریقہ میں اِن نسلی امتیاز رکھنے والی کلیسیاؤں کا سامنا کرنا پڑا تو مَیں نے یہ محسُوس کیا کہ مَیں اپنی زندگی میں پہلے شاگردوں کے حالات سے دوچار ہُوں۔ اب مُجھے اس مسئلے سے پیچھے نہیں ہٹنا چاہیئے بلکہ بڑی دلیری سے اس کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ پولُس کی طرح مُجھے بھی رُوبرو ہو کر اُن لوگوں کی مخالفت کرنی چاہیئے جو مسیحی کلیسیا میں نسلی عصبیت کو جاری رکھنے کے متمنّی ہیں۔
مُجھے یہ بھی تمام و کمال تسلیم کرنا چاہیئے کہ وُہ لوگ جو اپنے آپ کو

مسیحی نہیں کہتے اُن میں بھی خداوند مسیح کا رُوح موجود ہے۔ مجھے ایسے لوگوں کو سہارا دینا چاہیئے، اس کے برعکس وُہ لوگ جو نسلی امتیاز اور مذہبی عصبیت کو زندہ رکھ رہے ہیں مجھے اُن کی حمایت نہیں کرنا چاہیئے نیز میرے دِل میں ذات پات کی رُوح کا شائبہ تک نہیں ہونا چاہیئے۔ مجھے مکمل طور پر خدا کی طرف جُھکنا چاہیئے کیونکہ وُہ کسی آدمی کی طرفداری نہیں کرتا۔ جنُوبی افریقہ میں میرے علاوہ اَور بھی بہت سے مخلص مسیحیوں نے مہاتما گاندھی اَور مسز گاندھی کے ایثار کو دیکھا تو وُہ بھی پُورے تیقن سے کہتے تھے کہ "یہ نیک لوگ ہم سے بہتر مسیحی ہیں"۔ یہ الفاظ تو محض رسمی نہ تھے بلکہ اپنی سچائی کا برملا اعتراف تھا کیونکہ یہ ہندوستانی ستیہ گرہ کرنے والے اگرچہ ہندو اَور مسلمان ہی تھے مگر وُہ "اچھے مسیحی" تھے۔ نئے عہد نامہ کا مطالعہ اَور مسیحی ایمان کے متعلق کوئی نظریہ قائم کرتے وقت اس قسم کے حقائق کو بھی مدِنظر رکھنا چاہیئے۔

یہ دیکھنا بڑا آسان ہے کہ ان تمام باتوں نے میری اَور دُوسروں کی زندگیوں میں انقلابی نتائج پیدا کر دیئے ہیں۔ مجھے معمر تقدس مآب بشپ ویسٹ کاٹ آف ڈرہم کے وُہ الفاظ یاد ہیں جو اُنہوں نے سیر کرتے وقت اچانک ٹھہر کر رون ہِڈ رٹیے کے قریب مجھے کہے تھے۔ وُہ مجھے اپنے عصا پر دونوں ہاتھوں کو رکھ کر جُھکے اَور فرمانے لگے:۔

"خداوند مسیح کا ایک قسم کا انکار یہ ہے کہ اُسے انسانی زندگی کے کسی بھی طبقے میں شمار نہ کیا جائے جیسے کہ وُہ ابنِ آدم ہی نہیں"۔

تھوڑی دیر تک اُنھوں نے اپنی پُرشکوہ آنکھوں سے میری طرف دیکھا اُور اُن پر ایسی رقّت طاری ہُوئی کہ اُن کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ وُہ عموماً جذباتی تو نہ تھے لیکن یہ بات اُن کے دِل کی گہرائیوں سے نکلی تھی۔

مَیں نے اپنے ہائی چرچ کے خیالات میں کوئی شدید قسم کی تبدیلی نہ کی تھی۔ ابھی تک میری تبدیلی میں پُوری سچائی شامل نہ تھی کیونکہ مجھ پر سچائی رفتہ رفتہ ظاہر ہو رہی تھی اُور اس سچائی کی روشنی میں مجھے چلنا تھا۔ اس آدمی کی مذہبی زندگی کے متعلّق کوئی نظریہ قائم کرنا ناممکن ہے جو اُن ٹھوس حقائق کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے جن سے مجھے اب واسطہ پڑ رہا تھا۔ مَیں اُن لوگوں کے احساسات کو سراہتا تھا جو فضل کی ظاہری سیکرامنٹ کے بند میں بندھے رہنے کے آرزومند تھے کیونکہ اُن کے نزدیک سیکرامنٹ واضح، صریحی اُور حقیقی ہے۔

چُونکہ میرا اپنا دِل بھی اس طرف مائل رہا اس لئے مَیں "ہائی چرچ مین" بن گیا۔ لیکن ہر ایک شخص کو مذہب سے خارج کر دینے کا خوف دلا کر "ہائی چرچ مین" بننے پر مجبُور کرنا غلطی تھی۔

انجیلِ مقدّس میں ایک عورت کا ذِکر ہے جسے بارہ برس سے خُون جاری تھا۔ وُہ اپنے ہاتھوں سے خُداوند مسیح کی پوشاک کا صرف کنارہ ہی چھُو لینا چاہتی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ وُہ تندرُست ہو جائے گی۔ خُداوند یسُوع نے اُسے جھڑکا نہیں بلکہ اُسے اُس پر ترس آیا اُور اُس عورت کے ایمان نے اُسے شفا بخشی۔ اُس کا ایمان اس قسم کا تھا کہ وُہ خُداوند یسُوع کو چھُونا چاہتی

تھی۔ اُس کا ایمان ابھی اُس رُومی صُوبیدار جیسا نہیں ہُوا تھا جس نے کہا :۔
" اَے خُداوند! مَیں اس لائق نہیں کہ تُو میری چھت کے نیچے آئے بلکہ صرف زبان سے کہہ دے تو میرا خادم شفا پا جائے گا۔"

اُس صُوبیدار کا ایمان ہی تھا جس کی خُداوند یسُوع نے بے حد تعریف کی اَور کہا۔ "مَیں تم سے سچ کہتا ہُوں کہ مَیں نے اسرائیل میں بھی ایسا ایمان نہیں پایا۔"

اَور جب ہم کہتے ہیں کہ "اپنے دِل عالمِ بالا پر لگاؤ" تو اس میں یہی دعوت نہیں ہے کہ ہم رُوحانی آنکھوں سے آسمانی بلندیوں کو دیکھیں بلکہ ہم انسانی دِل میں رُوحِ الٰہی کی باطنی تحریک کو دیکھیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہر بشر کو بلا تمیز ملک، مذہب و ملّت کی تبلیغ کریں۔

مہاتما گاندھی اَور جنرل سمٹس کی ایک کہانی ایک بڑی خُوبصُورت کہانی ہے۔ مَیں دیگر واقعات کا تذکرہ کرنے سے پیشتر یہی کہانی بیان کرنا چاہتا ہُوں۔

مسز گاندھی نے دیگر تمام ہندوستانی خواتین کی نسبت جیل میں زیادہ مصیبتیں برداشت کیں۔ جب مَیں نٹال میں آیا تو مَیں نے اُن سے ملنے کی کوشش کی لیکن وُہ اتنی بیمار تھیں کہ وُہ مجھ سے نہ مل سکیں۔ ہم جتنا عرصہ پریٹوریا میں رہے مسز گاندھی کی صحت کے متعلق ہمارے دِل میں بہُت تشویش رہی۔ لیکن جب بات چیت کے خُوشگوار نتائج برآمد ہو گئے تو اُنہیں بھی دیگر قیدیوں کے ساتھ رہا کر دیا گیا۔ لیکن اُن کی صحت خراب ہو چکی تھی اَور وُہ ہر روز کمزور ہوتی جا رہی تھیں۔

ابھی تک ہم ہر پیشور یا چھوڑنے کے قابل نہیں ہوئے تھے کیونکہ ابھی تک کئی متنازعہ فیہ مسائل کا فیصلہ نہیں کیا گیا تھا اور کسی بحران کا خطرہ تھا۔ بالآخر تمام شرائط طے ہوئیں۔ سمجھوتہ ہو گیا اور اس پر جنرل سمٹس کے دستخط ثبت ہونے باقی تھے۔ ہمیں مطلع کر دیا گیا تھا کہ اُن کے دستخطوں میں ابھی کئی دن لگیں گے۔ کیونکہ صنعت و حرفت کی اشتراکی انجمن نے ہڑتال کر رکھی تھی اور جنرل موصوف اس طرف مصروف تھے۔ اس وقت مہاتما گاندھی کو ایک تار موصول ہوا کہ اُن کی دھرم پتنی قریب المرگ ہے۔ میں نے اُنہیں مجبور کیا کہ وہ فوراً روانہ ہو جائیں اور میں جنرل موصوف کے دستخط خود کروا لوں گا لیکن اُنہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ کہنے لگے کہ ذاتی کام کی وجہ سے پبلک کے کام میں کوتاہی نہیں ہونی چاہیئے۔ وہ چٹان کی طرح ثابت قدم تھے اور میں اُن کا ارادہ بدلنے میں ناکامیاب رہا۔ تاہم میں نے اُن کے دُکھ کا اندازہ لگا لیا۔

میں اُس رات نہ سو سکا۔ آدھی رات کے تھوڑی دیر بعد مجھے اچانک خیال آیا کہ کیوں نہ میں صبح سویرے یونین بلڈنگ میں جا کر جنرل سمٹس کے دستخط کروا لاؤں۔ اس خیال سے مجھے کسی قدر تسلی ہوئی اور میں سو گیا۔

صبح سویرے میں چھ بجے سے کچھ بعد یونین بلڈنگ میں پہنچا۔ اگرچہ جنرل سمٹس ہڑتال کو بند کرانے میں لگے رہتے تھے تاہم وہ ہر روز صبح سویرے مُلک میں اِدھر اُدھر گشت لگایا کرتے تھے۔ وہ سات بجے واپس لوٹے۔ اور جب میں نے اُنہیں یہ خبر سُنائی تو اُنہیں بے حد صدمہ ہوا۔ اُن میں انسانیت بیدار ہوئی اور اُنہوں نے معاہدے کے کاغذات منگوائے اُنہیں بغور

مطالعہ کیا اور مجھ سے پوچھا کہ کیا اس میں ہر ایک چیز شامل کر لی گئی ہے۔ جب
میں نے اثبات میں جواب دیا تو انہوں نے اس پر دستخط ثبت کر دیئے میں خوشی
خوشی وہ معاہدہ مسٹر گاندھی کے پاس آیا۔ ہم اسی صبح ڈربن پہنچے اور
ریل میں سوار ہوئے۔ ہمیں یہ تسلی بخش خبر ملی کہ اب مسز گاندھی کی حالت پہلے
سے بہتر ہے۔

میں نے جنوبی افریقہ کی ان برائیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے متعلق
یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ باتیں کافی پرانی ہیں۔ سن ۱۹۳۲ء تک اس واقعہ کو تقریباً
بیس سال گزر چکے ہیں۔ اس وقت سے آج تک جنوبی افریقہ کی کلیسیا نے
شاندار بیداری کا تجربہ حاصل کیا ہے۔ یورپین ولندیزی اور انگریز مرد اور عورتیں
گروہ در گروہ خداوند مسیح کے نقش قدم پر چلنے میں کوشاں ہیں۔ بہت سی جماعتوں
میں خداوند مسیح کے شاگردوں کی خوشی لوٹ آئی ہے۔ آکسفورڈ گروپ موومنٹ[1]
نے بہت سی روحوں میں از سر نو زندگی کی روح پھونک دی ہے۔ سٹیلن بوش[2]
یونیورسٹی اور ڈچ ریفارمڈ[3] مذہبی جماعت میں روح کی نئی تحریک شروع ہے۔ اس
سے یہ امید پیدا ہو گئی ہے کہ نسلی عصبیت اور قومی برتری کی برائی کا
بالآخر خاتمہ ہو گیا ہے اور زندہ خداوند مسیح کی روح نے ایک دفعہ پھر
[illegible] مردہ قوموں کے دلوں اور روحوں کو زندہ کر کے انہیں اپنی
قربت سے برکت دی ہے۔

جنوبی افریقہ میں ہندوستانی معاہدہ کے خاتمہ کے بعد میں انگلستان میں
مسٹر گاندھی کو ملنے کے لئے گیا۔ وہ لندن میں بیمار تھے۔ میں نے اپنے والد محترم

---

۱ OXFORD GROUP MOVEMENT ۲ STELLEN EOSCH
۳ DUTCH REFORMED CHURCH.

مینار روشنی تھا۔ ہندوستانی لٹریچر اور فلسفیانہ خیالات میں سب سے بلند اور شاندار اُن کی تصویر ہے۔ اُن کا اخلاق بھی اُن کی تحریرات کی طرح بلند تھا ابھی تک مجھے اُن سے شرفِ ملاقات کی سعادت نصیب نہیں ہوئی تھی کیونکہ کلکتہ دہلی سے ایک ہزار میل کے فاصلہ پر ہے لیکن وِنی ہیرین نے مجھے اُن کے متعلق بہت کچھ بتا رکھا تھا۔ وُہ بنگال میں مقیم تھے اور بڑی محبت اور عقیدت سے اُن کا ذکر کیا کرتے تھے۔ آخرکار میری اُن سے ملاقات ہوئی۔ مجھے اس ملاقات کا بے حد اشتیاق تھا لیکن میں اُن سے ہندوستان میں نہیں بلکہ لندن میں ملا تھا۔

۱۹۱۲ء کی دھیمی گرما کی شام تھی۔ روتھین سٹین نے مجھے اپنے گھر دعوت دے رکھی تھی۔ اُن کا گھر ہیمپسٹیڈ کے قریب تھا۔ اُس زمانہ میں رابندرناتھ ٹیگور لندن میں تھے اور انگلستان کے مشہور شاعر ڈبلیو۔ بی۔ ییٹس اُن کی کتاب گیتانجلی سے چند نظمیں پڑھنے کو تھے۔ اُس رات جب میں نے رابندرناتھ ٹیگور کی نظموں کو سنا اور اُن سے ملاقات کی تو مجھے ہندوستان کی عظیم عالمگیر ثقافت کی انتہائی نفاست اور حسن کا علم ہُوا۔ وُہ لندن میں ابھی اجنبی تھے اور اُن کی صحت خراب تھی۔ جب اُن کی نظمیں پڑھی جا رہی تھیں تو وُہ انکسارِ نفس نہ ہونے اور تھکے ہونے کی وجہ سے چُپکے چُپکے بیٹھے رہے۔ جب میں اُن سے ملنے کے لئے اُن کے پاس پہنچا تو میرے دل میں کچھ کہنے کو کوئی بات نہ تھی۔ اصلی طور پر اُنہیں میرے دل کی کیفیت کا حال معلوم ہو گیا تھا۔ میں نے اُن کی نظموں کی داد نہ دی اور نہ ہی رسمی طور پر اُن کا شکریہ

ادا کی۔ میں کئی گھنٹوں تک اپنے خیالات میں محو بیٹھے بیٹھے میں پھرتا رہا
جو کچھ میں نے سنا تھا اُس کے متعلق یہ سوچتا رہا کہ اُن کا میری زندگی
کے ساتھ کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ وُہ رات بڑی بصیرت افروز اور روشنی
بخشنے والی رات تھی۔

آرام کرنے سے پیشتر میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اگر شری رابندرا ناتھ
ٹیگور مجھے اجازت دیں تو میں اُن کے شانتی نکیتن کے آشرم میں آجاؤں،
اور وہاں رہ کر ہندوستان کے متعلق زیادہ معلومات حاصل کروں کیونکہ دہلی
میں غیر ملکی مشن سٹیشن پر ایسی باتیں نہیں سیکھی جا سکتیں۔ مجھے یہ سن کر بڑی خوشی
ہوئی کہ شری رابندرا ناتھ ٹیگور [illegible] سے میرے عزیز دوست ولی پیرسن
نے بھی یہی ارادہ کر لیا لیکن مجھے ابھی آزادی نہ تھی [illegible] اس تجویز کو عملی جامہ
پہنانا ممکن نہیں تھا لیکن جب تک میں جنوبی افریقہ میں رہا میرے دل میں یہ اُمید
رہی کہ مستقبل میں مجھے یہ خوشی نصیب ہوگی۔ میری مشکل کے وقت یہ خیالات
میری ہمت بندھائے رہتے۔

میں ہندوستان کے باطنی حسنِ اخلاق سے براہِ راست روشناس ہونا چاہتا
تھا۔ میں اسے دیکھ کر اپنی گرفت میں لے سکتا تھا۔ بعض اوقات میں [illegible] پر اپنے
ملاقاتیوں کے چہروں میں اس حسنِ اخلاق کی جھلک دیکھتا تھا لیکن میں اسے دہلی
میں اچھی طرح سے نہیں سمجھ سکتا تھا۔ [illegible] تعلیم کے کنٹرول پر حکومت کی
تنگ نظری کے خلاف میرے دل میں ہمیشہ بغاوت رہی۔ میرے دل میں غیر ملکی
مشن کے کام کے خلاف بھی بغاوت تھی کیونکہ اب میں "غیر ملکی" کہلانے کا خواہشمند

اعتراف کیا اور کہا کہ آئندہ میں سچائی پر عمل پیرا ہوں گا۔ شروع شروع میں انہیں
اس بات سے قدرے دکھ ہوا اور انہوں نے مجھے کہا کہ میں جلد بازی سے
کام لوں لیکن میں نے جھوٹ کی اس عمودی چٹان کا کنارا دیکھ لیا تھا جس پر میں
کھڑا تھا۔ حقیقت میں یہ کوئی جلد بازی کا قدم نہ تھا بلکہ ایک ایسی اخلاقی
کشمکش کا خاتمہ تھا جو کئی برسوں سے چلی آ رہی تھی۔ لیکن یہ کشمکش اب تک
ختم ہو چکی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اب مجھے کیا کرنا پڑے گا۔

اس دن میں نے دو خط لکھے تھے جو مجھے [illegible] معلوم ہوتے تھے۔ پہلا خط
مقدس لاٹ بشپ صاحب کی خدمت میں لکھا اور انہیں بتایا کہ میں
آئندہ اتوار کی عبادت کرانے سے قاصر ہوں۔ دوسرا خط میں نے اپنے
والد محترم کو لکھا تھا۔ مجھے [illegible] تھا کہ [illegible]
والدین کو یہ [illegible] چونکہ ان کا دل کمزور ہے اس لئے انہیں بڑا ہی
صدمہ ہوگا۔ میں نے ان کو [illegible] اپنے خط کے جواب کے متعلق
بڑا ہی فکرمند تھا۔ میرے والد محترم خداوند مسیح کی "آمد ثانی" کے خیالات میں
اتنے مگن رہتے تھے کہ انہیں میرے متعلق کوئی تشویش نہ تھی جب میں یورپ
میں ان کے پاس سے آیا تھا تو انہیں اس امر کا پورا پورا یقین تھا کہ میں ہر بات
میں خداوند کے سپرد ہوں۔ اس دن سے میں نے کسی لاٹ بشپ کے ماتحت
باقاعدہ خادم الدین کی خدمت سرانجام نہیں دی کیونکہ میں نے یہ محسوس کیا
کہ دعائے عام کی کتاب کو ماننے کا جو عہد میں نے کیا ہے وہ اب ٹھیک نہیں رہا۔
لیکن میں جہاں کہیں دور دراز ممالک میں گیا ہوں، میں ہمیشہ انگلیکن طریقے

پر عشاءِ ربانی میں شریک ہوتا رہا ہوں۔ جب کبھی مجھے مسیحی رفاقت کے تقاضوں
نے مجبور کیا ہے۔ میں نے اکثر اوقات وعظ اور عشاءِ ربانی ادا کرنے کی دعوت
کو قبول کیا ہے۔ میں نے بلا امتیاز دوسرے فرقوں کے مسیحیوں کے لئے بھی
عشاءِ ربانی کی رسم ادا کی ہے۔ اُس دن سے لے کر آج تک میرے دل میں یہ
خیال جاگزیں رہا ہے کہ صحیح ربانی کی خدمت جس کیلئے میں موزوں تھا پادری
کی بجائے الہامی تھی۔ میں بے سر و پا ادھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرا ہوں۔ اب وہ
مجھے دوبارہ صراطِ مستقیم پر لے آیا ہے۔

اس سے پیشتر کہ میں یہ آخری قدم اٹھاتا مجھے ایمان کے دوسرے ارکان
سے بھی بڑی کوفت ہوتی۔ مگر یہاں اُن کا بیان ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ چوں
دس سال گزر چکے ہیں میرے دل میں [illegible]
سکون ہے۔ میرے دل میں اپنے پچھلے عہدے پر جانے کی کوئی تمنا نہیں
ہے۔ اگر میں آزاد نہ ہوتا تو جس قسم کی زندگی مجھے بسر کرنا پڑتی اور جو تجربے
کرنے کے لئے کہا جاتا میں کبھی نہ کر پاتا۔

گیان دھیان میں صرف کیا۔ وہ اپنے سب سے چھوٹے بیٹے رابندر ناتھ
سے بے حد چاہتے تھے جو ایک مشہور شاعر اور مصنف ہوئے۔ اُن کی خواہش
تھی کہ رابندر ناتھ انہیں وہ بھجن گا کر سنایا کریں جو انہوں نے واحد برہم
کے ساتھ مل کر لکھے تھے۔ موخر الذکر اُن کی جوانی کے دنوں میں استاد
تھے۔ اُنہوں نے ہی دیویندر ناتھ کو کٹر ہندو مت سے برہمو سماج کے عالمگیر
مذہب کی طرف راغب کیا تھا۔ مہارشی کے بیٹے رابندر ناتھ ٹیگور کو یہ
عالمگیر مذہبی تعلیم ورثہ میں ملی تھی۔

میں ایک حیرت انگیز سچی کہانی بیان کرتا ہوں کہ کس طرح چوروں کا
ایک سردار چپکے سے ایک شام اُن کے پاس آیا جبکہ وہ گیان دھیان
میں بیٹھے تھے۔ اُس نے یہ سُن رکھا تھا کہ اُن دونوں درختوں کے نیچے
سونا دفن ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ بوڑھا آدمی اُس جگہ بیٹھا رہتا ہے۔
جب وہ ڈاکوؤں کا سردار اپنے ہاتھ میں خنجر لے کر قریب آیا۔ اُس کے
دل میں اُنہیں قتل کرنے کا ارادہ تھا۔ لیکن جب اُس وقت مہارشی نے اپنی
آنکھیں کھولیں اور اُس ڈاکو کی طرف ایسی پُراطمینان نظروں سے دیکھا
کہ اُس نے اپنے ہاتھ سے خنجر پھینک دیا اور اُن کے چرنوں میں
گر پڑا۔ اُس نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا۔ مہارشی جو رحمدل تھے
اُٹھے اور اُنہوں نے اُس ڈاکو کو گلے سے لگا لیا۔ اس طرح وہ اُن کا
چیلا بن گیا اور اب وہ ایک تبدیل شدہ انسان تھا۔ یہ شخص تادم
زیست خدا کی خدمت میں مشغول رہا۔

میرے آنے سے تھوڑی دیر پیشتر مہارشی بڑے رنجیدہ ہو کر سورگ باشی ہو گئے۔ اُن کی یاد اس آشرم کے رنگ ڈھنگ میں موجود ہے۔ اُن دو گھنے درختوں کے نیچے اُن کی گدّی کے قریب جہاں وُہ گیان دھیان میں مگن رہا کرتے تھے اُن کی یادگاری میں اُن کی محبوب عبارت کندہ ہے۔ وُہ عبارت یُوں ہے:۔

"وُہ میرے من کی شانتی ہے
وُہ میرے دِل کی خُوشی ہے
وُہ میری رُوح کا اطمینان ہے"

اس کتبہ میں خدا کو ہی شانتی، خُوشی اَور اطمینان کہا گیا ہے۔ وہ لوگ جنہیں مہارشی کے درشنوں کی سعادت نصیب ہوئی۔ بیان کرتے ہیں کہ اُن کا چہرہ اُن کے نفس کا آئینہ دار تھا۔ کئی لوگوں نے مجھے بتایا ہے کہ ضعیف العمری کے ایّام میں اُن کے سب سے چھوٹے بیٹے رابندرا ناتھ ٹیگور کی شکل وصورت بھی ہو بہو اُن جیسی ہو گئی ہے۔ اس مقدس مقام کی چار دیواری پر تین قوانین لکھے ہوئے ہیں:۔

پہلا:۔ پوجنے کے لئے کسی بُت کو نصب نہیں کیا جائے گا۔
دُوسرا:۔ اس کے احاطہ میں کسی انسان یا حیوان کی جان نہیں لی جائے گی۔
تیسرا:۔ کسی قسم کی مذہبی بحث نہیں کی جائے گی۔ اس آشرم میں یہ تین پابندیاں ہیں۔ تمام مذہب وملّت کے مردوں اور عورتوں کو اس آشرم میں آنے کی دعوت عام ہے۔

ہفتہ میں ایک دن شری رابندر ناتھ ٹیگور آشرم میں رہنے والے تمام بچوں کو خدا کی ابوّیت کے متعلق بڑا ہی سادہ سا درس دیتے ہیں۔ وہ ہر صبح اور ہر شام گیان دھیان کے لئے بیٹھتے ہیں۔ جب تک یہ چیزیں... ہوتے رہتے ہیں اُن کی سادہ مذہبی زندگی بڑی دلچسپ ہے۔

شانتی نکیتن کی اس پُرسکون فضا میں مجھے اچانک یورپ میں جنگِ عظیم اوّل چھڑ جانے کی دہشت ناک خبر ملی اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گویا بھونچال آگیا ہے اور اُس نے میرے خوابوں کے محلات کو چکنا چور کر دیا ہے۔ مجھے یہ دن آخری عدالت کے دن کی طرح معلوم ہوتا تھا جس کے متعلق خداوند مسیح نے خود پیشین گوئی کی تھی کہ وہ ابنِ آدم کے آنے کا دن ہوگا۔

میرے والد محترم کے لئے جو انگلستان میں تھے، یہ چیز تمام الہامی اُمیدوں کا پورا ہونا تھا۔ ان کی عمر اب اسّی برس سے اُوپر تھی اور وہ بے حد نحیف و نزار ہو چکے تھے۔ سب سے بڑی رقت انگیز بات یہ تھی (میری ہمشیرگان مجھے خطوں میں لکھا کرتی تھیں) کہ وہ گھر میں ہر ایک چیز کو اُسی قرینے سے رکھنے کی کوشش کیا کرتے تھے جیسے والدہ محترمہ کا شیوہ تھا۔ اُن کا یہ پختہ ایمان تھا کہ خداوند مسیح کی آمد نزدیک بلکہ دروازے پر ہے۔ وہ اس کے متعلق مجھے بڑی لمبی لمبی چٹھیاں لکھا کرتے تھے۔ بعض اوقات وہ چٹھی کی بجائے نظم بھیج دیا کرتے تھے۔ ان کی آخری نظمیں میرے پاس ہیں۔ جنگ ختم ہونے سے پیشتر ہی وہ راہیِ ملکِ عدم ہو گئے۔

بھڑکائی جارہی ہے اس سے میں قدرے محتاط ہو گیا۔

میری آنکھوں کے چھلکے گر پڑے۔ میں نے بڑی سنجیدگی اور خوف سے نئے عہد نامہ کا مطالعہ شروع کیا۔ میں بنظر عمیق سے خداوند کے الفاظ کو پڑھنا چاہتا تھا۔ خداوند مسیح میرا حامی اور رہنما تھا۔ مجھے صاف صاف نظر آنے لگا کہ دونوں آمرانہ کے درمیان کوئی مصالحت نہیں ہو سکتی یعنی ہم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ اس موضوع پر خداوند مسیح کا بیان بالکل واضح اور صاف تھا۔ خداوند نے اپنی زبان معجز بیان سے ارشاد فرمایا ہے:۔

"اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لئے دعا کرو تاکہ تم اپنے باپ کے جو آسمان پر ہے بیٹے ٹھہرو۔"

اس معاملہ میں خدا کی اخلاقی قوت خطرے میں تھی۔ مجھے یا تو پرانے عہد نامہ میں خدا کے متعلق قبولی خیالات کو چھوڑنا تھا یا نئے عہد نامہ میں سے خدا کے متعلق خداوند مسیح کے خیالات کو قبول کرنا تھا۔ آخر کار مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ جنگ کا حامی ہو کر میں نے خداوند مسیح سے بے وفائی کی ہے۔ اب خداوند مسیح نے اپنے دست شفا سے پاک صاف کر دیا تھا اور میں دوبارہ راہ راست پر آ گیا تھا۔

اس موقع پر شری رابندر ناتھ ٹیگور نے بہت پیار سے میری امداد فرمائی۔ میں کئی وجوہ سے ان کی تعظیم و احترام کرتا تھا۔ میرے دل میں ہر روز ان کی محبت بڑھتی جاتی تھی۔ وہ صاحب دانش میری مشکلات کو سمجھنے کے قابل تھے اور میں جب موقع ملتا ان سے اپنی مشکلات کا ذکر کیا کرتا تھا۔ اگرچہ وہ پیدائشی ہندو تھے اور مسیحی نہیں تھے پھر بھی انہوں نے بائبل و غیرہ کا مطالعہ کر رکھا تھا۔

مجھ سے پوچھا کرتے تھے: "تم مسیحی کیا کر رہے ہو؟ تمہارے پاس واضح اخلاقی قوانین موجود ہیں۔ تم اُن پر عمل کیوں نہیں کرتے؟"

ایک دور جانب سے مجھے یوں امداد ملی۔ میں جنوبی افریقہ میں مہاتما گاندھی کے ساتھ تھا جبکہ میں نے اُن کی بہادری و عدم تشدد کی عملی تفسیر دیکھی۔ اُنہوں نے ہم مسیحیوں کو بڑی شرم دلائی۔ اُن کے نمونے نے مجھے سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ وہ جس چیز کو ستیہ گرہ یا حق کی قوت کہا کرتے تھے دراصل مسیحی چیز تھی لیکن جنگ کی وحشیانہ بربریت اس کے بالکل برعکس تھی۔

مجھے مندرجہ بالا تینوں مؤثر قوتیں ایک ہی نقطے کی طرف مائل نظر آتی تھیں۔ اب مجھے کوئی شک نہیں تھا کہ خداوند مسیح جنگ کو بُرا جانتا تھا۔ اس لئے جب مجھے فوجی خدمت کی پیش کش کی گئی تو میں مصمم ارادہ کر چکا تھا کہ میں یہ خدمت ہرگز قبول نہیں کروں گا۔ آخر کار جب یہ معاملہ میرے سامنے آیا تو میں نے بلا تامل انکار کر دیا۔ یہ سچ ہے کہ مجھے قید کی سزا نہیں بھگتنی پڑی تاہم میں اس کے لئے بھی تیار تھا۔ اس فیصلہ کے بعد اس معاملہ میں مجھے ایسا مکمل اطمینان حاصل ہوا اور مجھے کبھی افسوس نہیں ہوا کہ میں نے ایسا فیصلہ کیوں کیا۔

اس رُوحانی اور ذہنی کشمکش کے دوران خداوند مسیح ایک نئے انداز سے جس کا تصور کرنا محال ہے میرے قریب تر ہوتا چلا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ روزمرہ کی زندگی میں مجھے قوت اور توانائی بخش رہا ہے۔ میں دو اہم فیصلے کر چکا تھا۔

اوّل:- میں نے دُعائے عام کی کتاب میں درج شدہ اعتقاداتِ مسیحی عقیدہ

میں "رسم عید یعنی گنہگاروں پر خُدا کے غضب اور انتقام کے اظہار" کو ماننے سے انکار کیا۔

دوم - مَیں فوج میں بھرتی نہ ہوا۔ مجھے جو خوشی اور اطمینان اس وقت حاصل ہوا وہ اس زمانہ کی خوشی و اطمینان سے زیادہ تھا جب مَیں سنڈرلینڈ اور لندن مشن میں تھا۔

سوشیل ڈیموکرٹ کا بیٹا شودھیر میرے پاس ٹھہرنے کے لئے آیا۔ اس کے بعد وہ ایمبولینس کے کام میں بھرتی ہو کر فرانس چلا گیا۔ اُس نے ایک دن مجھ سے کہا:- "حضور! مجھے سمجھ نہیں آتی کہ آپ پاک عشاء کے بغیر شانتی نکیتن میں کس طرح زندگی بسر کر رہے ہیں"۔

مَیں نے جواب دیا۔ "میرے بچے جنہیں مَیں تعلیم دے رہا ہُوں اب میری "پاک عشاء" ہیں" اور اس کے بعد مَیں نے انجیل مقدس میں سے وہ حوالہ پیش کیا جو خُداوند مسیح نے سب سے چھوٹوں کی خدمت کرنے کے متعلق کہا تھا یعنی یہ کہ اُس کے نام کی خاطر دوسروں کو "پانی کا ٹھنڈا پیالہ" دینے والا بھی اپنا اجر نہ کھوئے گا۔

شودھیر ہمیشہ میری باتوں کو یاد رکھتا تھا۔ جب وہ فرانس سے واپس آیا اور ہم دونوں اُن کے والدِ محترم کے پاس تھے جب وہ آخری مرتبہ بیمار ہوئے تو شودھیر نے مجھ سے کہا "آپ نے جو باتیں میرے ساتھ اس صبح کیں اُن سے مجھے فرانس میں بہت فائدہ ہُوا۔ ہسپتال میں بیمار سپاہیوں کی تیمارداری کرتے وقت مَیں کہا کرتا تھا"۔ "یہ میری پاک عشاء ہے" اس وقت

مجھے یاد آیا کرتا تھا کہ خُداوند مسیح نے فرمایا تھا "مَیں بیمار تھا تم نے میری خبر لی" مجھے معلوم ہُوا کہ یہ باتیں برحق ہیں۔

نئے عہدنامہ میں سے خُداوند مسیح کی وُہ تعلیم جس نے مجھے بہت زیادہ فیض پہنچایا ہے یہ بھی ہے جس نے مجھے قوّت، اطمینان اور خوشی عطا فرمائی ہے۔ اس لئے اس کتاب میں اس کا بار بار ذکر آئے گا کیونکہ خُداوند مسیح نہ صرف میرے لئے عظیم اور اعلیٰ معیار ہے جس کا ذکر قدیم نوشتوں میں آیا ہے بلکہ وُہ میرے لئے ایک زندہ شخصیت ہے، جس کے ساتھ میری دلی رفاقت اور شراکت ہے اور جنگ کا وُہ زمانہ جس وقت میں اخلاقی اُلجھنوں میں مُبتلا تھا اور جس کا مَیں ذکر کر چُکا ہُوں، مَیں نے خُداوند مسیح کی آخرکار آواز سُنی۔ اُس کی آواز صاحب اختیار کی آواز تھی۔ بعض اوقات مَیں خاموشی کے عالم میں اُس کی آواز صاف صاف سُنا کرتا تھا اور وُہ مجھے کہا کرتا تھا کہ مَیں کشادہ راستہ اختیار نہ کرُوں جو ہلاکت کو پہنچاتا ہے۔ مجھے اُن کی یہ آواز سُنائی دیتی تھی:۔ "اگر کوئی میرے پیچھے آنا چاہے تو اپنی خودی کا انکار کرے اور اپنی صلیب آپ اُٹھائے اور میرے پیچھے ہولے"۔

اس وقت میرے دِل میں ایک نیا خیال جاگزیں ہُوا۔ جنگ شروع ہونے سے پیشتر مَیں نے دیکھا کہ افریقہ میں افریقی لوگوں کے ساتھ نسلی امتیاز روا رکھا جاتا تھا۔ مَیں نے نٹال میں شکر تیار کرنے والے ہندوستانی مزدوروں کی حالت کا جائزہ لیا۔ مجھے پختہ یقین ہُوا کہ بنی نوع انسان پر اس قسم کے دُکھوں کی وجہ سے مسیح ابن آدم بھی دُکھ اُٹھا رہا ہے۔ مجھ پر یہ بات بھی واضح ہو گئی تھی کہ یورپ میں جنگ چھڑنے کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کی ناجائز نفرت کی

اور وسیع پیمانے پر تجارتی رقابت کی بُرائیاں موجود ہیں ۔ مگر دہ اقوام بڑی مصیبت اُٹھا رہی ہیں ۔ خداوند مسیح ان محکوم لوگوں کے ساتھ ہے ۔ وہ اُن پر ترس کھاتا ہے اور اُن سے کہتا ہے :۔

"اے محنت اُٹھانے والو اور بوجھ سے لدے ہُوئے لوگو سب میرے پاس آؤ ، مَیں تم کو آرام دُوں گا "

یہ خیالات میرے دِل میں اس شدّت سے موجود تھے کہ مَیں نے شری رابندر ناتھ ٹیگور سے اُن کا ذکر کیا ۔ وہ بھی میرے ساتھ متفق تھے ۔ اُن میں نسلی عصبیّت موجود نہ تھی ۔ وہ سائنسی ایجادات کی وجہ سے مغرب کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے لیکن وہ اس وجہ سے بڑے زور و شور سے مغرب کی مذمت کرتے تھے کیونکہ اُس میں نسلی برتری کا تکبّر ہے اور اُس نے تجارتی حرص و آز کی بدولت بڑی شان حاصل کر لی ہے ۔ اُنہوں نے فرمایا کہ "ب موت کی تلخ فصل پک کر تیار ہے "

جب مَیں نے یہ اُمّید ظاہر کی کہ ممکن ہے کہ یہ جنگ بدی کے استیصال کا باعث بن جائے تو اُنہوں نے ایسی دردبھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا جو مَیں بھُلا نہیں سکتا ۔ اُنہوں نے فرمایا "چارلی ! اے کاش میری تمنا تمہاری خاطر ایسا ہی ہو لیکن جب تک بدی کی جڑ یعنی لالچ کو نہ کاٹ ڈالا جائے ممکن ہے کہ جنگ کے بعد پھر اقتصادی نقصانات کو پُورا کرنے کی تگ و دو شروع ہو جائے اور اس طرح کمزوروں کو ناجائز طور پر تنگ کیا جائے ۔ لالچ کا مرض اندرونی مرض ہے ۔ اس کا علاج ہونا چاہیئے ۔ ظاہری علامات کے علاج سے کچھ فائدہ نہیں ہے ؟

خداوند مسیح کے یہ الفاظ "اے محنت اُٹھانے والو اور بوجھ سے لدے ہوئے لوگو، سب میرے پاس آؤ میں تم کو آرام دوں گا۔" مجھے بار بار یاد آیا کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ میں یہ سمجھا کہ مجھے ایک بہت بڑی جنگ میں شامل ہونے کا حکم ملا ہے اور یہ جنگ اُس جنگ سے کہیں زیادہ خوفناک ہے جو یورپ کی خندقوں میں لڑی جا رہی ہے۔ خداوند مسیح کی اپنی ایک جنگ ہے جسے دُنیا کے غریب اور پسماندہ لوگوں کی خاطر لڑنا چاہیئے اور اس جنگ میں لڑنے کی خاطر خداوند مسیح مجھے بھرتی کرنا چاہتا ہے۔ عام لام بندی اور فوجی خدمت کرنے کے خلاف منفی رویّہ اختیار کر لینا ہی کافی نہیں ہے۔ مجھے ایک مثبت فرض ادا کرنا ہے اور ایک وسیع میدان میں ایمان کی جنگ لڑنا ہے۔

لیکن اس مقام تک پہنچنے اور اس پر کاربند رہنے کا عہد کرنا اتنی آسان بات نہ تھی جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے۔ میرے چاروں طرف جنگ جاری تھی اور یہ جنگ مجھے اُبھار رہی تھی۔ مشرق و مغرب میں لڑائی کے مختلف محاذوں پر کبھی ایک فریق کو فتح ہوتی تھی اور کبھی دُوسرے کو۔ جنگ کا پانسہ ہر روز پلٹتا رہتا تھا۔ فتح اور شکست کی خبریں آیا کرتی تھیں اور میں اپنے ذمے کوئی مثبت کام نہیں لے سکتا تھا جس سے اس تذبذب کی کیفیت سے میرے دل کو چین نصیب ہوتا۔ جب میں دُنیا میں دُوسری نسلوں اور قوموں کے سلوک کے متعلق سوچا کرتا تھا تو میرے دل میں ہمیشہ یہ اُمید رہتی تھی کہ اس ضمن میں میرے اپنے وطن کا کردار بڑا اعلیٰ ہے اور وُہ عام قاعدے سے مستثنیٰ ہے۔ میری سرشت میں میرے والدِ محترم کا شاندار ایمان تھا مگر اس کے

باوجود کہ میں دنیا میں بہت کچھ دیکھ چکا تھا اور یہ ایمان نیم شعوری طور پر مجھے متاثر کرتا رہتا تھا۔

میرے والد محترم اس زمانے میں پیدا ہوئے تھے جب غلامی کو منسوخ کیا گیا تھا اور ریفارم[1] ایکٹ پاس کیا گیا تھا۔ انہیں آزادی سے بے پناہ محبت تھی اور انہیں یہ مضبوط نسانی روایات ورثے میں ملی تھیں۔ چونکہ ہمارا ایسٹ اینگلیکن[2] خاندان سے تعلق تھا اس لئے یہ باتیں ہماری فطرت میں بھی تھیں۔ انیسویں صدی کے آغاز میں چند ایسے عناصر تھے جو اس قسم کی روح سے مشابہت رکھتے تھے۔ تاریخ برطانیہ میں یہ زمانہ بڑا اعظیم تھا۔ اس میں برطانیہ میں بڑی بابہ ناز ہستیاں ہوئیں مثلاً کلارک سن، دلبر فورس، لونگ شون، شیفٹسبری فلارنس نائٹنگیل، جوزفین بٹلر وغیرہ وغیرہ۔ ان بایہ ناز ہستیوں نے خدمتِ خلق کے کام میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔

لیکن اٹھارھویں صدی کے اوائل میں بڑی نازک تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ اس زمانہ میں یورپی اقوام افریقہ کے حصّے بخرے کرنے کی فکر میں تھیں۔ وہ نئے ملک پر دندانِ آز تیز کئے ہوئے تھے۔ اس تبدیلی کے ساتھ ہی رنگ و نسل کی تمیز نے شدت اختیار کر لی تھی اور نسلی عصبیت کا زہر ساری دنیا میں پھیلتا چلا جا رہا تھا۔ یہ چیز مسیح کی تعلیم کے خلاف تھی۔ "سفید فام" انسان نے دوسری نسلوں سے اپنے آپ کو علیحدہ اور برتر سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ اس سے عوام میں غصّے اور نفرت کی لہر دوڑ گئی۔ چونکہ میں اپنے وطن سے دور ایک غیر ملک میں تھا، میں نے ایسا محسوس کیا جو میرے والدِ محترم محسوس نہیں

---

[1] REFORM ACT [2] EAST ANGLICAN

نہیں کر سکتے تھے کہ گرم ممالک میں اس نسلی امتیاز کے کیسے بُرے نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ مجھے معلوم تھا کہ خداوند مسیح روزانہ میرے ساتھ ہے، مَیں نسلی امتیاز اور لالچ کی مذمت کرنے میں سب سے پیش پیش تھا کیونکہ میری سرشت میں بھی ان بُرائیوں کے بیج موجود تھے۔

لیکن مَیں نے ان تمام خیالات اور سوالات کو، جو میرے دل میں اکثر پیدا ہو جایا کرتے تھے، اچانک خیرباد کہہ دیا۔ مئی ۱۹۱۵ء میں آشرم میں چھٹیاں ہوئیں اور تمام بچے اور اُستاد اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ مَیں چند ہمدردی کا عذرات کے لئے کلکتہ سے شانتی نکیتن آیا ہوا تھا۔ اچانک پانچ بجے شام کے قریب مَیں بیمار ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ہیضہ کی بیماری نے مجھ پر بڑا زبردست حملہ کیا ہے۔ اس جگہ کوئی مستند ڈاکٹر نہیں تھا اور اگلی صبح تک کسی ڈاکٹر کے ملنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ وہ رات بڑے دُکھ اور درد کی رات تھی لیکن مجھے خداوند مسیح کے دُکھ یاد آتے رہے اور خداوند میرے شاملِ حال رہا۔

اگلی صبح شری رابندرا ناتھ ٹیگور کلکتہ سے میری بیماری کا حال سُن کر تشریف لے آئے۔ اُنہیں دیکھ کر مجھے ایک نئی قسم کی زندگی نصیب ہوئی۔ اُس وقت تک مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ میرے دل میں اُن کے لئے کتنی محبت ہے لیکن مَیں اس سے پیشتر بھی خلوصِ دل سے اُن کی تعظیم کیا کرتا تھا۔ ہیضہ ایک خوفناک متعدی مرض ہے اور شری رابندرا ناتھ ٹیگور اور دیگر لوگ جو میری تیمارداری کیا کرتے تھے، جانتے تھے کہ اُنہیں ہر وقت اس مرض کے لگنے کا خطرہ ہے۔

اُنھوں نے میرے لئے اپنی جان کو خطرے میں ڈالا تھا۔ اُن کے پیار اور محبت نے ہی میری جان بچائی۔

بڑی دیر کے بعد میں کلکتہ کے نرسنگ ہوم میں جانے کے قابل ہو گیا۔ اس کے بعد مجھے شملہ نرسنگ ہوم میں لے جایا گیا۔ میں وہاں برآمدے میں سارا دن دھوپ میں پڑا رہتا تھا مگر لکھنے پڑھنے کے قابل نہیں تھا۔ ایک دن میرے ہاتھ پارلیمنٹ کی رپورٹ لگی۔ اُس میں اُن ہندوستانیوں کا ذکر تھا جو نٹال میں محنت مزدوری کیا کرتے تھے۔ میرے لئے یہ رپورٹ بڑی دلچسپی کا باعث تھی کیونکہ میں نٹال میں بہت کچھ دیکھ چکا تھا۔ جب میں نے اس رپورٹ کی ورق گردانی کی تو مجھے معلوم ہوا کہ جزیرہ فجی میں محنت مزدوری کرنے والے ہندوستانی لوگ بہت زیادہ خودکشی کرتے ہیں اور خودکشی کے اعداد و شمار خوفناک ہیں۔

جزائر فجی بحر الکاہل جنوبی میں واقع ہیں اور رپورٹ سے ظاہر تھا کہ چونکہ اس جگہ حالات بڑے مخرب الاخلاق ہیں اور مزدور اپنے دیس میں واپس جانے کے آرزومند رہتے ہیں اس لئے ہندوستان کے کاشتکاروں کے درمیان اس جگہ خودکشی کی وارداتیں بہت زیادہ ہیں۔

جزائر فجی کے ان اعداد و شمار کا مقابلہ نٹال اور دیگر مقامات کے ساتھ کیا گیا تھا جہاں کسی خاص شرط کے ماتحت کام کرنے والے ہندوستانی مزدور بھیجے گئے تھے۔ اس میں جو اختلاف تھا وہ چونکا دینے والا تھا۔ نٹال میں مزدوروں پر جو مظالم ڈھائے جاتے تھے اُنھیں میں نے اپنی آنکھوں سے

دیکھا تھا۔ اس لئے میں فجی میں ہندوستانی مزدوروں کی تکلیف کا اندازہ لگانے کی اہلیت رکھتا تھا۔ میں نے کتاب کو بند کر دیا کیونکہ مجھ میں اسے پڑھنے کی طاقت نہ تھی لیکن جو کچھ میں نے اس کتاب میں دیکھا اس کا خیال میرے دل پر مسلّط ہو گیا تھا۔

اس کے تھوڑے عرصے کے بعد میں ایک دوپہر کو برآمدے میں کاؤچ پر لیٹا ہوا تھا۔ میری نگاہوں کے سامنے نٹال میں کام کرنے والے اُس ہندوستانی مزدور کی تصویر اُبھری جس کی پیٹھ ضربوں سے زخمی تھی اور وہ مجھے دیکھ کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اب وہ میری طرف رحم طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جب میں نے اُس کی طرف غم بھرے دل سے دیکھا تو اُس کا چہرہ تبدیل ہو گیا اور میں نے اُس مزدور کی جگہ خداوند یسوع کا چہرہ دیکھا جو "اچھا چرواہا" ہے۔ میں اُسے اپنے بچپن سے جانتا تھا اور پیار کرتا تھا۔ میرے لئے وہ شکل اتنی واضح اور صاف تھی کہ میں صمیم دل سے اس کی تعظیم اور پرستش کرنے لگا۔ ابھی میں اسی حالت میں لیٹا ہوا تھا کہ وہ شکل غائب ہو گئی۔ اس کے بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ بیداری کا خواب ہے جسے میرے تصوّرات نے تخلیق کیا ہے اور میرے تحتِ شعور نے میری آنکھوں کے سامنے اس کی شکل پیدا کر دی ہے۔

ایک طرح سے مجھ پر یہ تاثر ہوا کہ گویا یہ خداوند مسیح کی اپنی ہی رویت تھی۔ ہم رویتِ داخلی اور رویتِ خارجی کی اصطلاحات استعمال کرنے پر مجبور ہیں لیکن اِن دونوں کے درمیان جو حدِّ فاصل ہے وہ بے حد باریک

ہے، یہاں تک کہ وہ آناً فاناً معدوم ہو جاتی ہے۔

یہ بات اظہر من الشمس تھی کہ خداوند مسیح مجھے فجی میں جانے کے لئے بلا رہا تھا اور اُس کی بُلاہٹ پر لبیک کہنا میرا فرض تھا۔ مجھے ایسا نظر آنے لگا کہ مجھے یہ کام بلا چون وچرا کرنا چاہیئے۔ اس لئے میں فجی میں جانے کے لئے بہترین راستہ تیار کرنے لگا۔ میں یہ بھی سوچنے لگا کہ وہاں پہنچنے میں مجھے کتنی دیر لگے گی۔ آہستہ آہستہ ان خیالات نے مجھ پر قبضہ جما لیا اور میری طاقت عود کر آئی کیونکہ میرے سامنے ایک نئی اُمید اور نیا مقصد تھا۔ جب میں تندرست اور توانا ہو گیا تو شری رابندر ناتھ ٹیگور نے بڑی خوشی سے مجھے آشرم سے رُخصت ہونے کی اجازت دے دی۔ یہ سُن کر میرا دِل باغ باغ ہو گیا کہ دِلی پیرسن بھی میرے ساتھ جانے کے لئے تیار ہے۔ شاعرِ اعظم خلوصِ دِل سے ہمارے اس سفر میں ہمارے ساتھ تھے۔ اُنہوں نے بڑی محبت سے اشیرباد کہہ کر ہمیں ہندوستان سے روانہ کیا۔

جب ہم جزائر فجی میں پہنچے تو ہمیں معلوم ہُوا کہ حالات پارلیمنٹ[1] کی رپورٹ سے بھی بدتر تھے۔ علاوہ بریں خاص شرائط کے ماتحت کام کرنے والی ہندوستانی مزدور عورتوں کی حالت بے حد قابلِ رحم تھی۔ اس جگہ بھی اسی قسم کی اخلاقی بُرائیاں موجود تھیں جن کی وجہ سے نٹال بیں "قلیوں کی بستی" بدنام تھی لیکن فجی میں اخلاقی بُرائیاں اس سے بھی زیادہ گہری ہو چکی تھیں۔ ہندوستانی مرد اور عورتیں ہزاروں کی تعداد میں دُنیا کے مختلف حصّوں میں کام کرنے کی غرض سے جایا کرتے تھے جو

---

[1] BLUE BOOK.

ایک دُوسرے سے بہت ہی دُور تھے مثلاً فجی، ماریشس، نٹال اور برٹش گی آنا۔ ہر سال چونکہ پیشہ ور بھرتی کرنے والے لوگ ہندوستان سے بے شمار مزدوروں کو بھرتی کیا کرتے تھے، اس لئے وقت آچکا تھا کہ بھرتی کرنے کا سارا سسٹم ختم کر دیا جاتا۔

اگرچہ مختلف ممالک کے کاشتکار، جن کے کھیتوں میں ہندوستانی مزدور کام کرتے تھے اس نقطۂ نگاہ کو سمجھنے سے قاصر تھے تاہم حکومتِ ہند نے ہندوستان کی رائے عامہ کا احترام کیا اور مہاتما گاندھی نے پنڈت مدن موہن مالویہ کے ساتھ مل کر اس سسٹم کی منسوخی کو اہم سیاسی مسئلہ بنا دیا۔ ہندوستانی خواتین نے دُور افتادہ مقامات میں رہنے والی بہنوں کی مشکلات کا اندازہ کرکے اُن کی حمایت میں اپنی آواز بلند کی۔ اس وقت لارڈ ہارڈنگ[۱] ہندوستان کے وائسرائے تھے۔ ہم نے اُن کے سامنے دیگر ممالک میں مزدوری کرنے والے ہندوستانیوں کی رپورٹ پیش کی۔ اُنہوں نے اس رپورٹ میں جمع شدہ تمام اعداد وشمار اور واقعات کو صحیح اور مبنی بر حقیقت سمجھ کر قبول کیا۔ اس سے حالات نے یکسر پلٹا کھایا اور ایک ریفارم ایکٹ[۲] پاس ہوا جس کا نام اقرار نامے پر "مزدوری کرنے کی منسوخی"[۳] تھا۔ یہ ایکٹ ہماری اس رپورٹ کے فوراً ہی بعد پاس ہوا جو فجی سے ہماری واپسی پر شائع ہوئی تھی۔ وہ حقائق جو ہم نے خوفناک اخلاقی گراوٹ کے متعلق ان نوآبادیوں سے فراہم کئے تھے۔ اتنے معقول تھے کہ وائسرائے ہند کو اس ایکٹ کے آخری مراحل سُرعت سے طے کرنے کے متعلق فیصلہ کرنا

۱۔ LORD HARDING ۲۔ REFORM ACT.
۳۔ ABOLITION OF INDENTURE.

سے منظوری حاصل کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی لیکن وزارت مستعمرات کی درخواست پر اس میں ایک ترمیم شامل کی گئی جس سے ہمیں بہت کچھ شبہ بھی ہُوا، کیونکہ ترمیم یہ تھی کہ "ضروری انتظامات کرنے کے لئے کچھ مدت درکار ہے۔"

اس منسوخی ایکٹ کے پاس ہونے پر بڑی خوشی کا اظہار کیا گیا اور اس خوشی میں اس شق کی طرف غور نہیں کیا گیا، لیکن اس کا اثر ایسا خطرناک ہُوا کہ ایک سال کے بعد یہ سارا مسئلہ از سرِ نو اُٹھانا پڑا کیونکہ ہم پر یہ راز کھُل گیا کہ لندن میں اس بات کا وعدہ کیا جا چکا ہے کہ جب تک ضروری انتظامات کئے جا رہے ہیں، اس عبوری عرصہ میں پانچ سال تک مزدور بھرتی کئے جائیں اور پھر کوئی اور "سسٹم" اختیار کیا جائے جس سے مزدوری کرنے کا طریقہ دوبارہ جاری ہو جائے اور اس کا کوئی اور نام ہوگا۔ اب اس کی حمایت نہیں کی جا سکتی تھی، کیونکہ برائی کو علانیہ طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا۔ لہٰذا ہم نے جدوجہد کو پھر جاری کیا۔

جب میں جزیرہ فجی کی طرف اپنے پہلے سفر کو یاد کرتا ہوں تو میں بےحد خوش ہو کر خدا کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اس سفر میں میری رہنمائی فرمائی تھی اور مجھے بہت بڑا تجربہ حاصل ہوا تھا۔ اسی واحد شاندار کارنامے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ممالک جہاں خداوند مسیح کی روح نے مردوں اور عورتوں کی زندگیوں کو متاثر کیا ہے وہاں بھی ایمان کی گواہی کے وسیلے اس قسم کے شاندار کارنامے رونما ہوئے ہیں۔

فجی میں ایک نیک دل میتھوڈسٹ مشنری تھے۔ ان کا نام مسٹر لیلین[1] تھا۔ وہ خلوصِ دل سے فجی کے لوگوں سے محبت کیا کرتے تھے۔ اُنہوں نے مجھے کہا کہ میں پاک عشاء کی ادائیگی میں اُن کی اعانت کروں۔ فجی کے چند نوجوان مسیحی عشاء ربانی لینے والے تھے۔ وہ اس کے کچھ عرصہ بعد دیگر جزائر مثلاً سالومن اور نیو ہیبرائیڈز[2] کو جانے کو تھے۔ ان مقامات کے باشندے ابھی تک بڑے ہی وحشی تھے۔ ہم خداوند مسیح کے شاگردوں کی طرح اکٹھے ہوئے اور رفاقت رکھنے اور "روٹی توڑنے" میں شریک ہوئے۔ ہم نے فجی راگ میں ایک گیت گایا۔ یہ گیت فجی کے ایک مسیحی نے لکھا تھا جو اس وقت عبادت میں شریک تھا۔ مجھے صرف ٹیپ کا بند یاد رہ گیا ہے جو یوں ہے:۔

بتاؤ کیا سمندر پار سے آواز آتی ہے
قیادت کا ہمارے واسطے پیغام لاتی ہے
وہ کہتی ہے اُتر کر پار تم اس دیس میں آؤ
مسیح کے نام کی خاطر ذرا امداد فرماؤ

جب فجی کی یہ جماعت گیت گا رہی تھی تو وہ محبت کے نازک ترین جذبات کی عکاسی کر رہی تھی کیونکہ اُنہیں یاد تھا کہ کئی لوگ جو سالومن اور دیگر جزائر میں پہنچے تھے اُنہوں نے خداوند مسیح کے نام کی خاطر اپنی جانیں قربان کر دی تھیں۔ جب مجھے یہ بتایا گیا کہ بہت سے لوگ جو آج عشاء ربانی میں شریک ہیں اُن لوگوں کے بیٹے بیٹیاں ہیں جو آدم خوری کی بدمستیوں میں گرفتار تھے تو مجھے بڑا تعجب ہوا۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ جزیرہ فجی میں

---

[1] LELEAN
[2] NEW HEBRIDGE.

مسیحیت کی بشارت شروع کی گئی تھی اور وہاں کے لوگوں نے خُداوند مسیح کو قبول کیا تھا۔ فجی کے چند نوجوان "پار اُتر کر" اُس جگہ جانے کے لئے تیار تھے جہاں سے آواز اُنہیں بُلا رہی تھی۔ اس جگہ کے باشندے ابھی تک مردم خور وحشی تھے۔ ممکن تھا کہ اُن میں سے چند لوٹ کر واپس نہ آ سکتے، چنانچہ عشاءِ ربانی کے اختتام پر مَیں نے ایک ترجمان کی معرفت فجی کے لوگوں کو بتایا کہ فجی کے لوگوں کو مَیں خُداوند مسیح میں پیار کرتا ہُوں۔ اُنہوں نے آگے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کیا۔

مَیں نے اپنی زندگی میں اس قسم کے کئی موقعوں پر دیکھا ہے کہ کس طرح فرقہ پرستی کے قوانین جو انسانوں نے بنا رکھے ہیں، خُداوند مسیح کی محبت سے ٹوٹ جاتے ہیں۔ اگر یہ کہا جاتا ہے کہ انگلیکن اور دُوسرے مسیحی فرقوں کے مابین جو تفریق پائی جاتی ہے وہ پاک ہے اور خُدا کی طرف سے مخصوص شدہ ہے (جب مَیں ہائی چرچ سے تعلق رکھتا تھا تو میرا بھی یہی عقیدہ تھا)، تو اس کا جواب یہ ہے کہ خُداوند مسیح کے اپنے زمانہ میں سبت بھی پاک اور مخصوص شدہ تھا لیکن جب خُدا کی محبت درمیان میں آئی تو خُداوند مسیح نے بڑی سُرعت سے اِن پابندیوں کو دُور کر دیا۔ اُس نے مسیحی آزادی کا فرمان ان الفاظ میں جاری فرمایا:۔

"سبت آدمی کے لئے بنا ہے نہ آدمی سبت کے لئے۔"

ایک انگریز بشپ کا قول ہے:۔ "محبت تمام ہدایاتِ عبادت کی کتابوں سے بلند ہے۔" اور ایسا کہنے میں وہ خُداوند مسیح کے قول

کو بطور مذہب پیش کر رہا تھا۔

میں پورے دِل سے اس بات پر زور دیتا ہُوں کہ خُدا کی محبت کے متعلق ہمارے خیالات میں وُسعت ہونی چاہیئے۔ اگر خُداوند مسیح کے یہ الفاظ سچے ہیں اور خدا حقیقت میں "ہمارا باپ" ہے اور ہم رنگ یا نسل یا مذہب و ملّت کے اختلاف کے باوجُود، درحقیقت ایک دُوسرے کے بھائی ہیں اور ایک ہی باپ کے بیٹے، بیٹیاں ہیں۔ ایسی صُورت میں یہ کام کرنا نہ صرف ممکن ہوگا بلکہ مسیحی ہونے کی حیثیت سے ہمارا فرض ہوگا کہ ہم ایک دُوسرے سے میل ملاپ رکھیں اور ہمارے میل ملاپ میں خُدا کی محبّت کی وُسعت ہونی چاہیئے۔ ہم محض اس طریق سے اُس آزادی کو محسُوس کر سکتے ہیں جس سے خُداوند مسیح نے ہمیں روشناس کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں اس بات کا مشاہدہ ہوگا کہ کئی لوگ جو مسیح کے نام سے تو نہیں کہلاتے لیکن اُن کا مزاج مسیح یسُوع کا سا ہے، وُہ اُس کی محبّت کے حُکم کو بجالاتے ہیں، اُن میں سے بہت سے عدالت کے دِن اوّل ہو جائیں گے جبکہ وُہ جو اُس کے نام سے کہلاتے ہیں اور اپنے آپ کو مسیحی کہتے ہیں، لیکن اُس کے حُکموں پر عمل نہیں کرتے، رد کئے جائیں گے۔

اس باب میں اس جدوجہد کی کہانی کے خاتمے کو بیان کرنا بڑا مُفید ہوگا کہ کس طرح اقرارنامے کے ذریعہ ہندوستانی مزدوروں سے کام لینے کا سسٹم مکمل طور پر منسُوخ کر دیا گیا تھا۔ جب یہ بات صاف نظر آ رہی تھی کہ پُرانے سسٹم کی قباحتیں کسی نئے نام کے ماتحت از سرِ نو شروع

ہو جائیں گی تو ہندوستان کے مقتدر رہنماؤں نے مجھے کہا تھا کہ میں ایک دفعہ پھر فجی میں جا کر حالات کا مطالعہ کر کے ایسی ایسی شہادتیں بہم پہنچاؤں تاکہ اُس لعنت کو دوبارہ شروع کرنے میں جن حامیوں کا سہارا لیا جا رہا ہے، وُہ نہ رہیں، کیونکہ اُنہوں نے ناقابلِ بیان اخلاقی نقصان پہنچایا ہے اور ہندوستان اور برطانیہ کلاں کے درمیان نفرت کی فضا پیدا کر دی ہے۔

اس دفعہ مجھے تن تنہا ہی اس سفر پر جانا پڑا۔ میں بحرالکاہل جنوبی کے علاقہ میں تقریباً ایک سال تک رہا۔ میری صحت خراب تھی۔ اس علاقہ کے لوگوں نے میرے خلاف اپنی دُشمنی کا اظہار کیا۔ اس سے پیشتر جب میں اور دِلّی پیرسن یہاں آئے تھے تو ہمارے ساتھ ایسا سلوک نہیں ہوا تھا۔ میں بڑا مضمحل اور اُداس رہا کرتا تھا۔ یہ رُوحانی تنہائی کا زمانہ تھا۔ اس مرتبہ مجھے پہلے سفر جیسی خُوشی نصیب نہ تھی لیکن اس سفر کے نتائج پہلے سفر سے کہیں زیادہ تھے کیونکہ وُہ شہادتیں جو میں فراہم کر کے لایا تھا اتنی زیادہ تھیں کہ عملی طور پر کسی صفائی کی ضرورت نہ تھی۔

اس دُوسرے سفر کی سب سے زیادہ خُوشی اس بات میں ہے کہ آسٹریلیا کی خواتین نے بڑے شاندار طریقے سے فجی میں کام کرنے والی ہندوستانی عورتوں کی حمایت میں آواز اُٹھائی۔ میں آسٹریلیا کے بڑے بڑے شہروں میں جاتا تھا اور خواتین کی انجمنوں کو بتاتا تھا کہ اقرار نامے کے ذریعے غریب ہندوستانی عورتوں سے کام لینے کا سسٹم کتنا بُرا ہے۔ ان عورتوں کو دھوکا فریب دے کر بھرتی کیا جاتا ہے اور یہ عورتیں ان نوآبادیات

میں بڑی مصیبت میں پھنسی رہتی ہیں۔ اُنہیں بداخلاقی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور اس کا نتیجہ قتل اور خودکشی ہوتا ہے۔ اس طرح خوبصورت خاندانی زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔

جب میں نے آسٹریلیا کی خواتین کو اس قسم کے حالات سے آگاہ کیا تو اُنہیں اس بات پر یقین نہیں آتا تھا اس لئے اُنہوں نے مس گارنہام[۱] کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا تاکہ وہ بہ نفسِ نفیس حقائق کا مطالعہ کریں۔ مس گارنہام نے یہ رپورٹ دی کہ حالات میرے بیان سے بھی زیادہ خوفناک ہیں اس لئے آسٹریلیا کی خواتین نے فوری اقدام کیا اور اس بات پر زور دیا کہ اس قسم کے کام کے لئے کوئی بھرتی نہ کی جائے۔ آسٹریلیا کی تھیوسوفیکل[۲] سوسائٹی کی دو معزز خواتین مس پریسٹ[۳] اور مس ڈکسن[۴] بھی روانہ ہوئیں تاکہ وہ وہاں رہ کر ہندوستانی عورتوں کی امداد فرمائیں۔ اُنہوں نے وہاں بڑا شاندار کام کیا۔ ہندوستان میں مسز جے۔ جی پیٹٹ[۵] کی سرکردگی میں خواتین کا ایک وفد وائسرائے سے ملا اور اُس سے یہ وعدہ لیا کہ وہ اس سسٹم کو منسوخ کرانے میں ہر ممکن کوشش کریں گے۔

آخرکار یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو اس سسٹم کو منسوخ کر دیا گیا۔ اس کے ماتحت کام کرنے والے تمام مردوں اور عورتوں کو آزاد کر دیا گیا۔ نوآبادیات کی تاریخ میں اس دن کو "روزِ منسوخی"[۶] کہا جاتا ہے۔ یہ دن ہندوستان میں بڑی خوشی سے منایا جاتا ہے۔

۱۔ MISS GARNHAM ۲۔ THEOSOPHICAL SOCIETY ۳۔ MISS PRIEST
۴۔ MISS DIXON ۵۔ MRS. JAJEE PETIT ۶۔ ABOLITION DAY.

ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ لندن میں میری ملاقات اُن لوگوں سے ہوئی
جو فجی سے آئے ہیں۔ مجھے جو کچھ انہوں نے بتایا ہے اُس سے میرا
یقین پختہ ہو گیا ہے کہ اب وہاں صرف مادی خوشحالی کے اعتبار سے بلکہ اخلاقی
اور تعلیمی طور پر بھی بڑی ترقی ہوئی ہے۔ اب آزادی مل جانے کے بعد وہاں پرانی
سماجی قباحتیں اور "قلی لائنز" کی گھناؤنی فضا بالکل ختم ہو گئی ہے اور اس کی جگہ
اب وہاں ایک صحت مند خاندانی زندگی نشو و نما پا رہی ہے۔

جب میں فجی میں دوسری مرتبہ گیا تو اس سفر میں شاعرِ ہند رابندرناتھ ٹیگور
کی محبت اور نیک نیتی میرے شاملِ حال تھی۔ تنہائی کے لمحات اور بے حد
عداوت کے دوران شانتی نکیتن کی پُرسکون اور پُرامن فضا کی یاد میرے لئے
راحت کا پیغام بن جاتی تھی۔ یہاں شاعرِ اعظم صبح پو پھٹنے سے پیشتر گیان دھیان
میں محو بیٹھے رہتے تھے۔ اُن کے خطوط مجھ میں نئی رُوح پھونک دیتے تھے
میرے لئے وُہ یومِ سعید ہوتا تھا جب اُن کا نامۂ محبت ڈاک کے ذریعہ
میرے لئے خوشی و انبساط کا پیغام لاتا تھا۔ خدا نے مجھے دُنیا میں محبت
کی بیش قیمت نعمت ودیعت فرمائی ہے لیکن الٰہی محبت اس سے بھی ارفع
و اعلیٰ ہے۔ یہ محبت مجھے اس دائمی اور ابدی سچائی سے آگاہ کرتی ہے
جو ساری دُنیا کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔ یہ وُہی عجیب سی سچائی ہے جسے
ستیم، شیوم، ادویتم کہا جاتا ہے اور شاعرِ اعظم شری رابندرناتھ ٹیگور نے
اپنی تحریرات میں ہمیشہ اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے
لئے ازلی سچائی خداوند مسیح میں مجسم ہو گئی ہے۔

ہ SATYAM ر SIVAM د ADVAITAM

اٹھارہواں باب

چین اور جاپان

سنہ ۱۹۱۶ء میں شری رابندرناتھ ٹیگور، مجھے اور ... پیرسن کو اپنے ساتھ جاپان لے گئے۔ میں بڑے پُر اشتیاق عقائد سے اس سفر کا انتظار کرنے لگا۔ میرے دل میں چین اور جاپان دیکھنے کی بڑی آرزو تھی کیونکہ قدیم زمانے سے انسانی تہذیب و تمدن اس خطہ میں ترقی کے شاندار مدارج طے کر چکی ہے۔ اِن ممالک کے اپنے رسم و رواج اور اصول ہیں۔ ان کا مطالعہ مغربیا کے اُن لوگوں کے لئے بہت ضروری ہے جو بنی نوعِ انسان کی تاریخ جاننا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ ہندوستان اور جاپان میں کوئی تعلق بھی معلوم ہو جائے گا کیونکہ جاپان کے ایک ادیب اوکاکورا نے مجھے بتایا تھا کہ صدیوں سے چین اور جاپان بدھ مت سے متاثر ہوتے چلے آئے ہیں۔ یہ مذہب بالواسطہ مشرقِ بعید تک پھیل گیا ہے لیکن اس کے سوتے ہندوستان ہی میں پھوٹتے تھے۔

اِن ایام میں میں مشرقی دنیا کی بدھ تہذیب اور مغربی ممالک کی مسیحی تہذیب کے مطالعہ میں مستغرق رہا ہوں، اس سے اس امر کا سراغ ملتا ہے

کہ بنی نوعِ انسان میں ارفع مذہب کے لئے منفری وحدت لی جاتی ہے جو ہر انسانی تاریخ کے عقلی نظریے کی اساس ہے۔ اس سلسلہ میں جب سے جنوبی افریقہ میں میری ملاقات مہاتما گاندھی سے ہوئی ہیں بُدھ مت کے اہنسا کے اصول اور مسیحیت کے محبت کے اصول میں مماثلت معلوم کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اگر مماثلت کے حقائق کو عملی طور پر واضح کیا جا سکے تو انسانی اتحاد و یگانگت کی ہیکل کے کونے کے سرے کا ایک نیا پتھر رکھا جا سکتا ہے جس پر آئندہ نسلیں ایک عمارت اُستوار کر سکتی ہیں۔ میں نے جاپانیوں کی من حیث القوم شجاعت اور من حیث الجنس عظیم اخلاقی جرأت کے متعلق بہت کچھ سُن رکھا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ہندوستان کے اس عظیم الشان شاعر کا شاندار استقبال کریں گے کیونکہ اُنہوں نے بڑے تپاک سے اُنہیں اپنے وطن میں مدعو کیا تھا۔ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ وہ اُن کے ساتھ بڑی مروّت سے پیش آئیں گے اور اُن کی آمد افہام و تفہیم کا باعث ہو گی۔
آخر کار اس کے بعد جب میں نے مشرق بعید کا سفر کیا تو مجھے معلوم ہو گیا کہ جو کچھ میں نے بیان کیا ہے وہ بالکل صحیح تھا لیکن شاعرِ اعظم نے مشرق بعید میں یہ سفر اس وقت کیا جب حالات سازگار نہیں تھے کیونکہ اس وقت جنگِ عظیم اوّل زوروں پر تھی اور چاروں طرف سے جاپان پر وہی مظالم ڈھائے جا رہے تھے جو مغربی ممالک کی تہذیب و تمدن کو تباہ و برباد کر رہے تھے۔ ایک دن شاعرِ اعظم، ولی پیرسن اور میں کوبےؔ

ؔ KOBE.

میں بچوں کا ایک اسکول دیکھنے کے لئے گئے۔ وہاں ننھے ننھے بچے وردیوں میں ملبوس فوجی ڈرل کر رہے تھے میں اُنہیں دیکھ کر بڑا محظوظ ہُوا لیکن شاعر کے نازک احساس کے آبگینے کو ٹھیس لگی۔ اُنہوں نے ہم دونوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ اس قسم کے جنگی پراپیگنڈے سے معصوم بچوں کو بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ اُنہوں نے اُن جنگ کے انعامات کی طرف بھی اشارہ کیا جو قومی نشانات کے طور پر دیواروں پر لٹک رہے تھے۔ ہر ایک شہر میں جنگی تیاریوں کی کرخت آوازیں سُنائی دیتی تھیں۔ فوجیں شہروں میں مارچ کیا کرتی تھیں، اخباریں جنگ، جنگ پکار رہی تھیں۔ ساری فضا جنگ کے جذبات سے معمور تھی۔ جب ہم نے متقدر جاپانی رہنماؤں سے ذکر کیا جو شاعر اعظم سے ملاقات کے لئے آئے تھے تو اُنہوں نے کہا کہ جب مغربی طاقتیں اسلحہ میں اضافہ کر رہی ہیں تو مشرقی قوموں کے لئے کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ وہ بھی اس قسم کی جنگی تیاریاں کریں۔ جاپان کے یہ مقتدر رہنما اس صورتِ حال پر اظہارِ افسوس کرتے تھے۔

لیکن ہم جتنا عرصہ اس مُلک میں رہے ہمیں معلوم ہوا کہ اگرچہ اسلحہ کی یہ دوڑ ظاہری طور پر اتنی بدنما معلوم ہوتی ہے لیکن ابھی تک یہ مرض اتنا مہلک نہیں ہے کہ وہ جاپان کی رُوح کو تباہ کر دے۔ ابھی تک جاپان کی رُوح مامون و محفوظ تھی۔ اس سلسلہ میں ایک بڑا ہی رقت انگیز واقعہ رُونما ہوا۔ اس پہاڑی مُلک کے عین وسط میں ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر ریلوے افسروں کے حکم سے اس ریل گاڑی کو ٹھہرایا گیا جس میں شاعر اعظم سوار تھے۔ یہ اس

سے ہوا کہ بدھ کے پجاریوں کا ایک گروہ اپنے مقدس لباس میں ملبوس
شاعر اعظم کا استقبال کرنے اور اُسے تحائف دینے آیا تھا۔ اُن کے
چہروں پر حلیمی اور رحم کے آثار نمایاں تھے۔ اُن کے دلوں میں اُن کے
آقا مہاتما بدھ کا پیغام تھا۔ دیگر الفاظ میں اُن کے دلوں میں دنیا کے دکھوں
کے لئے ہمدردی تھی۔ اُن کے ہماروں طرف جاپان کے افسر جنگی وردیوں
میں ملبوس کھڑے تھے۔ ہماری نگاہوں کے سامنے یہ تقدس اور دہشت
کی ایک تصویر تھی اور ہمیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ تصویر کسی اور عالم سے
آئی ہے۔ شاعر اعظم کا چہرہ ہمدردی کے جذبات سے دمک رہا تھا اور
مہاتما بدھ کے بھکشوؤں کے چہرے زہد و تقدس کے نور سے منور تھے۔
ایک دفعہ پہلے میں نے جاپان کے اس چھوٹے سے اسٹیشن پر خداوند مسیح
کی حضوری کو پایا۔ میں نے اُس کی حضوری کو جنوبی افریقہ میں ہندوستانی
ستیہ گرہ کرنے والے لوگوں کے چہرہ میں بھی دیکھا تھا۔ سب میں ایک
ہی رُوح کارفرما تھی۔

شاعر اعظم نے امپیریل یونیورسٹی جاپان میں لیکچروں کا ایک سلسلہ شروع
کیا۔ اس کے بعد جاپان کے اخباروں نے شاعر اعظم کی تقریر یا روانی سے
ایک خطاب سے سرفراز کیا۔ شری رابندر ناتھ ٹیگور نے اُس جارحانہ قومیت
کی ملامت کی جو جاپان کی سچی تہذیب کی رُوح کو تباہ کر رہی تھی۔ یہ زمانہ
جنگ کی گرم بازاری کا زمانہ تھا۔ اس وقت اس قسم کے لیکچر دینا بڑی جُرأت
کا کام تھا۔ اخبارات نے ان پر خوب تبصرے کئے۔ اخبارات نے جاپان

کے لوگوں کو انتباہ کیا کہ وہ "شکست خوردہ قوم کے نبی" کی باتوں کو ہرگز ہرگز نہ سنیں، تاکہ ایسا نہ ہو کہ ہندوستان کی طرح جاپان کی گردن میں بھی کسی غیر ملک کی غلامی کا جوا ہو جائے۔

شاعرِ اعظم محض اس لیے جاپان میں آئے تھے کہ اُن کے دل میں جاپانیوں کے لیے محبت تھی۔ وہ اُنہیں وُہی پیغام دینا چاہتے تھے جو خُود نے جنہیں دیا تھا۔ وہ اُن سے رحم کے وُہ اصُول سیکھنا چاہتے تھے جس کا اعلان مہاتما بُدھ نے دنیا میں کیا تھا۔ پہلے چند ہفتوں میں جاپانیوں نے اُن کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ ایک اندازے کے مطابق کوئی اڑھائی لاکھ کے قریب لوگ ٹوکیو سٹیشن پر اُن کا استقبال کرنے کو آئے تھے۔ جاپانیوں کو جس وقت یہ معلوم ہوا کہ شاعرِ اعظم ذہنی آمن پسندی امتیاز سے بالا ہیں اور وُہ جنگ سے نفرت کرتے ہیں تو اخباروں نے اُن کے پیغام کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں لوگ شاعر سے دُور دُور رہنے لگے۔ اب لوگ گروہ در گروہ اُن کا استقبال نہیں کرتے تھے۔

جاپانی اخباروں نے شاعرِ اعظم کے مُلک کو "شکست خوردہ"[1] کے الفاظ سے مُلقب کیا۔ اس سے اُنہیں بے حد دُکھ ہوا لیکن وُہ اس سے بلند و بالا رہے۔ وُہ اس نام پر فخر کرنے لگے اور اُنہوں نے "شکست خوردہ" کا گیت لکھا جو یوں ہے۔

---

[1] THE PROPHET OF A DEFEATED NATION.

"میں سڑک کے کنارے کھڑا ہوں
میرے آقا کا حکم ہے کہ میں "شکست" کا نغمہ گاؤں
کیونکہ شکست ایسی اُس کی دُلہن ہے جسے پوشیدہ طور پر وُہ چاہتا
ہے۔ اُس کی دُلہن نے سیاہ نقاب اوڑھ رکھا ہے تاکہ دُنیا کی نگاہوں
سے پوشیدہ رہے۔ لیکن اُس کے سفید بند کا ہیرا اندھیرے میں چمک
رہا ہے۔
وُہ خاموش ہے اور اُس کی نگاہیں نیچی ہیں۔ اُس نے اپنے گھر کو
الوداع کہہ دیا ہے۔ اُس کے اپنے گھر سے آہ و زاری کی صدائیں بلند
ہُوئیں اور ہوا کے دوش پر بکھر کرنے لگیں۔
لیکن ستارے ابدالآباد زندہ رہنے والے کی محبت کا نغمہ اُس چہرے
کے سامنے گا رہے ہیں جسے شرم اور مصائب نے زیادہ خوبصورت
بنا دیا ہے۔
حرم کا دروازہ کھل چکا ہے۔ نرسنگھا پھونکا گیا ہے۔
اور محبوب کی آمد پر تاریکی کا دل خوف سے دھک دھک کر رہا ہے۔

اُس وقت میرا دل شاعرِ اعظم کی ہیبت سے لبریز ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا
کہ اُنہیں بڑا ہی صدمہ ہُوا ہے۔ مجھے ایک "شکست خوردہ" قوم کی یاد
آئی جو میرے آقا خداوند مسیح کی قوم تھی۔ خداوند مسیح خود "آدمیوں میں حقیر

لہ یہ گیت رابندرا ناتھ ٹیگور کی کتاب بنام FRUIT GATHERING سے لیا گیا
ہے، جسے میکملن نے چھاپا تھا اور مصنف سے اس کی اشاعت کی منظوری لی ہے۔

مردُود مردِ غمناک اور رنج کا آشنا تھا۔ لوگ اُس سے گویا رُوپوش تھے۔ اُس کی تحقیر کی گئی اور ہم نے اُس کی کچھ قدر نہ جانی۔"

اس کے تھوڑے سے عرصہ کے بعد شری رابندرا ناتھ ٹیگور چین تشریف لے گئے۔ اس سفر کے کچھ عرصہ تک مَیں اُن کے ہمراہ تھا۔ پیکنگ میں اُنہوں نے بڑے ذمّہ دار الفاظ میں فرمایا کہ مغرب کی مادی کامیابی کے سامنے سر نہیں جھکانا چاہیئے۔ اُنہوں نے طلبہ سے خطاب کرتے ہُوئے کہا "کیا تم یہ کہنے کی جُرأت کر سکتے ہو کہ جس کی لاٹھی اُس کی بھینس ہے اور کہ تم نے یہ سبق مغرب سے سیکھا ہے؟ صدیاں گُذریں قدیم ہندوستان میں ہمارے ایک بڑے عالم نے کہا تھا کہ ناراستی سے لوگ مادی ترقی حاصل کرتے اور اپنی خواہشات کی تکمیل کر سکتے ہیں لیکن آخرکار اُن کا نام و نشان مٹ جاتا ہے۔" جس طرح وہ تہذیب جس نے سچائی کو مادی طاقت پر فوقیت نہ دی، مٹ گئی، اُسی طرح مغرب کو بھی ایک خوفناک خطرہ درپیش ہے۔ "آدمی اگر ساری دُنیا کو حاصل کرے اور اپنی جان کا نقصان اُٹھائے تو اُسے کیا فائدہ ہوگا؟ اور آدمی اپنی جان کے بدلے کیا دے؟"

یہ وہ زمانہ تھا جب چین میں عوام کے جذبات میں جوش و خروش تھا لیکن شاعرِ اعظم کا ایسے موقع پر ایسی باتیں کہنا بڑی جُرأت کی بات تھی اور یہ الفاظ صرف وہی انسان کہہ سکتا تھا جس میں شری رابندرا ناتھ کی فہم و فراست، دانشمندی اور اخلاقی بلندی ہو سکتی تھی۔ وہ چین اور جاپان کے ممالک میں اپنے دل کی پاکیزگی اور خوش اخلاقی کی بدولت بڑے ہی مقبول ہُوئے۔

جب کبھی انہوں نے ان ممالک کا دورہ کیا ہے لوگوں نے اُن کا سچے پیغمبر ہونے
کی حیثیت سے استقبال کیا ہے اور اُن کی باتیں بڑی محبت اور تعظیم سے
سُنی ہیں۔

مجھے تو اپنی خرابیٔ صحت کی وجہ سے واپس ہندوستان آنا پڑا لیکن
وزیرِ اعظم ولی بیرن کے ساتھ امریکہ روانہ ہوگئے۔ میں ایک جاپانی جہاز پر
اکیلا واپس لوٹا اور تنہا اپنے خیالات میں مستغرق رہتا تھا اور اپنے دل میں
تاریخِ انسان پر مذہب کے متعلق سوچ کرتا تھا کہ اس نے گزشتہ زمانہ میں
انسانی ترقی میں کیا اثر کیا ہے؟ نیز آئندہ زمانے میں مذہب کی کیا حالت ہوگی؟
کیا مذہبی اتحاد ممکن ہے؟

میں نے اس بحری سفر میں اور دوسرے کئی موقعوں پر جاوا میں قیام کیا۔
وہاں میں نے بورو بودر[1] یعنی عظیم بدھ کا مندر دیکھا اور چند دن گزارے
اس نظارے سے میرے دل پر بہت اثر ہوا۔ اس عمارت کی بُت تراشی
کے نمونے مجھ پر ایک نئی حقیقت کا انکشاف کرتے تھے۔ اب مجھے بڑی مدت
سے اس عمارت کی تلاش میں تھا۔ میں ان میں اور دوسرے بُت خانوں کی عمارتوں
کی سیر کے دوران زمانہ قدیم کی اس کہانی کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا جو
سنگ تراشی کے یہ نمونے بتا رہے تھے۔

پھر بڑی گیلری کے اندر مہاتما بدھ کا جس نے شانتی حاصل کی تھی
خانہ نشین اور پُرسکون مجسمہ نصب تھا۔ پتھروں کو تراش کر جو تصویریں بنائی
گئی تھیں، اُن میں مہاتما بدھ کی زندگی کے مختلف واقعات تھے۔ ان

---

[1] BORO BUDUR.

محبت خدا کی طرف سے ہے اور جو کوئی محبت رکھتا ہے وہ خدا سے پیدا ہوا ہے اور خدا کو جانتا ہے۔ جو محبت نہیں رکھتا وہ خدا کو نہیں جانتا کیونکہ خدا محبت ہے۔ یہ اور محبت ہی دنیا میں سب سے بڑی چیز ہے۔

اُس وقت سے آج تک میں نے دنیا کے مختلف حصوں میں کئی بحری اور بری سفر کئے ہیں۔ اِن سفروں کی غرض مختلف ہوا کرتی تھی۔ ان سفروں میں بعض اوقات میں شاعرِ اعظم رابندر ناتھ ٹیگور کے ساتھ گیا ہوں اور بعض اوقات ہندوستانی آبادکاروں کے سلسلہ میں میں نے دنیا کے مختلف ممالک کا دورہ کیا ہے۔

اب میں کینل ورتھ[1] جہاز میں سوار ہو کر ساتویں مرتبہ جنوبی افریقہ کا سفر اختیار کر رہا ہوں۔ مشرقی اور وسطی افریقہ سے بھی جنوبی افریقہ کی طرح واقف ہوں۔ ان سفروں کو اختیار کرنے سے پیشتر مجھے شری رابندر ناتھ ٹیگور کے ساتھ رہنے کا موقع ملا ہے۔ میں دل سے اُن کی تعظیم کرتا ہوں اور یہ محبت ہر روز گہری ہی ہوتی چلی جاتی ہے۔ میں نے شانتی نکیتن میں جسے "جائے امن" کہتے ہیں روحانی خوبصورتی کو سمجھنے کا سبق سیکھا ہے جو ہندوستانی زندگی میں موجود ہے۔ اور اگرچہ ابھی تک اس روحانیت پر بڑے مظالم ڈھائے گئے ہیں پھر بھی ہندوستان کی روحانیت کا حُسن برقرار رہا ہے۔

اس کتاب کے بہت سے نئے ابواب انہی مصروف سالوں میں لکھے گئے ہیں لیکن ان مضامین پر میں بشرطِ فرصت پھر کبھی قلم اُٹھاؤں گا۔ نئی نئی بندشوں اور نئے نئے انداز سے میں یہ بتا سکوں گا کہ کس طرح

---

[1] KENIL WORTH.

میرے مالک خداوند مسیح نے مجھ پر اپنی محبت کی انتہاء گہرائیوں کا مکاشفہ کیا ہے۔

مجھے افریقہ کی ایک کہانی بتانا ابھی باقی ہے۔ میں نے اسے آخری باب کے لئے رکھ چھوڑا ہے کیونکہ یہ کہانی بڑی خوبصورت اور اہم ہے۔ میں نمیرمبل[1] کے ایک ہسپتال میں بیمار تھا۔ یہ مقام جھیل وکٹوریہ نیانزا کے اوپر واقع ہے اور کمپالہ سے زیادہ بلند ہے۔ اس ہسپتال میں میری صحت آہستہ آہستہ بحال ہو رہی تھی۔ میں مسیحی مشنریوں کے حسن سلوک سے بے حد متاثر ہوا۔ رفتہ رفتہ میری واقفیت باگنڈا[2] کے نوجوان مسیحیوں سے ہوئی۔ انہوں نے اپنے وطن میں اپنے دوست کی طرح میرا خیر مقدم کیا۔ کمپالہ سے جنجالہ[3] چلا گیا۔ یہ مقام جھیل کے سرے پر آبشار رپن[4] کے قریب ہے۔

ایک دن ہندوستانیوں نے مجھ سے کہا کہ میں اُن کے ساتھ اگانگا[5] جاؤں کیونکہ یہ نیا شہر زیرِ تعمیر تھا اور ہندوستانی تاجروں کو اپنی دکانیں بنانے کی جگہ کا تعین کرنے میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

ہم موٹر پر سوار ہو کر اگانگا پہنچے۔ میرے ساتھ دو ہندو دوست اور ایک پارسی تھا۔ جب ہم مُلک کے اندرونی حصے میں کافی دُور تک جا چکے تو اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ ہم سڑک سے ذرا اِدھر ہو کر افریکی فادرز[6] کا مشن اسٹیشن دیکھنے چلیں جو جنگل میں ہے۔

اس مشن اسٹیشن پر ہماری ملاقات ایک عمر رسیدہ رومن کیتھولک پادری

---

۱ NAMIREMBBLE ۲ BAGANDA ۳ JINJALA ۴ RIPON F...
۵ IGANGA ۶ WHITE FATHERS.

اور دو سسٹروں سے ہوئی جو تقریباً اسی سال کی تھیں۔ ان سسٹروں کو غربا کی سسٹرز[۱]
کہتے تھے۔ یہ لوگ جنگل میں رہتے تھے اور اُن کے چاروں طرف ننھے ننھے
جنگلی بچے تھے جو اُن سے پیار کرتے تھے۔ چاروں اطراف میں جنگلی قدیم
باشندے آباد تھے جو ننگے دھڑنگے پھرتے تھے۔ انہیں شرم و حیا کا بالکل
احساس نہ تھا بلکہ وہ جانوروں کی طرح آزادانہ اِدھر اُدھر پھرتے تھے۔ ان
نیک دل ننّوں انسانوں کو آرام و آسائش کی کوئی چیز میسر نہ تھی۔ وہ اسی جگہ
[illegible] ماحول میں اپنی زندگی کے دن گزارنا چاہتے تھے۔ انہیں اپنے وطن
واپس لوٹنے کا کچھ خیال تک نہیں آتا تھا اور نہ ہی وہ اپنے اس موجودہ
زندگی کے عوض کوئی اور ماحول اور زندگی اختیار کرنے کے آرزومند تھے۔
وہ یہی چاہتے تھے کہ اسی جگہ ابدی نیند سو جائیں اور اس گرجا کی پُرسکون
فضا میں ان کی قبروں پر سادہ سی صلیبیں لگی ہوں۔ تاکہ سب کو معلوم ہو جائے
کہ کون ان قبروں میں سو رہا ہے۔ میں نے نہ صرف افریقہ میں بلکہ دنیا کے دیگر
ممالک میں بھی نوعِ انسان کی قدیم تہذیب کو دیکھا ہے اور میں اس حیرت
اور استعجاب سے بھر گیا ہوں کہ کس طرح خداوند مسیح کی محبت کی قوت نے
نیکی اور انسانی فطرت کی دستگیری کی ہے۔ اس نے جتنی تمام بڑی
سے بڑی قربانی دکھا دی ہے۔

میرے میزبان اور پادری سسٹروں نے مجھے بتایا کہ انہیں کئی بار اس
سلسلے میں بار بار ننگا ہونا پڑتا ہے اور وہ ضرور ان لوگوں کے عادی
ہیں۔ اس بوڑھے کیتھولک فادر نے مجھ سے کہا: ”آپ کے یہ دوست

---

۱ SISTERS OF THE POOR.

بڑھنے ہی نہیں آیا اور اُنھوں نے کئی مرتبہ مشکل کے وقت ہماری اور ان
مقامی باشندوں کی مالی امداد کی ہے اور ہمیں بھوک اور افلاس سے بچایا ہے۔
جب مذکورہ کیتھولک فادر یہ باتیں کر رہا تھا تو اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے
ننھے ننھے قطرے جھلک رہے تھے۔ اُس کے رویہ اور لب و لہجہ سے مجھے
معلوم ہوا کہ وہ آئرلینڈ کا باشندہ ہے اور اُس کی باتوں سے صاف ظاہر تھا
کہ اُس کا دل ابھی تک آئرلینڈ کے ایک لڑکے کی طرح نازک ہے۔ اور اُس
کے دل میں محبت کی کثرت ہے . . . .
. . . . اس کا دل پیرانہ سالی
کی وجہ سے اور زیادہ پُرمحبت اور نرم ہو گیا ہے۔

مذکورہ سسٹرز ہمیں کچھ نہ کچھ کھانے پینے کی چیز پیش کرنے کی تیاریوں میں
مشغول ہو گئیں۔ اُن کے گودام میں بہت تھوڑی چیزیں تھیں لیکن پھر بھی وہ
ہماری تواضع کرنا چاہتی تھیں۔ ہم نے بادلِ ناخواستہ اُن کی اِس مہمان نوازی
کو قبول کیا۔ ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ انہیں اُن کی قلیل خوراک کی چیزوں
کے ذخیرہ سے محروم کر رہے تھے لیکن وہ ہماری خدمت میں اتنی خوش نظر آتی
تھیں کہ ہم اُن کی خوشی میں شریک ہونے سے انکار نہ کر سکے۔ ہمارے چاروں
طرف چھوٹے چھوٹے حبشی بچے جمع ہو گئے تھے۔ اُن کے دل میں کسی قسم
کا کوئی خوف نہ تھا۔ وہ مذکورہ فادر اور اُن دونوں سسٹروں سے بے حد محبت
کرتے تھے اور بڑی جلدی اُن سے گھل مل گئے تھے۔

جب میں اپنے میزبانوں کو دیکھ رہا تھا تو دل میں بحرالکاہل میں مولوکائی[ل]

ل MOLOKAI.

کے مقام پر رہنے والے فادر ڈیمیئن کی یاد تازہ ہوئی۔ وہ کوڑھیوں میں کام کیا کرتے تھے۔ مجھے اس خیال سے بڑی خوشی ہوئی کہ رُوئے زمین پر اس قسم کے بے شمار سادہ لوگ موجود ہیں جو مسیح خداوند کے نام کی خاطر اپنی زندگیاں اور اپنی تمام صلاحیتیں قربان کر رہے ہیں۔

ایک مرتبہ آکسفورڈ میں ایک ہندوستانی طالب علم نے بڑے اشتیاق سے مجھ سے پوچھا:۔

"مجھے حب الوطنی کی محرک قوت کی تو سمجھ آسکتی ہے جو مردوں اور عورتوں کو اپنے وطن عزیز کی خاطر کارہائے نمایاں کرنے پر مجبور کرتی ہے لیکن مجھے ایک بات کی بالکل سمجھ نہیں آسکی اور میں آپ سے گذارش کروں گا کہ آپ اس کی تشریح فرمائیں۔ میں نے فادر ڈیمیئن کی سوانح حیات کا مطالعہ کیا ہے کہ انہوں نے کوڑھیوں میں کام کیا تھا اور میں نے آکسفورڈ میں بھی سنا ہے کہ بڑے ذہین مرد اور عورتوں نے نہ صرف اپنے وطن کی خاطر بلکہ دنیا کے وحشی باشندوں کی خاطر اپنی جان عزیز قربان کر دی ہے اور ان کی یہ قربانی بے نظیر اور بے مثال ہے۔ وہ کونسی روحانی قوت ہے جس سے یہ ممکن ہو سکا ہے؟ وہ مسیح کی کونسی قوت ہے جس کی وہ گواہی دیتے ہیں؟"

میں نے اپنے تجربہ سے اُسے بتایا کہ زندہ مسیح اُن کی روزمرہ کی زندگی میں موجود ہوتا ہے۔ وہ اپنی محبت سے اُن سے یہ مطالبہ کرتا ہے اور وہ اُن میں اس محبت کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔ خداوند مسیح نے فرمایا:۔

"میں بھوکا تھا تم نے مجھے کھانا کھلایا۔ میں پیاسا تھا تم نے مجھے پانی

پلایا۔ میں پردیسی تھا، تم نے مجھے اپنے گھر میں اُتارا۔ ننگا تھا۔ تم نے مجھے کپڑا پہنایا، بیمار تھا، تم نے میری خبر لی۔ قید میں تھا، تم میرے پاس آئے، چونکہ تم نے میرے ان سب سے چھوٹے بھائیوں میں سے کسی ایک کے ساتھ یہ سلوک کیا اس لئے میرے ہی ساتھ کیا"۔

مذکورہ کیتھولک فادر جو اگانگا میں مقیم تھا اور ان دونوں عورتوں کے چہرے کبھی بھی خوشی سے نہ چمک سکتے، اگر اُن کے چہرے دوسری دنیا کی روشنی سے نہ جگمگاتے اور انہیں حقیقت کا علم نہ ہوتا یعنی وہ محبت کی اس خدمت میں اپنی روزمرہ کی زندگی میں زندہ مسیح کی حضوری کو محسوس نہ کرتے۔

انگریزی زبان کے مشہور شاعر ٹینی سن نے ہسپتال کے بچوں کے وارڈ کی ایک نرس کے متعلق نظم لکھی ہے۔ ڈاکٹر اُسے ذرا سخت لہجہ میں ملامت کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔ "خداوند مسیح کا زمانہ اب ہو چکا ہے"۔ اور وہ اپنے پُر محبت دل کی گہرائیوں سے اپنے منجی کی طرف سے جواب دیتی ہے۔

"کیا اُس کا زمانہ ہو چکا ہے؟ کیا اُس کا زمانہ یہ نہیں؟
ابھی تو اُس کا زمانہ طلوع ہوا ہے۔ وہ خود بھی آہستہ آہستہ آئیگا۔
میں کس طرح ان وارڈوں میں خدمت کر سکتی ہوں، اگر اُس دنیا کی اُمید جھوٹ ہے؟
میں کس طرح گھناؤنی بیماریوں کی بدبو کو دیکھ کر درگذر کر سکتی ہوں۔

اُس نے فرمایا ہے "تم نے میرے ان سب سے چھوٹے بھائیوں میں سے کسی ایک کے ساتھ یہ سلوک کیا اس لئے میرے ہی ساتھ کیا۔"

اگر فضل کا وہ معجزہ نہ ہو جو خداوند مسیح کی حضوری نے بنی نوع انسان کو عطا فرمایا ہے تو انسانی زندگی ناقابلِ یقین گہرائیوں میں ڈوب جائے اور پھر کبھی اُبھر نہ سکے۔

اُنیسواں باب

مسیح ہی سب کُچھ ہے!

ہم جو مسیحی ایمان میں پیدا ہوئے ہیں اور کئی صدیوں کا ہمیں مسیحی تجربہ ورثہ میں ملا ہے جب ہر نئی نسل کی باری باری مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اُس میں فضل کا معجزہ از سرِ نو ظاہر ہو رہا ہے اور خداوند مسیح کی زندگی مردوں اور عورتوں کے دلوں میں دوام حاصل کر رہی ہے اور ہر زمانہ میں اپنی محبت کی نشوونمات کو زندہ کر رہی ہے۔

مسیحی ایمانداروں کے آگ میں جل کر جامِ شہادت نوش کرنے کے ٹھوس حقائق موجود ہیں۔ ہر دل کو اس بات کا علم ہے کہ مسیحی ایمان کی ایسی آزمائش ہوتی ہے اور وہ خالص سونے بلکہ سات مرتبہ تپائے ہوئے سونے کی مانند صاف ثابت ہوا ہے۔ مقدس پولس رسول نے فرمایا ہے کہ:- "میں اچھی کشتی لڑ چکا۔ میں نے دوڑ کو ختم کر لیا۔ میں نے ایمان کو محفوظ رکھا"۔ مکاشفہ کی کتاب میں یُوں لکھا ہے:-

"یہ وہی ہیں جو اُس بڑی مصیبت میں سے نکل کر آئے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے جامے برّہ کے خون سے دھو کر سفید کئے ہیں"۔ یوحنا عارف سفید جامے پہنے ہوئے شہیدوں کی فوج کا ذکر کرتا ہے جنہوں نے

نیروؔ اور ڈومی شین[۲] کے عہد میں ایذا رسانی کی مصیبتیں برداشت کیں۔ عام انسان مشکل سے اِن مصائب کو جن کو یہ لوگ برداشت کرتے رہے، برداشت کر سکتا ہے۔ جب اگنیشیس[۳] خوشی خوشی روما کی طرف روانہ ہُوا تاکہ تماشہ گاہ میں جنگلی درندے اُسے چیر پھاڑ کھائیں تو اُس نے کہا:۔ "اب مَیں رسولوں کی طرح بننا شروع کرتا ہوں"۔ ایک مسیحی خاتون بنام پرپیچوآ[۴] ایک گمنام سی شخصیت تھی۔ جب وُہ اسی قسم کی سزا بھگتنے کے لئے جا رہی تھی تو اُس نے خُداوند مسیح کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار کیا۔ مسیحی ایمان کے یہ پہلے نتیجے تھے جن کے قابل یہ دُنیا نہ تھی، وُہ بے یار و مددگار تھے۔ اُن کو ستایا گیا اَور طرح طرح کی مصیبتوں میں ڈالا گیا لیکن وُہ اپنے خُداوند کی خاطر دُکھ اُٹھانا خُوشی سمجھتے تھے۔

اس محبت کی کہانی کو معرُوف اَور غیر معرُوف لوگوں نے بار بار بیان کیا ہے۔ محبت کا یہ معجزہ ہر جگہ نظر آتا ہے۔ دُکھ خُوشی میں تبدیل ہوتا ہے۔ ایمان موت پر فتح حاصل کرتا ہے اَور اُمید یاس و حرمان کی ظلمتوں کے اُوپر پرواز کرتی ہے۔

بہادری کی ان شاندار قربانیوں کا تذکرہ نہ ہی صرف تاریخ کے صفحات میں موجود ہے بلکہ ایسے مردوں اَور عورتوں کی وفاداری کی مثالیں بھی ہیں جن کا کسی جگہ ذکر نہیں ہے۔ زمانہ اُن لوگوں کو بھلا چکا ہے جنہوں نے خُداوند کے پاک نام کی خاطر اَور محض اُسی کی محبت کی راہ میں بڑی خوشی سے اپنی تمام چیزوں کا نقصان اُٹھایا اَور خُوشی خُوشی اپنی زندگی اُس کی

---

[۱] NERO [۲] DOMITIAN [۳] IGNATIUS [۴] PERPETUA

خدمت کے لئے قربان کر دی۔

ہر نئی نسل میں یہ لوگ زمین کے نمک ہیں۔ اُنہوں نے انکساری سے زندگی بسر کی اور خاموشی سے دُعا میں مشغول رہے اور پامردی سے مصائب کا مقابلہ کر کے دُنیا کے بارِ الم کو برداشت کیا اور بنی نوع انسان کو خداوند مسیح یسوع میں مخلصی دلائی۔

وُہ مقدسین جنہوں نے بڑے دُکھ برداشت کئے اور خداوند مسیح کی خوشی کا گہرا تجربہ حاصل کیا، اُنہوں نے محبت کے لافانی الفاظ میں مسیحی کی حقیقی قوت کے راز کے متعلق بتایا ہے۔ اُنہوں نے ایسے نغمے الاپے جو کبھی بوسیدہ نہیں ہوتے۔ خداوند یسوع مسیح کے اپنے کلام کی طرح اُن کے محبت بھرے گیتوں نے دیگر زبان میں ترجمہ ہو کر بھی بنی نوع انسان کے دلوں کو خوشی سے بھر دیا ہے۔ مقدس برنارڈ[۱] کے گیت کی تقلید[۲] المسیح۔ مقدس فرانسس[۳] کے ننھے پھول اور برادر لارنس[۴] کا گیت خدا کی بادشاہت اور صلیب کی کہانی بیان کرتے ہیں۔ مذکورہ اصحاب ہمیں بتاتے ہیں کہ وُہ لوگ جو اپنی جان جوکھوں میں ڈالتے ہیں اور اُس سے محبت کرتے اور اُس کی آواز سُننے کو تیار رہتے ہیں جو فرماتا ہے کہ "میرے پیچھے ہو لے" اُنہیں اس دُنیا میں کامل خوشی نصیب ہوتی ہے۔

ہم اپنے زمانے میں بھی اس بات کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ ہر ایک مُلک میں مسیحی قلوب میں ایسی آرزو موجود ہے۔ وُہ خداوند مسیح کے ساتھ دُکھ

---

۱ ST. BERNARD. ۲ THE IMITATION OF CHRIST ۳ THE LITTLE FLOWERS OF ST. FRANCIS. ۴ THE PRACTICE OF THE PRESENCE OF GOD.

اُٹھانا چاہتے ہیں۔ لِونگسٹون[1] نے وسطی افریقہ میں بے یار و مددگار اپنی
جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ وُہ بخار میں مُبتلا تھا پھر بھی گھٹنے ٹیک
کر دُعا میں مشغول رہا اور انجیل مقدس اُن کے سامنے کھلی رکھی تھی۔
کولرج پیٹرسن[2] نے میلنیشیا میں جان دے دی اور مرتے دم تک اُن
لوگوں سے پیار کرتا رہا جنہوں نے نادانی میں بڑے ظالمانہ طریق سے
اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ یوگنڈا کے رہنے والے ہننگٹن[3]
نے بھی اسی طرح جان دی۔ سادھو سندر سنگھ جی بھی ہر قیمت پر
تبت میں داخل ہونے کا ارادہ رکھتے تھے۔ جاپان کے ڈاکٹر ناگو
نے غریبوں کے لیئے اپنی جان قربان کر دی۔ افریقہ کے رہنے والے
اگریگے نے ناقابلِ بیان سعی کی کہ وُہ اُن زخموں کی مرہم تلاش کرے
جو نسلی عصبیت کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے۔ یوگنڈا کے رہنے والے
وُہ نوجوان جنہوں نے خداوند مسیح کی خاطر شہادت کا جام پیا۔ آخری
دم تک اپنے منجی کی حمد و ثنا کے گیت گاتے رہے۔ اس کے علاوہ
اس زمانہ میں بے شمار مردوں، عورتوں اور بچوں نے اپنے منجی خداوند
کی گواہی دی کہ اُن لوگوں کا ہاتھ پکڑ کر اُن کی بھنوؤں پر آنکھیں ڈال کر
اُن کے اپنے لبوں سے اُن کا پیار نہیں سکتے ہیں۔ اپنے واحد مالک
خداوند کی خاطر یہ اُن کی محبت کا کھلا ثبوت ہے جو اُن کی خاطر مر گیا۔
وُہ اُس کے لیئے جئیں۔

---

[1] LIVINGSTONE [2] COLRIDGE PETERSON OF MELANESHIA
[3] HANNINSTON.

میں بڑے احترام اور اعتماد سے اپنے والدین کی مقدس زندگی ان سادہ مزاج اور بہادر انسانوں کی محفل میں پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ اُنہوں نے اپنے ذاتی ایثار اور خدمت کے ذریعہ مجھے مسیحی زندگی کی خوبیوں کا نمونہ دیا۔ جس طرح میں اُن کا مرہونِ احسان ہوں اسی طرح اُن کا بھی مرہونِ احسان ہوں جنہوں نے اپنے نمونے سے مجھے اُس کی خدمت پر مجبور کیا ہے۔

پنجاب پریس لاہور سے مسٹر دی۔ ایس۔ کے فضل سیکرٹری
پنجاب ریلجس بک سوسائٹی۔ انار کلی لاہور نے چھپوا کر شائع کیا۔

The Publication of this book was assisted by a grant made by The W.P.C.C. Literature Board.

Printed at the Punjab Press, Lahore and Published by Mr. V.S.K. Fazal, Secretary, Punjab Religious Book Society, Anarkali - Lahore.